



المنهاج الواضح

يعنى

راه سنت

تأليف

محدث اعظم وامام اهل سنت و حامل علوم نبويه

حضرت مولانا محمد سراج خان صفدر

مکتبہ صفدریہ

نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمُ عَنْهُ فَانْتَهُوا (قرآن حکیم)

اور جو چیز تم کو رسول دے اُس کو لو اور جس چیز سے منع کرے اُس سے باز آ جاؤ!

مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (متفق علیہا)

جس نے ہمارے اس معاملہ میں کوئی نئی چیز گھڑی، تو وہ مردود ہوگی!

(لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَا جَاہٌ (قرآن حکیم)

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

رَأْسُ السُّنَّةِ

جس میں بڑی تحقیق اور عرق ریزی سے اہل السنّت والجماعت کے دلائل کا معیار اور بدعت لغوی اور شرعی کا مفہوم اور حکم، قرآن کریم، صحیح احادیث اور صدہا عبارات سے واضح کیا گیا ہے اور تمام مشہور بدعات (مثلاً میلاد، عرس، قبروں پر چراغاں کرنا، قبروں کو بچتہ بنانا، قبر پر اذان کہنا، نماز جنازہ کے بعد نماز کرنا، تیجہ، ساتواں، دسواں، پچالیسواں، چیلہ اسقاط، دوران قرآن وغیرہ وغیرہ) پر فرداً فرداً مفصل بحث کی گئی ہے، اور فریق مخالف کو مستقط اور مسکت جوابات دیتے گئے ہیں اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اکابر علماء دیوبند کے سختی اور سختی مسلمان ہیں، ان کو وہابی وغیرہ کہنا سراسر بہتان، خالص افتراء اور سفید جھوٹ ہے!

مؤلفاً

ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر (فاضل دیوبند)

خطیب جامع مسجد گھر، شیخ الحدیث و صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

ناشر: مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

﴿جملہ حقوق بحق مکتبہ صفدریہ گوجرانوالہ محفوظ ہیں﴾

طبع ۵۶ دسمبر ۲۰۰۹ء
۳۷

نام کتاب المنہاج الواضح (یعنی راہ سنت)
مصنف امام اہلسنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دام مجدہم
مطبع مکی مدنی پرنٹرز لاہور
قیمت ۲۰۰/- (دو سو روپے)
ناشر مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

ملنے کے پتے

- | | |
|--|--|
| ☆ ادارہ الانور بنوری ٹاؤن کراچی | ☆ کتب خانہ مظہری گلشن اقبال کراچی |
| ☆ مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان | ☆ مکتبہ حقانیہ ملتان |
| ☆ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور | ☆ مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور |
| ☆ مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور | ☆ مکتبہ الحسن اردو بازار لاہور |
| ☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی | ☆ کتب خانہ مجیدیہ بوہڑ گیٹ ملتان |
| ☆ مکتبہ صفدریہ چوہڑ چوک راولپنڈی | ☆ مکتبہ حلیمیہ درہ پیزوکی مروت |
| ☆ مکتبہ سلطان عالمگیر اردو بازار لاہور | ☆ ادارہ اسلامیات اتارکلی لاہور |
| ☆ اسلامی کتب خانہ اڈاگامی ایبٹ آباد | ☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ |
| ☆ مکتبہ عثمانیہ میانوالی روڈ تلہ گنگ | ☆ مکتبہ الاظہر بانو بازار رحیم یار خان |
| ☆ اقبال بک سنٹرز دصالح مسجد صدر کراچی | ☆ مکتبہ فاروقیہ ہزارہ روڈ حسن ابدال |
| ☆ مکتبہ علمیہ جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک | ☆ مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک |
| ☆ مکتبہ رحمانیہ قصہ خجانی پشاور | ☆ مکتبہ العارفی فیصل آباد |
| ☆ مکتبہ فاروقیہ حنفیہ اردو بازار گوجرانوالہ | ☆ والی کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ |
| ☆ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ | ☆ ظفر اسلامی کتب خانہ جی ٹی روڈ گلگھڑ |

تصدیقاتِ اکابرین علماء دارالعلوم دیوبند

ضلع سہارن پور - ہند

① فخر الامثال حضرت مولانا الحاج القاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم دیوبند

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ اَمَّا بَعْدُ : اسلام جامع اور کامل دین ہے
اس میں زیادتی کی گنجائش ہے نہ کمی کی۔ اس کے کامل ہونے کی شہادت تو قرآن کریم نے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ
لَكُمْ دِينَكُمْ سے دی ہے اور جامع ہونے کا ثبوت تَبَيَّنَا لِكُلِّ شَيْءٍ ؕ سے پیش فرمایا ہے، جس سے
اس دین کا جامع و کامل ہونا شہادتِ خداوندی سے ثابت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب دین مجموعہ علم و عمل
کا نام ہے تو دین کے جامع و کامل ہونے کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے کہ اس کا علم بھی جامع و
کامل ہے اور عمل بھی جامع و کامل ہے۔ اس کمال اور جامعیت کی تخصیص علم محض یا عمل محض سے نہیں کی
جاسکتی۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ قانون تو کامل ہو اور اس سے پیدا شدہ عمل ناقص اور ناتمام یا برعکس۔ پس
ایک تکمیل دوسرے کی تکمیل کو طبعاً مقتضی ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ دین کے علم کا اساسی سرچشمہ قرآن حکیم
ہے جس کا بیان حدیث ہے : فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبْرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمٌ مَا بَيْنَكُمْ (الحديث)۔ اور
عمل کا سرچشمہ اسوۂ حسنہ ہے جس کی حامل ذاتِ بابرکات نبوی ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسُوَةٌ حَسَنَةٌ (القرآن) بلاشبہ تمہارے لئے رسول اللہ میں نمونہ عمل موجود ہے۔

تقریباً دونوں باہم مطابق اور ایک دوسرے پر پورے پورے منطبق بھی ہیں چنانچہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ
تعالیٰ عنہا سے جب حضور کے اخلاق کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ :

کے ساتھ عملاً قبول کیا جائے کہ اسی کا نام اتباعِ سنت ہے۔ اس لئے اس دین کے کامل و جامع ہونے کی وجہ سے اس کے دو تقاضے نکلے۔ ایک اخلاص اور ایک اتباع۔ اخلاص اللہ سے عقیدہ و عمل خالص ہو جائے اور بعینہ وہی رہتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر اتارا ہے۔ اور اتباع سے عقیدہ و عمل بصواب ہوتا ہے اور ٹھیک اُس نمونہ کے مطابق رہتا ہے جو اُس کے رسولؐ نے کر کے دکھلایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی دو اصلیں دین کی بقا و حفاظت اور انسان کی صلاح و فلاح کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ اگر انہیں کمزوری دیا جائے گی تو اسی حد تک ان کی ضدیں ابھر کر دین کو فاسد بنا دیں گی۔ اگر اخلاص و توحید میں کمی آئے گی تو دین ایمان میں اسی حد تک اُس کی ضد، شرک کی آمیزش ہو جائے گی :

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهْمًا
مُشْرِكُونَ۔ (القرآن حکیم)۔
اور بہت سے ان ہیں مومن نہیں ہوتے کہ ساتھ
ہی مشرک بھی بن جاتے ہیں۔

اور اگر اتباعِ سنت میں کمی آجائے گی تو اسی حد تک بدعت کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔
ما احدث قومٌ بدعةً الا رفع
مثلها من السنة فتمسكُ بسنةٍ
خيرةٍ من احداث بدعة۔
کسی بھی قوم نے کوئی بدعت (دین میں) ایجاد
نہیں کی کہ اُس کی مثل سنت اس قوم سے اٹھانے لے
گئی ہو۔ پس سنت کو تھامے رہنے ہی میں خیر ہے۔
(مسند احمد) بہ نسبت نئی نئی بدعات نکلنے کے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جیسے دین کی صلاح و فلاح کی دو اصلیں ہیں، اخلاص اور اتباع، ایسے ہی دین کے فساد کی بھی دو ہی اصلیں ہیں جو ان دو کی ضدیں ہیں، فتنہ اور بدعت۔ پس جیسے اخلاص و اتباع کے ہوتے ہوئے دین کبھی ضائع نہیں ہو سکتا، ایسے ہی اشراک و ابتداع کے ہوتے ہوئے دین کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے علماء اہل سنت و الجماعت نے ہمیشہ سنت و بدعت میں امتیاز نمایاں رکھے اور سنت کو نکھار کر بدعت سے الگ کر دکھانے میں سرگرمی دکھلائی، اور کبھی تساہل اور پہل انکاری سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اصول سے لے کر فروع تک سنت و بدعت کو جدا جدا کر کے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے تاکہ دین اخلاص و اتباع کی روشنی میں اپنے اصلی روپ کے ساتھ محفوظ رہے

وَ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ - اور آپ کا اخلاق قرآن ہے۔

اور ظاہر ہے کہ خُلُقُ عمل ہی کی قوت کا نام ہے۔ اس لئے حاصل یہ نکلا کہ کتاب و سنت میں اس دین کے تمام علمی پہلو جمع ہیں اور ذات نبوی میں اس کے تمام عملی پہلو مجتمع ہیں اور وہ بھی ایک دوسرے پر پورے پورے منطبق۔ پس جو چیزیں قرآن میں علمی شکل میں ہیں وہی چیزیں ذات نبوی میں عمل کی صورت میں ہیں اور جن باتوں کو قرآن اصول و اقوال کی شکل میں پیش کرتا ہے انہی باتوں کو ذاتِ بابرکات نبوی احوال و اعمال کی شکل میں نمایاں کرتی ہے۔ پس قرآن کا کہا ہوا آپ کا کیا ہوا ہے، اور آپ کا کیا ہوا قرآن کا کہا ہوا ہے۔ اور یہ دونوں حقیقتیں ایک دوسرے پر اس شان سے منطبق ہیں کہ نہ عمل نبوی قرآن سے سر مُو منحرف ہے اور نہ علم قرآنی عمل نبوی سے ذرہ برابر متجاوز ہے۔ ورنہ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ کے کوئی معنی باقی نہیں رہ سکتے۔ اس کمال مطابقت کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر قرآن کا علم اور قانون جامع اور کامل ہے جس سے کوئی ہدایت چھوٹی ہوئی نہیں ہے تو نبوت کا عملی اسوہ حسنہ بھی یقیناً جامع اور کامل ہے جس سے دین کا کوئی عملی نمونہ رہا ہوا نہیں ہے۔ نیز اگر قرآن اور اس کے لئے ہوئے قانون میں کسی ادنیٰ کمی زیادتی کی گنجائش نہیں ہے تو عملی اسوہ نبوی میں بھی کسی اضافہ و بیشی کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ورنہ وہ تطبیق و مطابقت باقی نہیں رہ سکتی جس کا دعویٰ قرآن پاک اور حرم پاک نبوی ضدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ جس طرح قرآن کے بعد نوع انسانی کی ہدایت کے لئے کسی جدید نمونہ بعلم کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی نئی کتاب یا نوشتہ کی صورت میں نازل ہو، ایسے ہی نبوت کے اسوہ حسنہ کے بعد کسی نئے نمونہ عمل کی ضرورت نہیں ہو سکتی کہ اُسے لے کر کوئی مبعوث ہو یا اختراع کر کے عمل کا کوئی نیا ڈھنگ اور نیا روپ خود سے دین میں نکالے کیونکہ اگر اس دین کے علم یا عمل میں کمی بیشی کی گنجائش ہو تو یہ دین، دینِ کامل و جامع نہیں کہلایا جاسکتا، حالانکہ قرآن و حدیث اس کے کامل اور جامع ہونے کے مدعی ہیں۔ اندر یہ صورت اس دینِ کامل کو ماننے کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ اس کے علم اور عقیدہ کو بھی بلا کمی بیشی اور بغیر ادھر ادھر جھکے ہوئے یک رخی کے ساتھ مانا جائے کہ اسی کا نام اخلاص و توحید ہے۔ اور اس کے نمونہ عمل یعنی اسوہ حسنہ نبوی کو بھی بغیر رسم و رواج کی آمیزش اور ایجاد و اختراع کے یکسوئی

اور شرک و بدعت کی آمیزشوں سے اُس کا نورانی چہرہ داغ دار نہ ہونے پائے۔

ہندوستان کی ان آٹھ کی صدیوں میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ اور ان کی نسی اور جسی اولاد کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے اس سنت و بدعت کی تفریق اور سنت کے دائرہ سے من گھڑت رسوم و رواج کے اخراج کو آخری حد تک پہنچایا، اور ان سارے اختراعات کو جنہیں دعویٰ دارانِ اِنَّا وَجَدْنَا اِٰبَاءَنَا دین کے پردہ میں پیش کر رہے تھے، دین کے مستحکم دلائل سے دفع کرنے کی عظیم مہم انجام دی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے دور میں یہ سعی عارفانہ رنگ سے نمایاں ہوئی، اُن کے فرزندِ جلیل حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کے دور میں فلسفیانہ انداز سے سامنے آئی، اُن کے پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کے دور میں مجاہدانہ روش سے کھلی، اور اُن کے بعد جب دلی کی علمی مرکزیت ختم ہو کر دیوبند کی طرف منتقل ہوئی تو بانیانِ دارالعلوم دیوبند کے ہاتھوں علم و جہاد کے رُوپ میں آگے بڑھی، اور آخر کار دیوبند کے فیض یافتہ فضلا کے ہاتھوں اُس نے جماعتی اور اجتماعی صورت اختیار کر کے ہند و بیرون ہند میں پرے جمادیتے۔ دارالعلوم دیوبند کے فضلا متقدمین سے ہوں یا متاخرین میں سے، اور پھر اُن سے مستفیدین اگلے ہوں یا پچھلے، جو ہندوستان و پاکستان، افغانستان و ترکستان، برما و انڈونیشیا، حجاز و عراق میں لکھ لکھ کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کے کام کا مرکزی نقطہ یہی سنت و بدعت کی تفریق اور یہی دین اور غیر دین کا امتیاز واضح کرنا ہے۔

حضرت مولانا نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند قدس سرہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ) نے اسی سنت و بدعت کے فرق کو عقائد اور کلیات دین میں نمایاں کیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ (المتوفی ۱۳۲۲ھ) نے اسی فرق کو فقہی جزئیات میں کھولا۔ حضرت تھانوی قدس سرہ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) نے اسی فرق کو معاشرتی و معاملات میں نمایاں کیا۔ ابن شیر خدا حضرت مولانا تھانی صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۶۷ھ) نے اسی فرق کو مروجہ رسوم میں واضح کیا، اور آج انہی اسلافِ صالحین کے ایک خَلَفِ رشید مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر نے اسی فرق کو اس دور کے ان عام منجزات و محدثات میں مثبت و منفی پہلو سے متفقانہ دلائل کی روشنی میں نہایت ہی واضح اور پاکیزہ انداز میں آشکاف کیا ہے جس کی

شاہد عدل ان کی حالیہ تصنیف "راہِ سُنت" ہے۔

اس کتاب میں ممدوح نے محققانہ انداز میں سنن نبوی اور رسومِ مروجہ میں مدلل اور موجہ فرق دکھلاتے ہوئے بہت سے ایسے گوشے سلف کی عبارات، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی روایات اور قرآن حکیم کی آیات سے کھول دیئے ہیں جو اب تک پس پردہ تھے، جن سے اخلاص و اتباع کی دو اصلیں مضبوط سے مضبوط تر ہو کر سامنے آگئی ہیں اور شرک و بدعت کا حجت و برہان کی رُو سے قلع قمع ہو گیا ہے۔ مولانا نے ممدوح کا مطمح نظر کتاب زیرِ نظر میں ان مسائلِ نحو مبتدعین کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں، اُن کے اصلی رُوپ میں پیش کرنا اور اُن پر بدعات کا جو سیاہ لبادہ ڈال دیا گیا ہے، اُسے اُتار پھینکنا ہے، جس میں وہ بجز اللہ تعالیٰ کا میاب ہیں اور اُن کے پیچھے حجت و برہان کی زبردست کمک موجود ہے۔ مصنف کی اور دوسری لطیف تصانیف بھی جہاں تک نظر سے گزریں، محققانہ ہنر و فن اور متین اندازِ بیان کی حامل ہیں جو سنت و بدعت اور دین و غیر دین کی تفریق کے سلسلہ میں مجادلہ و جدال کی دعوت نہیں دیتیں بلکہ شرحِ صدر، قوتِ یقین اور عمل میں طمانیت و قناعت کی طرف لے آتی ہیں۔ یہ اکم باسٹی کتاب "راہِ سُنت" بھی حقیقتاً راہِ سُنت کی داعی ہے جس سے جدل کا ذوق پیدا نہیں ہوتا کہ جدل بدعت اور گمراہی کا خاصہ ہے نہ کہ سُنت اور ہدایت کا۔ ارشادِ نبوی ہے :

ما ضل قوم بعد ہدیٰ کا نواعلیہ کوئی قوم بھی ہدایت کے بعد جس پر وہ تھی،

الا اتوا الجدل۔ (ترمذی) گمراہی پر نہیں آتی کہ اس میں جدال و نزاع کے

جائیم پیدا نہ ہو جاتے ہوں۔

چنانچہ حضور کی یہ پیش گوئی اہل بدعات کے حق میں سر کی آنکھوں سے مشاہدہ میں آرہی ہے کہ وہ ات دن برگوئی، درشت کلامی، تحفریق بین المسلمین، کالمِ گلوچ، قتل و غارت گری، فساد و خون ریزی اور اشتعال انگیزی کے دبلے ہوئے پنہانی غیظ و غضب کے ساتھ ہر وقت آمادہٴ فساد نظر آتے ہیں۔ گویا اُن کی حجت و برہان ہی زبان کی گالی اور ہاتھوں کی دراز دستی ہے۔

دراز دستی ایس کو تہ استیناں ہیں

تخلات اہل سنت کے کہ ان کی زبانیں متین، کلام مہذب، لب و لہجہ صادق اور انداز علم و اناؤہ کا ہے۔
تہ انیف و تقاریر میں کسی غیظ و غضب کا اظہار نہیں کسی بھی موقع پر وہ جذباتی رنگ میں اشتعال انگیزی
کر کے تفریقیں ڈلاتے نہیں پھرتے، کیونکہ ان کی حجت و برہان کتاب و سنت ہے۔ جس کی روشنی میں وہ
مدعا کا اثبات کرتے ہیں اور مدعا بھی خود اپنا نہیں رکھتے، وہ مدعا بھی اللہ و رسول کا ہوتا ہے جسے وہ
نقل کر کے اُس کے دلائل سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ اس عمل میں ظاہر ہے کہ بد تہذیبی اور ناشائستگی کی قدرتاً
گنجائش ہی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ان خرافات کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ کیونکہ یہ امور از قسم جہالت
ہیں اور دعوائے حق اور دلائل صادقہ از قسم علم ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ علم جہالتوں کی مدد سے آگے نہیں بڑھ سکتا
اور نہ ان کا دست نگر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ رسالہ زیر نظر راہِ سنت کا اندازِ بیان، لب و لہجہ اور طریق استدلال
بھی انہی محققانہ اوصاف کا حامل ہے کیونکہ وہ سنتوں کی دعوت دے رہا ہے جن کے لئے علم و تہذیب کفایت
کرتے ہیں نہ کہ بدعات و خرافات کی، جن کے لئے جہالت اور جاہلانہ انداز ناگزیر ہے۔ اس متین انداز اور علمی
رنگ کی تحقیقات سے کوئی شبہ نہیں کہ مصنفِ مدوح نے نہ صرف مسائل کا اثبات ہی کر دیا ہے بلکہ خصوم پر
حجت بھی قائم کر دی ہے۔ لِيَهْلِكَ مَرٌّ هَلْكَ عَنْ بَيْتِنَا وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيْتِنَا ۝
رہا تعصب و عناد، سو اس کا معا لجز کسی کے پاس نہیں۔ اُس کا تیر بہدف علاج یا آخرت کی قیامت
بے یا دنیا کی قیامت۔ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۔
حق تعالیٰ مصنفِ مدوح کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کی اس سعی
جمیل کو قبول فرمائیں اور طاب لبینِ حق کو ان کی مساعی سے مستفید ہونے کی توفیق بخشیں۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِي
مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ۔

وبالله التوفيق

محمد طیب غفرلہ - مدیر دارالعلوم دیوبند

۲۹ رجب ۱۴۳۷ھ یوم الاربعاء

② حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب دامت فیوہم

صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِہ محمدؐ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ میں نے "المنہاج الواضح یعنی راہِ سنت" مؤلف محترم مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صاحب صدر اطلال اللہ بقاءہ کو پڑھا۔ زبان شستہ و صاف، لہجہ دل آویز، بدال و زنگ مناظرانہ سے دور اور مضامین کی جامع کتاب ہے۔ بدعات کے سلسلہ کی اپنے رنگ کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں بدعات کا رد سے اسلوب سے کیا گیا ہے اور اتباعِ سنت کو بطریق احسن ثابت کیا گیا ہے۔ یہ دوسری کتاب مولانا سے موصوف کی میری نظرت گزری ہے جس میں آیات و احادیث اور محقق علماء کے اقوال مذکور ہیں، اور ہر امر مدلل ہے۔ ہر ایک عامی و خاص کیلئے مفید ہے۔ اس کے مطالعہ سے بدعت و سنت کی حقیقت نمایاں طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اہل اہوا کے لئے بھی مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس تالیف کو مقبول خاص و عام بنائے اور مؤلف مذکور کو جزائے خیر عنایت کرے اور اس سے زیادہ ہمت و توفیق بخشے کہ گم کردہ راہوں کی راہبری کتے رہیں اور مخلوق ان کے فیض سے مستفید ہوتی رہے۔ آمین!

سید مہدی حسن، صدر مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۳/۱۱/۲۰۲۰ھ

③ حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم

سابق وزیر معارف شرعیہ ریاست ہائے متحدہ بلوچستان، شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

راہِ سنت کو میں نے مطالعہ کیا جو مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صاحب نے روئے بدعات میں لکھی ہے اور عصر حاضر کی اکثر بدعات کی جھٹکانہ تردید اس میں موجود ہے۔ مبتدعین کے اعتراضات اور دلائل کے جوابات نہایت عالمانہ اور دلکش انداز میں دیئے گئے ہیں۔ بدعت شرعیہ کے حدود کو اس طرح متعین کرنا کہ امور انتظامیہ تعلیمیہ (مثلاً قیام مدارس دینیہ، امتحان نصاب تعلیم، تدوین قواعد عربیہ، طباعت و اشاعت علوم اسلامیہ) اشغال صوفیہ اور مباحث متجددہ ان سے خارج ہوں۔ اور عقائد و امور متخارثہ اور قربات و اعمال مختلفہ متعلقہ بالاموات وغیرہ ان میں داخل ہوں، ایک علمی اور دقیق بحث ہے جس میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مصنف موصوف نے اس اہم مورچہ کو ایک بڑی حد تک سر کر لیا ہے اور اس عظیم بحث کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ حل کر دیا ہے۔ میرے خیال میں مصنف دام فضلہ کی تمام تصانیف اگرچہ بجا خود بہت مفید ہیں، لیکن یہ کتاب دیگر تصانیف کی نسبت عوام و خواص دونوں کے لئے بے حد نافع ہے۔

احقر اپنے حلقہ کے علماء کرام و طلبہ کو مشورہ دیتا ہے کہ اس کتاب کی طرف توجہ فرمائیں۔ فقط والسلام

شمس الحق عفا اللہ عنہ۔ ترنگ زئی پشاور

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ	نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۱	عرضِ حال	۵	۱۴	اس پر پہلا اعتراض اور اس کا جواب	۴۵
۲	باب اول	۱۱	۱۸	" " " " دوسرا " " " "	۴۷
	شرعی دلائل کے بیان میں	۱۱	۱۹	" " " " تیسرا " " " "	۴۹
۳	قرآن کریم ابدی قانون، کامل ضابطہ حیات اور مکمل دستور العمل ہے۔	۱۱	۲۰	" " " " چوتھا " " " "	۵۴
	قانون سازی کا منصب کس کو حاصل ہے اور اس کے لوازمات۔	۱۲	۲۱	فائدہ	۵۶
۴	قانون خداوندی کا بالذات نافذ کرنے والا انسان ہے۔	۱۳	۲۲	اسلامی فقہ اور قیاس بھی شرعی حجت ہے۔	۵۷
۵	کتاب اللہ کی ہمہ گیر صداقت اور اسلام کا مکمل ہونا اہل اسلام کی نگاہوں میں۔	۱۵	۲۳	عباد اور زہاد کے قیاس کا مقام۔	۶۱
۶	قرآن کی حقانیت اور دین اسلام کی عظمت وغیروں کی نگاہ میں۔	۱۸	۲۴	قیاس بدعت نہیں ہے۔	۶۲
۷	وحی غیر متلو اور حدیث شریف۔	۲۲	۲۵	قیاس کے متعلق ایک نفیس بحث۔	۶۴
۸	سنت کا مقام۔	۲۲	۲۶	باب دوم	۶۹
۹	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاک تعلیم کی قدر وغیروں کی نگاہ میں۔	۲۶	۲۹	بدعت کی لغوی اور شرعی تعریف اقسام اور احکام۔	۶۹
۱۰	اجماع و اتفاق شرعی حجت ہے۔	۲۸	۲۷	بدعت کی تردید احادیث سے۔	۶۹
۱۱	نلسار راشدین کی خلافت اور ان کی سنت۔	۲۸	۲۸	فی امرنا هذا کی تشریح۔	۷۳
۱۲	ایک غلطی اور اس کا ازالہ۔	۳۲	۲۹	علماء دیوبند کے نزدیک بدعت کی تفسیر۔	۷۵
۱۳	صحابہ کرام بھی معیار حق ہیں اور انکا اجماع حجت ہے۔	۳۶	۳۰	علماء بریلوی اور بدعت کی تعریف۔	۷۵
۱۴	اجماع امت	۴۰	۳۱	امت لغت کے نزدیک بدعت کی تعریف۔	۷۵
۱۵	خیر القرون کا تعامل بھی حجت ہے۔	۴۲	۳۲	بدعت کا شرعی معنی۔	۷۷
			۳۳	مفتی احمد یار خان صاحب کی اختراع۔	۸۷
			۳۴	ایک وہم اور اس کا ازالہ	۸۹
			۳۵	مفتی احمد یار خان صاحب کی ایک اور غلطی۔	۹۰
			۳۶	اہل بدعت حضرات کا ایک اصولی مغالطہ	۹۰
			۳۷	بدعت حسنه اور ستیہ کی تحقیق۔	۹۸

نمبر صفحہ	مضمون	نمبر شمار	نمبر صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱۵۴	باب ششم سنت اور بدعتیں اشتباہ ہو تو کیا کرنا چاہیے؟	۵۹	۱۰۱	منفی احمد یار خان صاحب کی تعلق	۳۸
۱۶۰	باب ہفتم - فرداً فرداً بدعات پر تنقید۔	۶۰	۱۰۳	باب سوم	۳۹
۱۶۰	محفل میلاد	۶۱	۱۰۳	بدعات کے جواز کے دلائل پر ایک منظر	
۱۶۲	اس کی تاریخ	۶۲	۱۰۳	کیا اصل اشیاء میں اباحت ہے؟	
۱۶۴	محققین علماء کا فیصلہ	۶۳	۱۱۱	من سن سنۃ حسنہ کی تصریح	۴۱
۱۶۶	منفی احمد یار خان صاحب کی انوکھی دلیل۔	۶۴	۱۱۳	منفی احمد یار خان صاحب وغیرہ کی غلطی۔	۴۰
۱۶۷	میلاد میں قیام کرنا۔	۶۵	۱۱۸	باب چہارم - عبادات میں اپنی طرف	۴۳
۱۶۹	ایصالِ ثواب کیلئے ربیع الاقل کی تعیین بدعت ہے۔	۶۶	۱۱۸	سے اوقات اور کیفیات کا تعیین کرنا بدعت ہے۔	
۱۷۰	عرس کرنا۔	۶۷	۱۲۲	صحابہ کرام کا ایسی کیفیات کے متعلق فیصلہ	۴۴
۱۷۲	ذکر بالجہر۔	۶۸	۱۲۳	حضرت ابن مسعودؓ	۴۵
۱۷۹	مزارات کو پختہ کرنا اور ان پر گنبد بنانا۔	۶۹		حضرت ابن مسعودؓ کا بلند آواز سے مسجدوں میں درود	۴۶
۱۸۵	قبروں کو گرانے کا حکم۔	۷۰	۱۲۷	پڑھنے کے متعلق فیصلہ۔	
۱۸۸	فریق مخالف کا اعتراض (مع جواب)	۷۱	۱۳۰	ان کا مقام جناب رسول اللہؐ کی بارگاہ میں۔	۴۷
۱۹۲	قبروں پر چراغاں کرنا۔	۷۲	۱۳۱	حضرت عمرؓ نے پچاسٹ کی نماز کے اہتمام کو بدعت فرمایا۔	۴۸
۱۹۶	منفی احمد یار خان صاحب کی جھجھٹ۔	۷۳	۱۳۳	جمعہ کی نماز اور عام نمازوں کے بعد مصافحہ کرنا بدعت ہے۔	۴۹
۱۹۷	قبروں پر چادریں ڈالنا اور پھول چڑھانا۔	۷۴	۱۳۴	قیاس بطل کی تردید۔	۵۰
۲۰۱	منفتیانہ استدلال۔	۷۵	۱۳۵	صاحب انوارِ ساطعہ کا ایک مغالطہ۔	۵۱
۲۰۲	نیا انکشاف۔	۷۶	۱۳۸	حضرت ابن عمرؓ نے تثنیہ کو بدعت کہا۔	۵۲
۲۰۳	پختہ قبریں بنانے کا منزعوم فائدہ۔	۷۷	۱۳۹	حضرت علیؓ نے زعیف کی نماز سے قبل نماز پڑھنے سے منع کیا۔	۵۳
۲۰۴	قبروں پر مجاور بننا۔	۷۸	۱۴۱	حضرت ابن عباسؓ نے عصر کے بعد نماز کو مؤخر کرنا قرار دیا۔	۵۴
۲۰۵	نماز جنازہ کے بعد دعا۔	۷۹	۱۴۱	حضرت سعید بن المسیبؓ نے بھی ایسا ہی کہا۔	۵۵
۲۱۰	مخالفین کے اعتراضات مع جوابات۔	۸۰	۱۴۲	حضرت عثمان بن ابی العاصؓ نے دعوتِ ختمہ رد کر دی تھی	۵۶
۲۱۳	منفی احمد یار خان صاحب کی بدحواسی۔	۸۱	۱۴۳	بدعت کی تردید کے بعض عقلی دلائل۔	۵۷
۲۱۳	دعا بعد الجنازہ کے اشیاء کے دلائل اور ان کے جوابات۔	۸۲	۱۴۶	باب پنجم - کیا بدعات میں کوئی خوبی بھی ہوتی ہے؟	۵۸

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ	نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۸۳	جنائزہ کے ساتھ ساتھ ذکر کرنا اور قرآن کریم وغیر پڑھنا	۲۲۰	۱۰۴	کھانا سامنے رکھ کر اُس پر ختم دینا۔	۲۴۵
۸۴	مولوی محمد عمر صاحب کی انوکھی دلیل۔	۲۲۳	۱۰۵	چٹائی اور پھوڑی وغیرہ بچھانا۔	۲۴۶
۸۵	قبر پر اذان دینا۔	۲۲۴	۱۰۶	حیلہ اسقاط۔	۲۴۸
۸۶	فریق مخالف کے اعتراضات اور ان کے جوابات۔	۲۲۷	۱۰۷	دورانِ قرآن۔	۲۸۳
۸۷	” ” ” ” جواز کے دلائل ” ” ”	۲۳۱	۱۰۸	تصویر کا دوسرا رخ۔	۲۸۵
۸۸	اذان میں انگوٹھے چومنا۔	۲۳۸	۱۰۹	عبدالنبی اور عبدالرسول وغیرہ نام رکھنا۔	۲۹۲
۸۹	مفتی احمد یار خان صاحب کی اُتج۔	۲۴۰	۱۱۰	مفتی احمد یار خان صاحب کا کمال۔	۲۹۵
۹۰	ایک وہم اور اس کا ازالہ۔	۲۴۰	۱۱۱	خاتمہ	۲۹۸
۹۱	ضعیف حدیث پر عمل کرنے کی تحقیق۔	۲۴۰		فریق مخالف کے الزامی اعتراضات	”
۹۲	انگوٹھے چومنے کی جملہ روایات موضوع ہیں۔	۲۴۵	۱۱۲	پہلا اعتراض اور اس کا جواب۔	”
۹۳	کفنی یا الفی لکھنے کا بیان۔	۲۴۵	۱۱۳	دوسرا ” ” ” ”	۳۰۱
۹۴	بدنی اور مالی طریقہ پر ایصالِ ثواب کا حکم۔	۲۴۸	۱۱۴	تیسرا ” ” ” ”	”
۹۵	تلاوتِ قرآن کریم پر اجرت لینا۔	۲۵۲	۱۱۵	چوتھا ” ” ” ”	۳۰۳
۹۶	اذان، اما اور تعلیم و جھڑ پھونک پر اجرت لینا۔	۲۵۹	۱۱۶	پانچواں ” ” ” ”	”
۹۷	ایصالِ ثواب کے سلتے دنوں کی تعیین۔	۲۶۰	۱۱۷	چھٹا ” ” ” ”	۳۰۴
۹۸	میت کے گھر اجتماع کرنا اور کھانا پکھنے کا بیان۔	۲۶۱	۱۱۸	ساتواں ” ” ” ”	۳۰۵
۹۹	فقہاء احناف کے نزدیک میت کے گھر سے طعام کھانا		۱۱۹	آٹھواں ” ” ” ”	۳۰۶
	یتیم، ساتواں، دسواں اور چالیسواں وغیرہ	۲۶۳	۱۲۰	نواں ” ” ” ”	۳۰۷
۱۰۰	لطیف	۲۶۸	۱۲۱	دسواں ” ” ” ”	۳۰۸
۱۰۱	فریق مخالف کا پہلا اعتراض اور اُس کا جواب۔	۲۷۰	۱۲۲	گیارہواں ” ” ” ”	”
۱۰۲	” ” ” ” دوسرا ” ” ” ”	۲۷۱		تمت بالخیر	
۱۰۳	” ” ” ” تیسرا ” ” ” ”	۲۷۳			

عرضِ حال

خدا تعالیٰ کا وہ پسندیدہ اور پیارا دین جو سب ادیان و مذاہب کا ناسخ اور قیامت تک اقوامِ عالم کے لئے رہنما ہے، جس کو امام الانبیاء خاتم النبیین اور سید المرسل حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے بدن مبارک کا خون بہا کر اور طرح طرح کی اذیتیں اور صعوبتیں برداشت کر کے خدا تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچایا تھا اور جس کو افضل البشر بعد الانبیاء حضرت ابو بکرؓ سے لے کر ایک چھوٹے صحابی نے اپنی جانی اور مالی قربانی کے ذریعہ روئے زمین پر پھیلانے کی انتھک اور کامیاب کوشش کی اور جس کو تابعین اور اتباع تابعین اور محدثین اور فقہائے کرام نے اپنی زندگیاں وقف کر کے بعد کے آنے والوں تک پہنچایا اور جس کی سادہ اور فطری تعلیم اور ٹھوس دلائل نے اقوامِ عالم کو اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ موافق و مخالف اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ کی پیش کی ہوئی شریعت اور قانون کی اہل یورپ نے بھی وہ تعریف کی جس سے بڑھ کر شاید ممکن نہ ہو چنانچہ مرگین صاحب لکھتے ہیں کہ ”محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا یہ حکم کہ وہ عورتیں جو لڑائی میں قید کی جائیں اپنے بچوں سے قطعاً جدا نہ کی جائیں، ایک ایسا حکم ہے جس پر دنیا کے تمام مورخین کی نکتہ چینیوں نے جو انہوں نے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر کی ہیں، قربان کی جاسکتی ہیں۔“

○ باسورتمہ اسمتہ صاحب لکھتے ہیں کہ: ”محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی زندگی تمام ریفارمرز سے عظیم الشان اور بلند پایہ ہے۔“

- میور صاحب معترف ہیں کہ ”تمام نبیوں اور پیغمبروں کے کاموں سے مشکل ترین کام محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا تھا۔“
- کارلائل صاحب اس اقرار پر مجبور ہیں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) مجسم رحم اور عفو تھا۔ اس کی تمام زندگی یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کی حمایت میں گزری۔ یہ اُس شخص کی زندگی تھی جو خدا سے پیدا ہوا

اور خدا کے لئے انتقال کر گیا۔ اگر کسی آدمی نے اپنی زندگی خدا اور خدا کی راہ میں وقف کی، تو وہ یقیناً محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تھا۔

○ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لفظ قرآن کے تحت لکھا ہے کہ "محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تمام نبیوں اور دینی کام کرنے والوں میں سب سے زیادہ کامیاب تھا۔"

○ لیونارڈو صاحب کہتے ہیں کہ "اگر کسی نے زمین پر خدا پالیا، اگر کسی نے خدا کی راہ میں اپنی زندگی وقف کر دی، اگر کسی شخص کی زندگی کا نصب العین محض نیکی کا پرچار تھا۔ تو وہ یقیناً عرب کا پیغمبر محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تھا۔"

دیکھا آپ نے کہ اہل یورپ بھی حق بات لکھنے اور کہنے پر مجبور ہیں ع والفضل ما شهدت بہ الاعداء حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پیش کردہ وہی صحیح اور سچا دین و مذہب تمام ممالک میں پھیلا اور ہندوستان میں بھی پہنچا۔ گیارہویں صدی ہجری میں وہی خالص اسلام جو حضرات صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین، اور محدثین و فقہار نے احتیاط کی چھاننی میں چھان کر محفوظ رکھا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور ان کے خاندان میں جاگزیں ہوا، اور قرآن کریم، حدیث اور فقہ و تصوف وغیرہ کی جو خدمت انہوں نے کی وہ اور کسی کی قسمت میں نہ تھی۔ سچ ہے کہ سہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تانہ بخشہ خدائے بخشندہ!

اور اسی مبارک خاندان کے علمی چشموں اور ناپید اکنار سمندر سے اکابرینِ علماء دیوبند شکر اللہ تعالیٰ مساعیہم فیض یاب ہوئے، جو اصلی مسلمان، حقیقی سنی اور صحیح معنی میں حنفی ہیں اور ہندو پاک میں اہل سنت و اجماعت صرف اور صرف علماء دیوبند ہیں یا جو ان کے ساتھ عقائد میں متفق ہیں اور بس! انہی اکابر نے جہاد ۱۸۵۷ء میں انگریز مردود کے خلاف دہلی، پٹنہ پت اور سونی پت وغیرہ کے میدانوں میں اپنی جانیں پیش کیں اور تیرہ ہزار کے قریب علماء کرام کو انگریزوں نے تختہ دار پر لٹکایا، اور انگریز کیلئے کم و بیش سو سال تک اکابرینِ علماء دیوبند، کیا ہندوستان اور کیا بیرون از ہند ایک ناگہانی مصیبت بنے رہے۔ ان اکابر نے تقریر و تحریر اور اپنے عمل سے برطانیہ کی حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کرنا شروع کر دیں۔ مگر برطانیہ تو ابلیس سیاست تھا، اُس نے ان اکابر کو مسلمانوں

کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل کرنے کے لئے ایسے حربے استعمال کئے کہ الامان و الحفیظ، اور ان کی تکفیر کیلئے بڑے بڑے مولوی اور مفتی خریدے گئے اور ان اکابر پر جس طرح افتراء اور بہتان مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی نے باندھے ہیں اور کسی سے یہ خدمت ادا نہیں ہو سکی۔ انہوں نے ان اکابر کو کافر اور مرتد قرار دینے کے لئے اور وہابی و ہابی کہہ کر عام مسلمانوں کو ان سے نفرت دلانے کے لئے وہ کوشش کی کہ خدا کی پناہ۔ اور اُس زمانہ میں جب کہ ظالم انگریز نے ممالک اسلامیہ پر جہاں گداز مظالم ڈھائے اور ہندوستان میں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی پوری مہم شروع کی اور دین اسلام کو مٹانے کی ناپاک کوشش جاری رکھی، خان صاحب بریلوی نے اعلام الاملاہ ہندوستان دارالاسلام نامی ایک کتاب لکھ کر ظالم انگریز کی حکومت میں ہندوستان کو دارالاسلام کا خطاب دیا۔ اور خان صاحب خود دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ "ہندوستان بفضلہ دارالاسلام ہے" (بلفظہ احکام شریعت حصہ دوم ص ۱۷۱)۔ اور صراحت سے دھوکہ دیا کہ ہمارے امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلکہ علمائے ثلاثہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مذہب پر ہندوستان دارالاسلام ہے، ہرگز دارالحرب نہیں اہ۔ اور خدا تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وفادار مسلمانوں کو کافر اور مرتد قرار دیا۔ چند عبارتیں خان صاحب کی ملاحظہ ہوں :

"ایسے ہی وہابی، قادیانی، دیوبندی، نیچری، چکڑالوی جملہ مرتدین ہیں کہ ان کے مرد یا عورت کا تمام جہان میں جس سے نکاح ہوگا، مسلم ہو یا کافر، اصلی یا مرتد، انسان ہو یا حیوان، محض باطل اور زنا، خالص ہوگا اور اولاد ولد الزنا۔ (ملفوظات حصہ دوم ص ۱۷۱) — آج کل کے وہابی، رافضی، قادیانی، نیچری، چکڑالوی، جھوٹے صوفی کہ شریعت پر بہتے ہیں کلم دنیا میں سب سے بدتر مرتد ہے اس سے جزیرہ نہیں لیا جاسکتا۔ اُس کا نیک کسی مسلم، کافر، مرتد، اُس کے ہم مذہب یا مخالف مذہب، غرض انسان حیوان کسی سے نہیں ہو سکتا جس سے ہوگا محض، زنا ہوگا، مرتد مرد ہو خواہ عورت، مرتدوں میں سب سے بدتر منافق ہے۔ یہی ہے وہ کہ اس کی صحبت ہزار کافر کی صحبت سے زیادہ مضر ہے کہ مسلمان بن کر کفر سکھاتا ہے۔ خصوصاً وہابیہ دیوبندیہ کہ اپنے آپ کو خاص اہل سنت و جماعت کہتے، حنفی بنتے، چشتی نقشبندی بنتے، نماز روزہ ہمارا کرتے جتنی کتابیں پڑھتے پڑھاتے اور اللہ و رسول کو گالیاں دیتے ہیں (لعنۃ اللہ علی الکاذبین - صفحہ ۱۷۱)

یہ سب سے بدتر زہر قاتل ہیں۔ (احکام شریعت حصہ اول ص ۶۸) — رافضی، تبرانی، وہابی، دیوبندی

وہابی غیر مقلد، قادیانی، چکڑالوی، نیچری، ان سب کے ذہنی محض نجس و مردار حرام قطعی ہیں۔ اگرچہ لاکھ بار نام الہی لیں اور کیسے شقی پر ہیزگار بنتے ہوں کہ یہ سب مرتدین ہیں۔ ولا ذبیحة للمرتد (احکام شریعت حصہ اول ص ۶۸) — احکام دنیا میں سب سے بدتر مرتد ہے اور مرتدوں میں سب سے خبیث تر مرتد منافق

رافضی، وہابی، قادیانی، نیچری، چکڑالوی کہ کلمہ پڑھتے، اپنے آپ کو مسلمان کہتے، نماز وغیرہ افعال اسلام بظاہر بجالاتے، بلکہ وہابی وغیرہ قرآن و حدیث کا درس دیتے لیتے، اور دیوبندی کتب فقہ کے ماننے میں بھی شریک

ہوتے، بلکہ چشتی نقشبندی وغیرہ بن کر پیری مریدی کرتے اور علماء و مشائخ کی نقل اتارتے اور بایں ہمہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین کرتے (لعنة الله على الكذابين) یا ضروریات دین سے کسی شے کا انکار رکھتے ہیں۔ ان کی کلمہ گوئی و ادعا، اسلام اور افعال و اقوال میں مسلمانوں کی نقل اتارنے ہی نے ان

کو اجنبث و اضر اور ہر کافر اصلی یہودی نصرانی، بت پرست مجوسی سب سے بدتر کر دیا (احکام شریعت حصہ اول ص ۶۹) — یہی مثال روافض و وہابیہ کی ہے کہ روافض مثل نصاریٰ کے محبت میں کافر ہوتے،

اور وہابیہ مثل یہود کے عداوت میں۔ (احکام شریعت حصہ دوم ص ۱۲۱) — اخان صاحب پنا تائید کردہ ایک طویل

استفتاء نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”غلام احمد قادیانی، اور رشید احمد اور جو اس کے پیرو ہوں جیسے خلیل احمد بیٹھی اور اشرف علی وغیرہ، ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں نہ شک کی مجال بلکہ جو انکے کفر میں شک کرے بلکہ کسی طرح

کسی حال میں انہیں کافر کہنے میں توقف کرے اسکے کفر میں بھی شبہ نہیں۔“ (احکام اکمل ص ۱۲۱، دفتاویٰ افریقیہ ص ۱۲۱) — امیر حسن

امیر احمد سوانی، نذیر حسین دہلوی، قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، خلیل احمد بیٹھی، اشرف علی

تھانوی وغیرہم اور بعض دیگر فرقوں کے نام لے کر آخر میں لکھتے ہیں: ومن جملة هؤلاء الطوائف

للسبب کلہم کفار مرتدون و خارجون عن الاسلام باجماع المسلمین خلاصہ کلام یہ ہے کہ باجماع المسلمین یہ سات فرقے اور انکے بانی کافر، مرتد اور اسلام کے دائرہ سے خارج ہیں۔ (المستند العمد بنار نجات الابد ص ۱۲۱ مکتبہ حلدیہ لاہور)

دیوبندیوں کے بارے میں مسلمانوں سے آخری اپیل، جو انہیں کافر نہ کہے، جو ان کا پاس لحاظ رکھے، جو ان کے

استادی یا رشتے یا دوستی کا خیال کرے وہ بھی انہیں میں سے ہے۔ انہیں کی طرح کافر ہے، قیامت میں ان

کے ساتھ ایک رسی میں باندھا جائے گا۔ (دفتاویٰ افریقیہ ص ۱۲۱)

یہ تمام عبارتیں خان صاحب کی ہیں اور اپنی جگہ پر واضح ہیں، مزید تشریح کی حاجت نہیں ہے۔ اب آپ فریق مخالف کی مشہور و معروف کتاب تجانب اہل السنّت کی چند عبارتیں بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ اس کتاب پر شیر بیشہ مولوی حسنت علی صاحب وغیرہ کی تصدیقات موجود ہیں۔

○ حکیم شریعت مسٹر جینا (قائد اعظم مسٹر محمد علی صاحب جناح) اپنے عقائد کفریہ قطعاً یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ (ص ۱۲)

○ ”ان صلح کل لیڈروں میں اعظم گڑھ کے مولوی شبلی اور الطاف حسین حالی اور زمانہ حال کے مشہور شاعر ڈاکٹر اقبال بہت نمایاں ہستی رکھتے ہیں، انہی صلح کلیت اپنی حد سے گزر کر شدید نیکریت اور دہریت تک پہنچی ہوئی ہے۔“ (ص ۲۸۹)

○ ”وہابیہ دیوبندیہ و قادیانیہ و روافض و نیاچرہ و خاکساریہ و چکڑالویہ و احراریہ و جٹا و ہاریہ (حسن نظامی و طوبی کے مرید) و آغا خانہ و وہابیہ غیر مقلدین و وہابیہ نجدیہ و یگیہ عالیہ و صلح کلیہ عالیہ اپنے عقائد کفریہ قطعاً یقینیہ کی بنا پر حکیم شریعت قطعاً یقیناً اسلام سے خارج اور کفار و مرتدین ہیں۔ جو معنی اسلام ان میں سے کسی کی قطعاً یقینی اطلاع رکھتے ہوئے بھی اس کو مسلمان کہے یا اس کے کافر مرتد ہونے میں شک رکھے یا ان کو کافر مرتد کہنے میں توقف کرے وہ بھی یقیناً کافر مرتد ہے اور بے توبہ مرا، تو مستحق نارابدہ۔“ (ص ۲۵۵)

○ ”فرقہ احرار اشرار بھی فرقہ نیچریہ کی ایک شاخ ہے۔ اس ناپاک فرقے کے بڑے بڑے مقلدین (کہتے) یہ ہیں: علی شیخ جی امام الحوارج مبلغ وہابیہ ایڈیٹر انجم عبدالشکور کاکوری، صدر مدرسہ دیوبند حسین احمد اجدوہیا باپٹی، فقیر احمد دیوبندی (پاکستان کے سابق شیخ الاسلام)، عطار اللہ بخاری، حبیب الرحمن لدھیانوی، احمد سعید و طوبی نانی عن الاسلام (مفتی) کفایت اللہ شاہجہان پوری، عبدالغفار سرحدی گاندھی۔ اس فرقہ کا سرغنہ مسٹر ابوالکلام آزاد ہے جو امام احرار کہلاتا ہے۔“ (ص ۱۱)

غرضیکہ ہندوستان کا کوئی فرقہ اور مسلمانوں کا کوئی بھی مشہور عالم اور لیڈر ایسا نہیں ہے جو اس عالی فرقہ کے نزدیک کافر، مرتد اور خارج از اسلام نہ ہو۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ان کے کفر میں شک اور توقف بھی کرے تو وہ بھی کافر مرتد اور مستحق نارابدہ ہے۔ یہیں معاملہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں کہ ”اور بیشک ہم غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایسے ہی فرقوں کے حق میں فرمایا ہے کہ حاکم کونان میں سے ایک کا قتل ہزار

کافروں کے قتل سے بہتر ہے کہ دین میں ان کی مضرت زیادہ سخت تر ہے (حسام الحرمین ص ۱۷۱)۔ اور اب تو اس
 عالی فرقہ نے مظلوم دیوبندیوں کو شہید کرنا اور ان پر قاتلانہ حملے کرنے بھی شروع کر دیئے ہیں۔ چنانچہ ہفت روزہ
 پاکستانی لائل پور میں لکھا ہے کہ موضع وارنی تھانہ کوٹ سماہ بہاولپور میں رضا خانی بریلویوں نے دو دیوبندی اہل
 السنّت و الجماعت کو کلہاڑیوں سے شہید کر دیا اور دو کو شدید زخمی کیا۔ احمد پور شرقیہ کے قریب موضع تڑو محمد پناہ
 میں رضا خانیوں نے وہاں کے دیوبندی اہل السنّت و الجماعت نمبر دار حاجی سردار چندو خان صاحب کو نماز
 کی حالت میں شہید کر دیا۔ لورالائی کوٹھہ کی مسجد کے دیوبندی اہل السنّت و الجماعت امام (مولانا محمود الحسن
 صاحب) کو علم غیب کے مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے سیکھ کر جام شہادت پلا دیا گیا۔ ساہیوال کے نزدیک ایک گاؤں میں
 رضا خانیوں نے ایک دیوبندی سُنی کو شہید کر دیا (اور ایسے ہی کئی واقعات علماء دیوبند سے پیش آتے
 رہے ہیں کہ ان کو بریلوی حضرات نے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا، اور ان کے ناحق خون سے زمین رنگین
 کی)۔ اور اسی پرچہ کے صفحہ اکالم امیں ہے۔ چند دنوں کا واقعہ ہے کہ (لائل پور میں) مسجد فیکٹری ایریا
 کے دیوبندی امام پر بریلویوں نے مولوی محمد عمر (صاحب) اچھروی کی قیادت میں قاتلانہ حملہ کر دیا۔ حملہ آوروں کو
 موقع پر گرفتار کر لیا گیا جس سے دیوبندی امام کی جان بچ گئی۔ یہ ہیں وہ حالات و واقعات اور اسباب و محرکات
 جن کے تحت ہم اپنی پوزیشن کو واضح کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ہمارا کوئی ایک مسئلہ بھی قرآن کریم اور حدیث شریف
 اور فقہ حنفی کے خلاف نہیں ہے اور ہم کچے سُنی اور حنفی مسلمان ہیں اور بدعات کے جملہ مشہور مسائل پر اس کتاب میں
 سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مسئلہ حاضر و ناظر پر راقم کی کتاب تبرید التواظر کئی سالوں سے اور شرک کی حقیقت اور پکارنے
 وغیرہ پر گلدستہ توحید عرصہ سے طبع ہو چکی ہیں۔ مختارِ کل کے مسئلہ پر ڈول کا سرور کی طباعت ہو چکی ہے۔ مسئلہ علم غیب
 اور حضرات انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بشریت پر کتابیں زیر ترتیب ہیں اور اکابرین علماء دیوبند کی عبارتوں
 پر جو قطع و برید کے اعتراضات کئے گئے ہیں ان کے پورے اور مفصل جوابات زیر تجویز ہیں۔ وَاللّٰهُ يَقُولُ الْحَقُّ وَ
هُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ۔

احقر

ابوالزاهد محمد سرفراز خان صفدر

۲۱ محرم ۱۳۷۷ھ - ۱۸ اگست ۱۹۵۷ء

۱۔ اب ازالۃ الترتیب، تنقید متین اور عبارات اکابر کا پہلا حصہ طبع ہو چکا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بابِ اَوَّل

شرعی دلائل اور براہین کے بیان میں

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَّمَ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى - اَمَّا بَعْدُ فَاِنْ اَصْدَقَ
الْحَدِيثُ كِتَابَ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْعِدَى هَدَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ (وَعَلَى اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ
وَاتَّوَجَّهَ وَجْهًا لِّجَمِيعِ اُمَّتِهِ) وَسَلَّمَ وَشَرَّ الْاُمُورِ مَحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ مَحْدَثَةٍ بَدْعَةٌ وَكُلُّ بَدْعَةٍ
ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ - قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ
وَارْتَضَيْتُمْ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ بار شکر ہے کہ اُس نے ہمیں انسان بنایا۔ پھر انسان بنانے کے بعد ہمیں مسلمان بننے
کی توفیق عنایت فرمائی اور پھر مسلمان ہونے کے ساتھ ہمیں امام الانبیاء سید المرسلین خاتم النبیین حضرت
محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت ہونے کا لازوال شرف مرحمت فرمایا۔ اگر ہم اسکی ان گنت
صلوات و خیرات کا شکر بجالانا چاہیں تو یہ ایک ناممکن امر ہے اور ہمارے حیطہ امکان سے باہر ہے۔ بلکہ ہم
اس کی نعمتوں کو شمار بھی نہیں کر سکتے۔ - وَ اِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا، اِچھ جائیکہ ہم اس کے
نعمات و حسنات کا حق ادا کر سکیں۔

قرآن کریم ہدایتی قانون، کامل ضابطہ حیات اور مکمل دستور العمل ہے | گو حسب تصریح علماء اصول دلائل
حدیثیں و چہ رسمیں ہیں۔ کتاب اللہ سنت رسول اللہ۔ اجماع اور قیاس۔ مگر اجماع اور قیاس
حقیقت کتب اور سنت ہی کی طرف راجع اور اسی کا ثمرہ ہے۔ لہذا کائنات کی رہبری کے لئے اصولی طور پر

ہدایت دو حصوں اور درجوں میں منقسم ہے۔ ایک وہ حصہ ہے جو جمیع اصول، تمام نکتہ و غیر متغیر اور لازمی احکام اور اعمال پر مشتمل اور انسانی تصرف سے بالاتر اور اپنے الفاظ میں محفوظ و منضبط اور ہمیشہ کیلئے مکلف مخلوق کی ہدایت کا نصاب ہے اور اس ہدایت کے سرچشمہ کا نام وحی متلو اور قرآن مجید ہے۔

مذہب اور قانونِ فطرت اس معیار اور مقیاس کا نام ہے جو مقرر و معین ضابطہ اور قانونِ کلی کی حیثیت رکھتا ہو۔ سچا اور صحیح مذہب اور آئین صرف وہی ہوتا ہے جس کی بنیاد حقیقی سچائی اور عالمگیر حقیقت پر ہو، اور جس کے ذریعہ عقائد و اعمال اور اخلاق کو اچھایا بڑا کہا جاسکے اور جس کے رُوسے باطنی اور ظاہری اصلاح ہو کہ عذاب سے بچا جاسکے اور جس کے اصول قطعی اور اٹل ہونے کے ساتھ ایسے جامع ہوں جو کائنات کی دینی اور دنیوی حاجت روائی کے لئے کافی ہوں۔ فطرت چونکہ حقیقی صداقت ہے اس لئے مذہب اسلام کی بنیاد خالقِ فطرت نے فطرت پر رکھی ہے اور جس کی بابت یوں ارشاد فرمایا ہے :

فَطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ
لِخَلْقِ اللَّهِ ط (پ ۲۱، الروم، رکوع ۴۷)۔
یہ اللہ تعالیٰ کا وہ قانونِ فطرت ہے جس پر اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے (یعنی انسانی فطرت اسی دین کے موافق ہے) اور اس قانون میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

سچا مذہب وہ ہوتا ہے جو من جانب اللہ قطعی اور محکم طریقہ سے منکشف ہوتا ہے اور ہر صحیح الفطرت اس کے سامنے تسلیمِ خم کر دیتا ہے۔ وہ بنایا نہیں جاتا اور نہ اس میں مخلوق کی ایجاد و احداث کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ غلط اور نادرست مذہب کی شناخت یہ ہوتی ہے کہ اس کی بنیاد اُن خیالات اور اوہام پر قائم کی جاتی ہے جو دل کی دنیا میں پیدا ہوتے اور خواہشات کے دریا اور طوفان میں بہ جاتے ہیں، اور نفس الامر سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ فطرت سے بے گانہ اور حقیقت اور صداقت سے کوسوں دُور ہوتے ہیں۔ گوان کی ظاہری چمک دمک سادہ لوح اور سطحی قسم کے لوگوں کی نارسا آنکھوں کو خیر کر دیتی ہے، اور وہ اس سے متاثر ہو کر اس دامِ ہمنگِ زمین کا شکار ہو جاتے ہیں۔

قانون سازی کا منصب کس کو حاصل ہے اور اس کے لوازمات کیا ہیں؟ | جس قدر مستقبل سے متعلق کسی کو زیادہ علم ہوگا، اسی قدر وہ زیادہ صحیح قانون اور آئین بنا سکے گا۔ مخلوق کے پاس مستقبل سے متعلق علم

حاصل کرنے کے ذرائع اور وسائل، تجربہ، قیاس اور حواس وغیرہ سب کے سب محدود، نامتوم اور ناقص ہیں، اس لئے مخلوق کے مجوزہ قوانین کبھی ناقابلِ ترمیم نہیں ہو سکتے۔ ملک اور ملت کے چیدہ چیدہ اور منتخب قانون ساز بڑی کوشش اور کاوش سے بسیار بحث و تمحیص کے بعد ایک قانون تجویز کرتے ہیں مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس میں ترمیم کلپیوزد لگانا پڑتا ہے اور ہمیشہ اس امر کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اور ناقیاست ہوتا رہے گا۔ ہر قانون اور آئین کے بنانے کا ایک مدعا اور مقصد ہوتا ہے۔ قانون ساز کو اگر قانون پر عمل کرنے والوں کے ساتھ شفقت اور ہمدردی ہے اور وہ ان کا حقیقی خیر خواہ اور خود غرضی سے بالاتر ہے تو وہ ایسا قانون بنائے گا جس سے قانون پر چلنے والوں کو نفع اور فائدہ پہنچے گا، اور اس بات کے تسلیم اور یقین کر لینے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ مفید اور ناقابلِ تیسخ قانون صرف وہی بنا سکتا ہے جو ہر لحاظ سے کامل علم رکھتا اور بہمہ وجوہِ علم و خیر ہو، حقیقی ہمدرد اور مہربان ہو، خود غرضی سے بے نیاز اور مطلب پرستی سے بے احتیاج اور بے پروا ہو، ظاہر ہے کہ مخلوق سے متعلق خالق کے سوا علم تام اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ مخفی نہیں کہ الرحمن سے زیادہ مہربان کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اور پوشیدہ نہیں کہ الصمد سے بڑھ کر بے نیاز کوئی نہیں۔ لہذا خدا تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں ہو سکتی جو مخلوق کے لئے کامل و مکمل اور ناقابلِ ترمیم قانون اور آئین بنا سکے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُط۔ اور بھلا اس کی موجودگی میں کسی دوسرے کو قانون بنانے اور حکم کرنے کا حق بھی کیا ہے؟ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُس قادر و مقتدر خدا کا بنایا ہوا قانونِ فطرت تمام موجودات میں جاری اور جاری ہے۔ جمادات، نباتات اور حیوانات سب اُس کے قانون میں (جس کو سنت الشیاء قانونِ قدرت کہا جاتا ہے) جکڑے ہوئے ہیں اور کسی میں اس کی خلاف ورزی کی تاب نہیں وَلٰكِنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اِفْلٰهٍ سَبِيْلًا ط اور اگر ہم خدا تعالیٰ کے اس قانون میں (جس کو لاءِ نیچر کہتے ہیں) ترمیم و تیسخ کا اختیار کئے تو سرو کے درخت میں ام اور بادام پیدا کر دیتے۔ بیروں اور کھجوروں میں گٹھلیاں پیدا نہ ہونے دیتے۔ گھسے کے سر پر سینگ پیدا کر دیتے، یا گدھے کے سر کی طرح گائے بیل اور بھینس کے سر سے سینگ الگ کر دیتے اور اپنی اس حماقت اور جہالت کو عقل و دانائی قرار دے کر اس مصلحت اندیش حقیقی کے قانون میں

اصلاح و ترمیم کرنے والے بن جاتے۔ لیکن اس کا قانون ہماری دسترس سے باہر، ہر عیب و سقم سے پاک، ہر اعتبار سے ناقابل ترمیم اور تمام موجوداتِ عالم میں پوری طاقت اور شوکت کے ساتھ نافذ ہے اور تمام مخلوقاتِ عالم ایک ذرہ بے مقدار سے لے کر آفتابِ عالمتاب تک، شرمی سے لے کر ثیاب تک اور فرش سے لے کر عرش تک اس کی تعمیل اور فرمانبرداری میں ہمہ تن مصروف اور بے اختیار ہے۔

قانونِ خداوندی کا نافذ کرنے والا بالذات انسان ہی ہے | مخلوقاتِ عالم میں صرف انسان

ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کو خدا تعالیٰ نے خاص قسم کی صلاحیت اور استعداد عطا فرما کر ایک محدود دائرہ میں آزاد ارادہ اور اختیار دے دیا ہے، اور اس آزاد ارادہ اور اختیار کے لئے اس کو قانون دے کر اس کی تعمیل چاہی ہے۔ اسی قانون کا نام دین اور مذہب ہے اور اسی کی تعلیم اور یاد دہانی کے لئے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے اور اسی سلسلہٴ تعلیم کو امام الانبیاء سید المرسلین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مبعوث ہو کر پائی تکمیل تک پہنچایا اور اسی کا آپ کی وفاتِ حسرت آیات سے اکیاسی روز قبل ہزاروں کی تعداد میں اُن قدسی صفات اور پاک نفوس کے بھرے مجمع میں میدانِ عرفات کے اندر نویں ذوالحجہ کو جمعہ کے دن اور عصر کے وقت یہ اعلان کروایا گیا کہ :

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ
عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ
آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور
تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے
میں نے دین اسلام کو پسند کیا۔

اس اعلانِ خداوندی کا یہی منشا ہے کہ قیامت تک اب دین میں کسی ترمیم و تیسخ اور حذف و اضافہ کی نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ ہدایت کے لئے جن احکام کی ضرورت تھی وہ اصولاً سب نازل کر دیئے گئے ہیں۔ اب جو شخص دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کرتا ہے جس کی تعلیم جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے امت کو نہیں دی تو گویا وہ درپردہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ دین نامکمل اور میری ترمیم کا محتاج ہے، یا وہ اس کا مدعی ہے کہ معاذ اللہ تعالیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود روف اور رحیم ہونے کے اپنی امت کو بہتر، اعلیٰ اور مکمل طریقہ نہیں بتایا۔ الغرض جس طرح اس کا

قانون قدرت، ترمیم و تیسح اور مخلوق کے دست برد سے بالاتر ہے، اسی طرح اس کا قانونِ شرع بھی ترمیم و تیسح اور تنقیص و اضافہ سے بالاتر ہے۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ اس میں ترمیم کر سکے، اور کسی دانش فروش کو کیا حوصلہ ہے کہ وہ اس کو ناقص اور ناقابل قرار دے کر اس میں اضافہ اور اصلاح کا مدعی ہو سکے۔ کوئی حکمت اور دانائی کی ایسی بات نہیں جو قانونِ خداوندی میں موجود نہ ہو۔ انسانی زندگی کا کوئی بھی کھلا اور چھپا ہوا شعبہ ایسا نہیں جس کے نشاۃ بنانے کا نہایت مکمل اور ناقابل ترمیم دستوِ عمل اس میں نہ پیش کیا گیا ہو۔

جميع العلم في القرآن لكن تقاصر عنه افهام الرجال
 كتاب اللہ کی ہمہ گیر صداقت اور دین اسلام کا مکمل ہونا اپنوں کی نگاہوں میں | ① امیر المؤمنین
 خلیفہ راشد حضرت عمرؓ (المتوفی ۳۳ھ) نے ایک خاص موقع پر ارشاد فرمایا :

انا کتا اذل قوم فاعزنا الله بالاسلام ہم ایک ذلیل و خوار قوم تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین اسلام
 فہما نطلب العز بغیر ما اعزنا کی وجہ سے عزت دی۔ جب بھی ہم کسی ایسے طریقے سے عزت
 الله به اذلتنا الله۔ (مسند رکب املا حاصل کرنا چاہیں گے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عزت
 وج ۳ ص ۵۔ وقال الحاكم الذہبی صحیح)۔ نہیں دی (یعنی وہ اسلام کے خلاف ہو) تو یقیناً اللہ تعالیٰ
 ہمیں ذلیل اور رسوا کر کے چھوڑے گا۔

② خلیفہ راشد اور پہلی صدی کے مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ (المتوفی ۱۰۱ھ) نے اپنی ایک تقریر
 میں فرمایا: "اقباعد! تمہارے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں ہے
 اور خدا تعالیٰ نے جو مکمل کتاب آپ پر نازل کی ہے، اس کے بعد کوئی دوسری کتاب آنے والی نہیں ہے۔
 خدا تعالیٰ نے جو چیز حلال کر دی ہے وہ قیامت تک حلال رہے گی، اور جو چیز حرام کر دی وہ قیامت تک
 کے لئے حرام رہے گی۔ میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں، میں تو صرف احکامِ الہی کو نافذ کرنے
 والا ہوں۔" (سیرت ابن جوزی ص ۱۰۱)۔ اسی کے آگے یوں ارشاد فرمایا :

آلا وانی لست بمبتدع ولكنی . خبہ دار! میں بدعتی نہیں، بلکہ میں تو مشبع

متَّبِع - (الاعتصام ج اصلاً)۔

سُنَّت ہوں۔

③ امام دارِ ہجرت حضرت امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) بدعات کی تردید کرتے ہوئے ارشاد

فرماتے ہیں :

جس نے اسلام میں کوئی بدعت نکالی جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے تو گویا اُس نے یہ گمان کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ادا کیجی رسالت میں خیانت کی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ (الایہ)۔ پس جو چیز اس وقت دین نہ تھی، آج بھی ہرگز دین نہیں ہو سکتی۔

من ابتدع فی الاسلام بدعةً یراها حسنة فقد زعم ان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم خان الرسالة لان اللہ تعالیٰ یقول الیوم اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِینَکُمُ الایة فما لم یکن یومئذ دیناً فلا یكون الیوم دیناً۔

(کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۲۷ و ج ۲ ص ۱۵۱ للشاطبیؒ)

④ علامہ حسام الدین علی متقی الحنفی (المتوفی ۹۷۵ھ) بدعات اور اہل بدعات کی تردید کرتے

ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

یعنی خصوصیت کے ساتھ تیسرے دن کا اجتماع نہ تو فرض ہے اور نہ واجب، نہ سنت ہے اور نہ مستحب، نہ تو اس میں کوئی دینی فائدہ ہے اور نہ اس میں کوئی دینی مصلحت ہے بلکہ اس میں طعن و مذمت اور ملامت ہے سلف پر، کہ انہوں نے اس کو بیان نہیں کیا بلکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر کہ آپ نے میت کے حق بیان نہیں فرمائے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی پر کہ اُس نے شریعت کو مکمل نہیں کیا (اور ہماری بدعات کی وہ محتاج ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے

ان هذا الاجتماع فی الیوم الثالث خصوصاً لیس فیہ فرضیة ولا فیہ وجوب ولا فیہ سنۃ ولا فیہ استحباب ولا فیہ منفعة ولا فیہ مصلحة فی الدین۔ بل فیہ طعن ومذمة وهلامۃ علی السلف حیث لم یبیتوا بل علی التبی صلی اللہ علیہ وسلم حیث ترک حقوق المیت بل علی اللہ سبحانہ وتعالیٰ حیث لم یکمل الشریعة وقد قال اللہ تعالیٰ الیوم اَکْمَلْتُ لَکُمُ

دَيْنَكُمْ الْاٰیة (بجوالہ تفہیم المسائل ص ۱۷)۔
آج کے دن تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے۔

⑤ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ (المتوفی ۱۰۰۴ھ) بدعت اور اہل بدعت کی تردید میں

فرماتے ہیں :

روشن سنت کے نور پر بدعات کی تاریکیاں چھا گئی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ملت کی رونق کو نئے نئے امور کی کدورت نے ضائع کر دیا ہے۔ حیرت تو ان لوگوں پر ہے جو ان بدعات اور محدثات کو اچھے امور تصور کرتے اور ان بدعات کو نیکیاں یقین کرتے ہیں اور دین کی تکمیل اور ملت کی تنظیم ان بدعات سے تلاش کرتے ہیں اور ان امور کی ادائیگی میں ترغیب دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو صراطِ مستقیم پر چلائے، مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ دین ان محدثات سے پہلے ہی کامل ہو چکا ہے اور نعمت تمام ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اسی سے وابستہ ہو چکی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آج کے دین میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے (الایۃ سو دین کا کمال ان بدعات سے تلاش کرنا اور حقیقت اس آیتِ کریمہ کے مضمون سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔

کہ دل آزرہ شومی ورنہ سخن بسیار است

(مکتوبات حصہ چہارم ص ۹۴ مکتوب ۲۶)

⑥ ملا علی نقاری الحنفیؒ (بقول بعض حضرات گیارہویں صدی کے مجدد الف ثانیؒ) ارشاد

فرماتے ہیں :

نورِ سنتِ سنہ را ظلماتِ بدعتہا مستور ساختہ اند و رونقِ بِلتِ مصطفویہ را کدورتِ امورِ محدثہ ضائع گردانیدہ عجب تر آنکہ جمع آں محدثات را امورِ مستحسنہ میدانند و آں بدعت ہا را احسانات میں انگازند و تکمیلِ دین و تنظیمِ ملت ازاں محدثات میں جویند و در اتیان آں امور ترغیبات میں نمایند ہر اہم اللہ صراطِ مستقیم، مگر نئے دانند کہ دین پیش ازیں محدثات کامل شدہ بود و نعمت تمام گشتہ و رضائے حق تعالیٰ بحصول پیوستہ کما قال اللہ الْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الْاٰیة پس کمال دین ازیں محدثات جستن فی الحقیقت انکار نمودن است۔ مقتضائے

ایں آیتِ کریمہ

اند کے پیش تو گفتم غمِ دل و ترسیدم

قال الله تعالى الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ
 الآية - فلا نحتاج في تكميله الى امر
 خارج عن الكتاب والسنة -
 الله تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج کے دن میں تمہارے لئے
 تمہارا دین مکمل کر دیا ہے (الایۃ) سو ہمیں دین کی تکمیل میں
 کسی ایسے امر کی حاجت اور ضرورت نہیں ہے جو کتاب و
 (شرح فقہ اکبر ص ۱۷۱ کان پوری) اور سنت سے خارج ہو۔

غرضیکہ دین اسلام ایسا مکمل نظام عمل ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی
 کرنا یقیناً محال ہے اور اس کامل اور مکمل ضابطہ حیات کی موجودگی میں کسی اور ضابطہ کی طرف نگاہ
 اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن کریم کی حقانیت اور دین اسلام کی عظمت غیروں کی نگاہ میں | جن اہل یورپ کی تقلید کو آج
 بدقسمتی سے مسلمان مایہ افتخار سمجھتے ہیں اور مردوں سے لے کر عورتوں تک، بچوں سے لے کر بوڑھوں تک،
 ہر ہر ادا میں ان کی نقل اتارتے اور ان کے فیشن اور رسم میں رنگے ہوئے اور سیرت و صورت میں انکی
 نقالی کے دلدادہ ہیں، ان کی عینک سے اس کامل اور مکمل کتاب کو ملاحظہ کیجئے :

① بیروت کے ایک مسیحی اخبار الوطن میں ایک عیسائی نامہ نگار لکھتا ہے :

”پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کی قوم کے پھیلنے اور باقی رہنے کے تمام سامان فراہم کر دیئے۔ کیونکہ
 مسلمان جب قرآن و حدیث میں غور کریں گے، تو وہ اپنی ہر دینی و دنیوی ضرورت کا علاج
 اس میں پائیں گے۔“

② جی۔ ایم۔ راڈویل کہتا ہے کہ :

”قرآن میں ایک نہایت گہری حقانیت ہے جو ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے جو باوجود
 مختصر ہونے کے قومی اور صحیح راہنمائی اور الہامی حکمتوں سے مملو ہیں۔“

③ جرمن مستشرق عمانویل ڈوش لکھتا ہے کہ :

”اسی قرآن کی مدد سے تمام سامی اقوام میں صرف عرب ہی یورپ میں شاہانہ حیثیت سے
 داخل ہوئے۔ جہاں اہل قینیشیا بطور تاجروں کے اور یہودی لوگ پناہ گزینوں اور اسیروں کی حالت

میں پہنچے۔ ان عربوں نے بنی نوع انسان کو روشنی دکھلائی جبکہ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی ان عربوں نے یونان کی عقل و دانش کو زندہ کیا اور مغرب و مشرق کو فلسفہ، طب اور علم ہیئت کی تعلیم دی اور موجودہ سائنس کے جنم لینے میں انہوں نے حصہ لیا۔ ہم ہمیشہ اُس روز کا ماتم کریں گے جس دن غرناطہ عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

④ ڈاکٹر سموئیل جاسن لکھتا ہے کہ :

”قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر ہیں اور ہر زمانہ کے لئے اس قدر موزون ہیں کہ زمانہ کی تمام صدائیں خواہ مخواہ اُس کو قبول کر لیتی ہیں اور وہ محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے۔

⑤ لڈولف کرہیل لکھتا ہے :

”قرآن میں عقائد، اخلاق اور ان کی بنا پر قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے۔ اس میں ایک وسیع جمہور کی سلطنت کے ہر شعبہ کی بنیادیں بھی رکھ دی گئی ہیں۔ عدالتِ حربی انتظامات، مالیات اور نہایت محتاط قانونِ غرباء وغیرہ کی بنیادیں خدا نے واحد کے یقین پر رکھی گئی ہیں۔“

(ماخوذ از مقدمہ تاریخ ہند ج ۲ ص ۳۱۳ تا ص ۳۱۹ از اکبر شاہ خان)

⑥ سر ولیم میور اپنی کتاب ”لائف آف محمد“ میں لکھتا ہے کہ :

”جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک ایسی کتاب نہیں جو اس ”قرآن مجید“ کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔“

⑦ مشہور مصنف ڈاکٹر مورس فرانسسیسی لکھتا ہے کہ :

”قرآن دینی تعلیم کو خوبیوں کے لحاظ سے تمام دنیا کی مذہبی کتابوں سے افضل ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کی ازلی عنایت نے جو کتابیں دیں ان سب میں قرآن بہترین کتاب ہے۔

⑧ ڈاکٹر مورس کہتا ہے کہ :

”قرآن نے دنیا پر وہ اثر ڈالا جس سے بہتر ممکن نہ تھا۔“

⑨ ڈاکٹر اسٹین گاس اپنی ڈکشنری میں لکھتا ہے کہ :

”قرآن کی خاص خوبی اس کی ہمہ گیر صداقت میں مضمر ہے۔“

⑩ مشہور مترجم قرآن جارج سیل لکھتا ہے کہ :
”قرآن جیسی معجزہ کتاب انسانی قلم نہیں لکھ سکتا۔ یہ مستقل معجزہ ہے جو مردوں کو زندہ کرنے کے معجزہ سے بلند تر ہے۔“

⑪ پادری وال ریسن بی۔ ڈی کہتا ہے کہ :

”مسلمانوں کا مذہب جو قرآن کا مذہب ہے، ایک امن اور سلامتی کا مذہب ہے۔“

⑫ گاڈ فری ہیگینس لکھتا ہے کہ :

”قرآن کمزوروں اور غریبوں کا غم خوار ہے اور نا انصافی کی جا بجا مذمت کرتا ہے۔“

⑬ ڈاکٹر کینن آٹرک ٹیلو کہتا ہے کہ :

”اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے جو تہذیب و تمدن کا علمبردار ہے۔“

⑭ مسٹر جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب ”اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن“ میں لکھتا ہے کہ :

”فی الحقیقت قرآن عیوب سے ایسا مبرا ہے کہ اس میں خفیف سے خفیف ترمیم کی بھی ضرورت

نہیں۔ اول سے آخر تک اسے پڑھ جائیے تو اس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پائیے گا جو پڑھنے والے کے چہرہ

پر شرم و حیا کے آثار پیدا کر دے“ (کیونکہ اس میں کوئی ایسا نقش لفظ ہی نہیں ہے)۔ (بحوالہ خطبہ صدارت

۱۳۱۲ھ حضرت شیخ العرب و العجم مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، المتوفی ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۴ھ

اجلاس پنجاہ سالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ)۔

⑮ رومی مورخ ایڈورڈ گبون صاحب لکھتے ہیں کہ :

”قرآن کی بہت سی نقلوں سے وہی اعجاز کا سا خاصہ یگانگت و عدم قابلیت تحریف کا متن

ثابت ہوتا ہے۔“

⑯ پادری عماد الدین صاحب باوجود اسلام اور مسلمانوں کے اشد ترین دشمن ہونے کے یوں لکھتا ہے کہ :

”قرآن آج تک وہی قرآن ہے جو محمد صاحب کے عہد میں تھا۔“

①۷ گبن صاحب کہتے ہیں کہ :

"اوقیانوس سے گنگا تک قرآن شریف مجموعہ قوانین مانا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں صرف فقہی مسئلے ہوں بلکہ قوانین دیوانی، فوجداری اور دیگر مضامین بھی اس میں درج ہیں۔ اور وہ قاعدے جو آدمیوں کے اعمال اور مال کی نسبت مقرر کئے گئے ہیں، وہ خدا تعالیٰ کی بے زوال رضا سے بنائے گئے ہیں یا یہ تبدیل الفاظ ہم اس مطلب کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ قرآن شریف مسلمانوں کا مجموعہ قوانین عامہ ہے۔ اس میں قوانین مذہبی اور سلوک باہمی اور فوجداری اور دیوانی اور تجارتی اور فوجی اور ملکی اور سزاوی سب موجود ہے، اور مذہبی رسوم سے لے کر معاملات دنیوی تک ہر ایک چیز کا مفصل بیان ہے قرآن نجاتِ روح اور صحتِ جسمانی اور حقوقِ عامہ اور حقوقِ شخصی اور نفعِ رسانیِ تخلیق اور نیکی اور بدی اور سزا دینی و دنیوی سب چیز پر حاوی ہے۔" (بحوالہ نوید جاوید ص ۵۲۲ تا ۵۲۳)

①۸ مشہور جرمنی فاضل گوٹے لکھتے ہیں کہ :

"اس کتاب (قرآن) کی اعانت سے عربوں نے سکندریہ ام کے جہاں سے بڑا جہاں اور رومیہ الکبریٰ کی سلطنت سے وسیع تر سلطنت فتح کر لی، اور جس قدر زمانہ سلطنتِ روما کو اپنی فتوحات کے حاصل کرنے میں درکار ہوا تھا، اس کا دسواں حصہ بھی ان کو نہ لگا۔" (بحوالہ رسالہ حجۃ قرآن ص ۱۱۱، نظامی پریس بدایوں) اسی جامع و مکمل، بے نظیر انقلاب انگیز کتاب کی بے پناہ قوت اور طاقت سے خائف اور بدحاس ہو کر برطانیہ کے مشہور ذمہ دار وزیر اعظم کلیڈ اسٹون نے بھرے مجمع میں قرآن کریم کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے یہ کہا تھا کہ :

"جیتک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی۔" (بحوالہ خطبہ مذکورہ ص ۱۱۱)۔ اور ہنری ہرننگٹن ٹامس نے کہا کہ :

"مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو، اچھی رعایا نہیں ہو سکتے۔ اسلئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔" (بحوالہ حکومت خود اختیاری ص ۵۵)۔

اور گورنر جنرل ہندلارڈ ایلن برائے ۱۸۲۳ء میں ڈیوک آف وائنگٹن کو لکھا کہ :

”میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً بہارتی دشمن ہے اس لئے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے رہیں۔“ (آج بیسی انڈیا ص ۳۹۹)

قرآنِ کریم کو مٹانے اور مسلمانوں کے صحیح جذبات کو دنیا سے ناپید کرنے کے لئے ایسے ایسے حربے استعمال کئے گئے کہ شیطان بھی دم بخود ہو گیا۔ اور لارڈ میکالے نے صاف لفظوں میں کہا کہ :

”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں تو دل اور

دماغ کے اعتبار سے فرنگی۔“ (مدینہ - بخنور ۲۸ فروری ۱۹۳۲ء)

انگریز کا تو بہر حال یہ پروگرام تھا کہ وہ مسلمانوں کی متاعِ ایمان کو کالجوں، ہسپتالوں اور کلبوں کے ذریعہ لوٹتا۔ مگر افسوس صد افسوس تو مسلمانوں پر ہے جنہوں نے اس مکمل کتاب کی قدر نہ کی اور اس سے ہدایت اخذ کر کے نجاتِ روح اور صحتِ جسمانی حاصل نہ کی۔

وحی غیر متلو اور حدیث | ہدایت کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو وحیِ نخی یا وحی غیر متلو اور حدیث کہا جاتا ہے، اور جس کی رہبری میں اور جس کے سانچے میں ڈھل کر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام شعبوں کی جامع ہے، ہر ایک کی رہبری کے لئے بہترین نمونہ اور عمدہ سامانِ ہدایت بن گئی ہے، اور اسی کو سنتِ رسول اللہ کہا جاتا ہے اور اسی وحیِ نخی کے ذریعہ وحی ہوں تعلیم کا نام قرآن مجید میں حکمت لیا گیا ہے۔ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ - جس میں قرآن مجید کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں اور اعمال کی خدا تعالیٰ نے اپنی مصلحت کے موافق تعلیم فرمائی ہے جس طرح احکامِ خداوندی سے بے نیازی نہیں ہو سکتی اسی طرح اسوۂ رسول اور سنتِ رسول اللہ سے بھی بے پڑائی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ سنتِ رسول اللہ کی اطاعت بھی ایسی ہی ضروری ہے جیسی کتاب اللہ کی۔ اس لئے کہ دونوں کی پیروی حکمِ الہی کی پیروی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول اللہ کی اطاعت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ تو جس طرح قرآن مجید کی اطاعت خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے، اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت بھی خود خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اور جو رسول اللہ کی اطاعت کرے، اس نے

اللہ - (پ ۵ - النساء، رکوع ۱۱) اللہ کی اطاعت کی۔

یہ معلوم اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ثواب اور عذاب، نیکی اور بدی کا تعین اور اس کا صحیح امتیاز جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا۔ جس چیز کو آپ نے گناہ اور جرم قرار دیا ہو، دنیا میں کوئی شخص اس کی خوبی ثابت نہیں کر سکتا، اور جس چیز کو آپ نے نیکی قرار دیا ہو، دنیا کی کوئی طاقت، اُس کی بُرائی ثابت نہیں کر سکتی۔ تمام وہ اخلاقِ حسنہ جو اقوامِ عالم اور نسلِ انسانی میں مستحسن اور پسندیدہ سمجھے جاتے ہیں، وہ سب الہاماتِ الہیہ اور تعلیماتِ انبیاء اور خصوصاً جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔ کیا خوب کہا گیا ہے

چمکتی ہے جو ریگ اکثر، نشاں ہے مہ جبینوں کا
جسے ہم روندتے پھرتے ہیں یہ سب خاکِ انسان ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی پہنچائی ہوئی اور بتائی ہوئی ہر ایک تعلیمِ خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت ہوتی ہے، رسول کا کام صرف دینِ حق کی تبلیغ کرنا ہے، دین کا بنانا نہیں، اور اسی لئے وہ مطاع ہوتا ہے، اور اس کی اطاعت ہر شخص پر فرض ہوتی ہے اور اس کی پیش کردہ تعلیم کا انکار کرنے والا کافر ہوتا ہے۔ رسول کے سوا کسی دوسرے شخص کو اور اس کی پیش کردہ تعلیم کو ہرگز ہرگز یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم عینِ فطرتِ انسانی کے موافق اور متوازی ہے۔ اور انسانی فطرت کے دبے اور چھپے ہوئے جملہ تقاضوں کی ترجمانی ہے، اور اس کی خلاف ورزی فطرت سے بغاوت ہے۔ ہادیٰ برحق راہبرِ کامل خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت اور آئین جس توجہ کا مستحق ہے، اگر ویسی ہی توجہ اس کی طرف کی جائے تو آج بھی مسلمان وہی جوشِ ایمانی اور وہی مہبوتِ گن کارنامے دنیا کو پھر دکھا سکتے ہیں جو حضراتِ صحابہ کرام نے دکھائے تھے۔ مذہبِ اسلام اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ دنیا میں کامل اتحاد، صحیح عدل اور مکمل امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔ نہ تو آپ جیسا رہبرِ کامل دنیا میں پیدا ہوا، اور نہ تا قیامت پیدا ہوگا،

اور نہ کوئی نظام اور آئین ہی ایسا موجود ہے۔

شرابِ خوشگوارم ہست و یارِ مہرباں ساقی

نداردیہیج کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

ولادت سے لے کر وفات تک، خوشی سے لے کر غمی تک، زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ میں اُس کی اصلاح کے لئے ہم کو صرف سنتِ رسول اللہ اور شریعتِ اسلامی کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا، جو ہر طرح سے محفوظ و موجود ہے۔ کسی دوسری شریعت، کسی دوسرے ہادی، کسی اور آئین اور کسی رسم و رواج کی طرف نہ تو ہمیں نگاہ اٹھانے کی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ بھلا جس کے گھر میں شمع کا فوری روشن ہو، اُس کو فقیر کی جھونپڑی سے اس کا ٹٹاٹا ہوا چراغ چرانے کی کیا ضرورت اور حاجت ہے؟ ہاں مگر کوئی خوش نصیب اس کی طرف ہاتھ بھی تو بڑھائے۔ کوتاہ دست اور بد قسمت کو سنتِ رسول اللہ کے آپ حیات سے کیا فائدہ؟

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی

جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

سنت کا مقام، صاحبِ سنت کی نگاہوں میں | جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سنت پر عمل پیرا ہونے اور اُس کو مضبوطی سے پکڑنے کی اشد تاکید فرمائی ہے اور اس کی پیروی نہ کرنے پر انتہائی ناراضگی فرمائی ہے۔

① حضرت عرباض بن ساریہ (المتوفی ۳۵ھ) کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فعلیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدین

المہدیین عضوا علیہا بالنواجذ و ایاکم

و محدثات الامور فان کل محدثۃ بدعة

(مستدرک ج ۱ ص ۹۱) قال الحاکم والذہبی صحیح۔

تمہارے اوپر لازم ہے کہ تم میری سنت کو اور ہدایت یافتہ

خلفاء راشدین کی سنت کو معمول بناؤ اور اپنی ڈاڑھوں کے

ساتھ مضبوطی سے اس کو پکڑو، تم نئی نئی باتوں سے پرہیز

کو، کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے۔

یہ صحیح روایت صراحت سے اس امر کو بیان کرتی ہے کہ ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اور حضرات خلفائے راشدین کی سنت کو خوب مضبوطی سے پکڑے، اور اس کو اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، اور جملہ محدثات اور بدعات سے کنارہ کشی کرے کیونکہ ہر ایک بدعت گمراہی اور ضلالت ہے۔

② حضرت عبداللہ بن عباسؓ (المتوفی ۳۶ھ) سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر

خطاب کرتے ہوئے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا :

يا ايها الناس اتى قد تركت فيكم ما ان
اعتصمتم به فلن تضلوا ابداً كتاب
الله وسنة نبيه (صلى الله عليه وسلم)
(مستدرک ج ۱ ص ۹۱) (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے۔)

اے لوگو! میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑا تو ہرگز تم گمراہ نہ ہو گے۔ ان میں سے ایک کتاب اللہ اور دوسری سنت رسول اللہ،

③ حضرت عائشہ صدیقہؓ (المتوفیہ ۶۵ھ) سے روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے فرمایا : چھ قسم کے لوگ ہیں جن پر میں بھی لعنت بھیجتا ہوں، اللہ تعالیٰ بھی ان پر لعنت نازل کرے۔ ان میں سے ایک والتارك لسنتي (مستدرک ج ۱ ص ۱۱۱، قال الحاكم والذہبی صحیح) وہ شخص ہے، جو میری سنت کو چھوڑ دے۔

④ حضرت انس بن مالکؓ (المتوفی ۹۳ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ ایک خاص موقع پر آنحضرت

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا :

فمن رغب عن سنتي فليس
بميتي۔ (بخاری ج ۲ ص ۵۵۲) میرا نہیں ہے۔

اس سے بڑھ کر تارک سنت کی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ میرا (امتی) نہیں ہے، گو وہ اپنے مقام پر آپ کا محبت بنتا رہے۔ مگر اس کی رائے کا کیا اعتبار ہے؟

⑤ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ (المتوفی ۳۱ھ) جناب رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے

روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا :

تكون بعدى ائمة لا يمتدون بعدى ولا يستنون بسنتى وسيقوم فيهم رجال قلوبهم قلوب الشياطين في جحمان انس۔
 کہ میرے بعد کچھ رہبر اور پیشوا ایسے ہوں گے جو میری سیرت پر نہیں چلیں گے اور میری سنت پر عمل نہیں کریں گے، ان میں کچھ ایسے لوگ کھڑے ہوں گے جن کے دل شیطانوں کے دل ہوں گے مگر شکل اور صورت انسانی ہوگی۔ (مسلم ج ۲ ص ۱۲۷)

اتباع سنت کے بارے میں کتب احادیث میں اس قدر ذخیرہ موجود ہے کہ آسانی کے ساتھ اس کا شمار نہیں ہو سکتا، مگر بطور نمونہ کے ایک عاقل کے لئے یہ پیش کردہ روایات کافی ہیں۔ لیکن جو عمداً غافل رہنا چاہتا ہے، اس کے لئے دنیا میں کوئی علاج موجود نہیں ہے۔ ایسے شخص کے لئے فیصلہ یہی ہے۔ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ (المتوفی ۱۱۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

اقول انتظام الدین يتوقف على اتباع سنن النبى۔ (حجۃ اللہ ص ۱۷۱)۔
 میں کہتا ہوں کہ دین کا انتظام اس بات پر موقوف ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنتوں کا اتباع کیا جائے۔

آپ کی پاک مہم کی قدر و عظمت غیروں کی نگاہوں میں | یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد سے ہر طرح دین کی تکمیل ہو گئی، ہر قسم کی نبوت کا خاتمہ ہو گیا، دنیا میں خدا کا آخری پیغام پہنچ گیا۔ معمارِ قدرت اپنی عمارت میں آخری پتھر کو اپنی جگہ رکھ کر اپنی تعمیر پوری کر چکا۔

درجہ بدرجہ چاند اور ستاروں کے طلوع کے بعد وہ خورشید انور طالع ہوا جس کے لئے غروب نہیں۔

طرح طرح کی بہاروں کے آنے کے بعد کائنات میں وہ سدا بہار موسم آگیا جس کے بعد پھر خزاں نہیں۔ سنت نبوی کی

فیروز میندیاں رحمتِ ایزدی کا ابر بہار بن کر کوہ و دشت پر پھول برسائے لگین۔ باغبانِ فطرت کی رکھوالی اور باغبانِ

رحمت کی پرورش نے ایک ایسا لہلہاتا ہوا چمن تیار کیا جس کی بہار کا تابناک اور روشن منظرہ آنکھوں

نے دیکھا۔ اپنے تو اپنے غیر بھی اُس آفتابِ نبوت کو سنم کہنے پر مجبور ہیں اور کیوں نہ کہیں سے

سرخ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ

نہ ہماری بزمِ خیال میں، نہ دوکانِ آئینہ ساز میں

① مسٹر ایڈورڈ مونٹ پروفیسر السنہ شرقیہ جنیوا یونیورسٹی کہتے ہیں کہ :

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلاحِ اخلاق اور سوسائٹی کے متعلق جو کامیابی ہوئی، اس کے اعتبار سے آپ کو انسانیت کا محسنِ اعظم یقین کرنا پڑتا ہے۔" (بحوالہ مقدمہ تاریخ ہند ج ۲ ص ۲۳۱)۔

② مسٹر طامس کارلائل اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورثپ" میں لکھتے ہیں کہ :

"صاف و شفاف قلب اور پاکیزہ روح رکھنے والے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ذنیوی ہوا و ہوس سے بالکل بے لوث تھے۔ ان کے خیالات نہایت متبرک اور ان کے اخلاق نہایت اعلیٰ تھے۔ وہ ایک سرگرم اور پرجوش ریفارمر تھے، جن کو خدا نے گمراہوں کی ہدایت کے لئے مقرر کیا تھا۔ ایسے شخص کا کلام خود خدائی آواز ہے۔ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے انتفک کو شمش کے ساتھ حقانیت کی اشاعت کی زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے مقدس مشن کی تبلیغ جاری رکھی۔ دنیا کے ہر حصہ میں ان کے متبعین بکثرت موجود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی صداقت کامیاب ہوئی۔" (بحوالہ عصر جدید، ۱۸ اگست ۱۹۲۹)۔

③ لندن کا مشہور اخبار "نیو ایسٹ لکھتا ہے کہ :

محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی تعلیم و ارشاد کی قدر و قیمت اور عظمت و فضیلت کو اگر ہم تسلیم نہ کریں تو ہم فی الحقیقت عقل و دانش سے بیگانہ ہیں۔" (بحوالہ خطبہ مذکورہ ص ۱۱۱ از حضرت منیٰ قدس اللہ سرہ)۔

احسان فراموشی کی اس سے بدترین مثال بھی کیا دنیا میں کوئی ہو سکتی ہے کہ بیگانے تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم و ارشاد اور سنت کی قدر و قیمت کا اعلان کریں اور ہم غیروں کی صورت و سیرت، گفتار و کردار اور رسم و فیشن پر مفتون ہوں۔ حیف اور صد حیف ہے اس برائے نام عشق و محبت کے جموٹے دعووں پر۔ خلاصہ امر یہ ہے کہ کتاب و سنت کی گسوٹی پر گے بغیر خود ساختہ بدعات اور خود تراشیدہ رسوم کو تسلیم کرنے میں ہر مسلمان کو ہمیں غور اور فکر کر لینا اور ہر مسئلہ کی اسلامی حیثیت سے کما حقہ واقف اور آگاہ ہونا

از بس لازم اور ضروری ہے اور بغیر اتباعِ کتاب اور سنت کے، محبتِ خدا اور رسول کا دعویٰ بالکل بے بنیاد اور سراسر بے کار ہے۔ چنانچہ مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کے والد ماجد مولوی نقی علی خان صاحب ارشاد فرماتے ہیں: ”دعویٰ محبتِ خدا اور رسول بدون اتباعِ سنت سراسر لاف و گداز ہے۔“ (سرور القلوب ص ۱۳۱) الغرض کتاب و سنت ہمارے دستور کی اساس، ہمارے آئین کی بنیاد، ہمارے نظامِ اجتماعی کا شیرازہ، ہماری سیاست کا ماخذ، ہماری معیشت کا اصل، ہماری معاشرت کی نیو اور ہماری زندگی کے سارے مسائل کا مرکز اور محور ہے، اور ہماری زندگی کا کوئی پہلو اور گوشہ ایسا باقی نہیں رہ جاتا جو اصولی طور پر اس کے دائرہ عمل سے باہر ہو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس پر عمل کریں۔

اجماع و اتفاق شرعی حجت ہے کتاب و سنت کے بعد دلائل کی مد میں اجماع کا مرتبہ اور درجہ ہے یہ بات ملحوظ خاطر ہے کہ آسانی کے لئے اجماع کا تجزیہ یوں کیا جاسکتا ہے۔ حضرات خلفاء راشدین کا اجماع، عام صحابہ کرام کا اجماع اور امتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیہ) کا اجماع۔ ان میں ہر ایک اجماع اپنے مقام پر صحیح اور حجت ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب سے ہم اختصاراً کچھ دلائل عرض کرتے ہیں۔ ان کا بغور مطالعہ کیجئے تاکہ صحیح بات ذہن نشین ہو جائے۔

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

لیکن اس سے قبل حضرات خلفاء راشدین کی خلافت کے حق ہونے اور ان کی سنت کے واجب الاتباع ہونے کے متعلق مختصراً عرض ہے:

حضرات خلفاء راشدین کی خلافت اور ان کی سنت | جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

سے فیض یافتہ حضرات ہر ایک اپنے مقام پر آفتابِ ہدایت کا درخشاں ستارہ اور سمارِ علم کا روشن کوکب ہے۔ مگر یہ بات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ جیسا فیض آپ سے حضرات خلفاء اربعہ کو نصیب ہوا، مجموعی لحاظ سے وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا، اور انہی کے وجودِ مسعود سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

ہیں اور کئے ہیں انہوں نے نیک کام۔ البتہ (آپ کے بعد) حاکم کر دے گا ان کو ملک میں جیسا سا کم کیا تھا ان سے گلوں کو، اور جہاد سے گا ان کے لئے دین ان کا جو پسند کر دیا ان کے واسطے، اور دے گا ان کو ان کے ڈر کے بدلے امن، میری بندگی کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو کوئی ناشکری کرے گا اس کے بعد، سو وہی لوگ نافرمان ہیں۔

الذِّينَ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلِيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلِيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اٰمِنًا يَعْبُدُوْنِي لَا يَشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (پ ۱۸ - التور - رکوع ۷)

اس آیت استخلاف سے حضرات خلفاء اربعہ کی بہت بڑی فضیلت اور منقبت ثابت ہوئی۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی (المتوفی ۷۳۱ھ) لکھتے ہیں :

”خطاب فرمایا حضرت کے وقت کے لوگوں کو جو ان میں نیک ہیں پیچھے ان کو حکومت دے گا

اور جو دین پسند ہے ان کے ہاتھوں سے قائم کرے گا اور وہ بندگی کریں گے بغیر شرک، یہ چاروں

خلیفوں سے ہوا پہلے خلیفوں سے اور زیادہ، پھر جو کوئی اس نعمت کی ناشکری کرے ان کو بے حکم

فرمایا جو کوئی ان کی خلافت سے منکر ہوا، اس کا حال سمجھا گیا انتہی (موضع القرآن ص ۵۹۲)۔

لفظ استخلاف میں اشارہ ہے کہ وہ حضرات محض دنیوی سلاطین اور ملوک کی طرح نہ تھے بلکہ وہ پیغمبر خدا

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جانشین ہو کر آسمانی بادشاہت کا اعلان کرنے والے اور دین حق کی بنیادیں

جمانے والے تھے جنہوں نے خشکی اور ترمی میں دین اسلام کا سکہ بٹھایا، حتیٰ کہ اس وقت مسلمانوں کو کفار کا مطلقاً

خوف و رعب باقی نہ رہا۔ وہ کامل اطمینان اور امن سے اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول رہے اور ان کی

یہ شان رہی کہ ان کی بندگی میں شرک جلی تو کیا راہ پاتا، شرکِ خفی کی آمیزش بھی نہ تھی۔ یہ بات انصاف

اور قیاس سے بالکل بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ان کو اپنے دین حق کی ترویج و اشاعت کے لئے زمین کی خلافت

اور نیابت سپرد کر دے اور وہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق کے اعتماد و اعتبار سے محروم رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو معیارِ حق گردانتے ہوئے ہمیں ان کی

اتباع اور پیروی کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر باض بن ساریت سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے فرمایا :

یعنی جو شخص میرے بعد زندہ رہا، وہ بہت ہی زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ سو تم پر لازم ہے کہ تم میری اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو جو ہدایت یافتہ ہیں، مضبوط پکڑو اور اپنی ڈاڑھوں اور کچلیوں سے محکم طور پر اس کو قابو میں رکھو۔ اور تم نئی نئی چیزوں سے بچو، کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (امام حاکم اور علامہ ذہبی وغیرہ) فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے۔

فَاتَهُ مِنْ يَعْشُ مِنْكُمْ بَعْدِي فَيُرَى اخْتِلَافًا كَثِيرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمُهَدِيِّينَ تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَإِيَّاكُمْ وَمُحَدَّثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ مُحَدَّثَةٍ بَدْعَةٌ وَكُلُّ بَدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔ (ترمذی ج ۲ ص ۹۱، ابن ماجہ ص ۵، ابوداؤد ج ۲ ص ۲۴۹، مسند دارمی ص ۱، مسند احمد ج ۴ ص ۱ اور مستدرک ج ۱ ص ۹۵)۔ (قال الحاكم والذهبي صحيح)۔

حضرت ملا علی نقاری اس حدیث کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں :

اس لئے کہ حضرات خلفائے راشدین نے درحقیقت آپ ہی کی سنت پر عمل کیا ہے، اور ان کی طرف سنت کی نسبت یا تو اس لئے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور یا اسلئے کہ انہوں نے خود قیاس اور استنباط کے اس کو اختیار کیا۔

فَانَّهُمْ لَمْ يَعْلَمُوا إِلَّا بِسُنَّتِي فَالْإِضَافَةُ إِلَيْهِمْ أَمَا بَعْمَلِهِمْ بِهَا أَوْ لَاسْتِنْبَاطِهِمْ وَاخْتِيَارِهِمْ أَيَّاهَا۔ (مرقات علی مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۱)۔

اس لئے معلوم ہوا کہ حضرات خلفائے راشدین نے جو کام اپنے تفقہ و قیاس اور اجتہاد و استنباط سے سمجھ کر اختیار کیا ہے، وہ بھی سنت ہے۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے تحت اُمت کو اس کے تسلیم کرنے سے بھی ہرگز چارہ نہیں اور وہ اس سنت کو تسلیم کرنے کی بھی پابند ہے۔ اور شاہ عبدالحق صاحب محدث شاہ و بلوچی (المتوفى ۱۵۸۷ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

جس چیز کے بارے میں حضرات خلفائے راشدین نے حکم دیا ہے اگرچہ وہ حکم ان کے قیاس و اجتہاد سے صادر ہوا ہو، وہ بھی سنت کے موافق ہے اور اس پر بدعت کا اطلاق ہرگز

پس ہرچہ خلفاء راشدین بدار حکم کردہ باشند اگرچہ باجتہاد و قیاس ایٹان بود موافق سنت اطلاق بدعت برآن توان کرد چنانکہ

فرقہ زائفہ کند۔ (اشعة اللغات ج ۱ ص ۱۱۱) صحیح نہیں جیسا کہ گمراہ فرقہ کرتا ہے۔

یہ عبارت اس بات کی نص صریح ہے کہ حضرات خلفاء۔ راشدین کے قیاس و اجتہاد سے ثابت شدہ احکام بھی سنت ہی ہوں گے، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے مطابق ان پر عمل کرنا بھی لازم ہے۔

حافظ ابن رجب حنبلیؒ (المتوفی ۷۴۰ھ) تحریر فرماتے ہیں:

والسنة هي الطريق المسلوک فيشمل ذلك التمسك بما كان عليه هو وخلفاء الراشدون من الاعتقادات والاعمال والاقوال وهذه هي السنة الكاملة۔ (جامع العلوم والحکم ج ۱ ص ۱۹)

سنت اس راہ کا نام ہے جس راہ پر چلا جائے، اور یہ اس (راہ کا) تمسک ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین عامل تھے، عام اس سے کہ وہ اعتقادات ہوں یا اعمال و اقوال، اور یہی سنتِ کاملہ ہے۔

یعنی گوئی الجملہ نفس سنت کا اطلاق تو عام حضرات صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین کے قول و عمل پر بھی ہوتا ہے، مگر سنتِ کاملہ صرف یہی ہے جس کا ذکر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی حنبلیؒ (المتوفی ۷۱۰ھ) اہل سنت و الجماعت کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

فعلی المؤمن اتباع السنة والجماعة فالسنة ما سن رسول الله صلى الله عليه وسلم والجماعة ما اتفق عليه الصحابة في الخلافة الائمة الاربعة۔ (غنية الطالبين ص ۱۵ طبع لاہور)

مؤمن پر لازم ہے کہ وہ اہل سنت و الجماعت کی پیروی کرے۔ سنت وہ چیز ہے جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے (قولاً و فعلاً) مسنون قرار دی اور جماعت وہ (احکام ہیں جن پر) کہ حضرات صحابہ کرام نے حضرت خلفاء اربعہ کی خلافت میں اتفاق کیا۔

اور یہی اہل سنت و الجماعت کا وہ گروہ اور جماعت ہے جو ہر قسم کی بدعت سے پاک و صاف ہے چنانچہ علامہ سید سند علی بن محمد البحر جانی الحنفیؒ (المتوفی ۸۱۶ھ) لکھتے ہیں:

اهل السنة والجماعة ومذہبهم خال عن بدع هؤلاء (شرح مواقف مملکت بلع زکک شور) یعنی اہل سنت و الجماعت کا گروہ ہی ایسا ہے جن کا مذہب بدعت سے خالی ہے۔

الحاصل حضرات خلفاء راشدین کی سنت حجت ہے اور امت کے لئے اس کی پیروی لازم، اور ان کے عہد خلافت میں جن چیزوں پر حضرات صحابہ کرام کا اجماع ہوا وہ بقول شیخ صاحب جماعت کا مفہوم ہے، اور بغیر اس کے سلیم کے اہل سنت و الجماعت کا مفہوم ہرگز پورا نہیں ہوتا۔

ایک غلطی اور اس کا ازالہ | بعض حضرات کو شبہ ہے کہ حضرات خلفاء راشدین کی سنت صرف وہی ہو سکتی ہے جو بعینہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہو، اور جو چیز آپ سے (قولاً و فعلاً) مروی نہ ہو، اور حضرات خلفاء راشدین میں سے کسی نے اس پر عمل کیا ہو، یا اس کے متعلق حکم دیا ہو، تو وہ سنت نہ کہلانے گی۔ چنانچہ مشہور غیر مقلد عالم امیر میانی (محمد بن اسمعیل المتوفی ۱۱۲۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

و معلوم من قواعد الشریعة ان لیس لخلیفة راشد ان یشرع طریقة غیر ما کان علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم عشر نفسه الخلیفة الواشد سنی ما رآه من جمیع صلاتہ لیالی رمضان بدعة ولم یقل انہا سنۃ۔ (سبل السلام ج ۲ ص ۱۱۱)۔

قواعد شرعیہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ راشد کو کوئی ایسا طریقہ راجح کرنے کا حق نہیں ہے، جس پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عامل نہ تھے۔ پھر حضرت عمرؓ خود خلیفہ راشد ہیں اور رمضان کی راتوں میں لوگوں کے ساتھ بل کہ نماز پڑھنے کو سنت نہیں، بلکہ بدعت کہتے ہیں۔

لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ اولاً اس لئے کہ حضرات خلفاء راشدین کی سنت ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عمل کے موافق ہو اور اس سے ذرا بھی مخالف نہ ہو۔ کیونکہ جو حکم انہوں نے اپنے قیاس و اجتہاد سے جاری کیا ہے، وہ بھی سنت ہے۔ حالانکہ یہ ایک بین حقیقت ہے کہ انکا اپنا ذاتی قیاس و استنباط آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے گو اصل مقیس علیہ منقول ہو۔ مثلاً دیکھئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ نے شراہی کو چالیس پالیس گوڑے سزا دی، اس سے زیادہ ان سے ثابت نہیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے اسی گوڑے سزا دی ہے، یہ بھی سنت ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ (المتوفی ۴۰ھ) فرماتے ہیں کہ:

جلد التبی صلی اللہ علیہ وسلم اربعین و
 ابوبکرؓ اربعین و عمرؓ ثمانین و کل سنة۔
 آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے شراہی کو
 چالیس کوڑے سزا دی اور حضرت عمرؓ نے اسی کوڑے سزا
 دی اور دونوں باتیں سنت ہیں۔ (مسلم ج ۲ ص ۱۸۸)

امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمانؓ کا بھی ذکر کیا ہے۔

واتھا عثمانؓ ثمانین و کل سنة۔
 اور حضرت عثمانؓ نے بھی اسی کوڑے پورے کئے اور یہ سب
 (معرفت علوم الحدیث ص ۱۸۱) سنت ہے۔

روایت صحیح مسلم کی ہے جس کے صحیح ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا اور کہنے والے حضرت
 علیؓ خلیفہ راشد ہیں جو سنت اور بدعت کے مفہوم کو بخوبی جانتے ہیں اور اس میں حضرت عمرؓ اور حضرت
 عثمانؓ کے اس فعل کو بھی وہ سنت ہی کہتے ہیں جو بظاہر جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عمل کے خلاف
 ہے۔ چنانچہ حضرت امام نوویؒ (المتوفی ۷۶۷ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

هذا دلیل ان علیاً کان معظما لا آثار
 عمرؓ و ان حکمہ و قولہ سنة و
 امرہ حق و كذلك ابوبکرؓ خلاف ما
 یكذبه الشيعة علیہ۔
 یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ
 کے آثار کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے حکم اور قول
 کو سنت اور ان کے امر کو حق کہتے تھے۔ اسی طرح حضرت
 ابوبکرؓ کے متعلق بھی وہ یہی رائے رکھتے تھے، نہ جیسا شیعہ

(شرح مسلم ج ۲ ص ۱۸۸) شیعہ ان کی تکذیب کرتے ہیں۔

اگر خلیفہ راشد کے قول اور حکم کے سنت ہونے کے لئے یہ ضروری ہوتا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
 سے منقول ہو تو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا یہ حکم یقیناً بدعت ہوتا نہ کہ سنت۔

ثانیاً اگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نصاً ثابت ہونے کی بنا پر ہی حضرات خلفاء راشدینؓ
 کا قول و فعل سنت ہو سکتا ہے تو اس میں حضرات خلفاء راشدینؓ ہی کی کیا تخصیص ہے۔ اس معنی
 میں تو ہر ایک ادنیٰ مسلمان کی پیروی کرنا بھی ضروری ہے جب کہ وہ بتبع سنت ہو۔ اس لحاظ سے
 عام مسلمانوں سے اور خصوصاً دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے علیحدہ کر کے حضرات خلفاء راشدینؓ کی پیروی

کرنے اور حضرات شیخین کی اقتدار کرنے کی احادیث کا کوئی نمایاں پہلو واضح نہیں ہوتا۔ خصوصاً جبکہ آپ نے اپنی سنت کو اور خلفاء راشدین کی سنت کو دادِ عطف کے ساتھ بیان کیا ہے جس میں بظاہر مغایرت ہوتی ہے۔ رہا یہ شبہ کہ حضرات خلفاء راشدین کو شریعت بنانے کا حق کیسے حاصل ہوا؟ تو یہ ایک ایسا مغالطہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ شارع حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مبلغ ہیں نہ کہ شارع، اور اپنے مقام پر ذکر ہوگا، کہ قیاس و اجتہاد کو شریعت نے صحیح تسلیم کیا ہے۔ ایسے امور میں حضرات خلفاء راشدین کا حکم اور قول و فعل ہمارے لئے نہ صرف حجت ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق سنت ہے اور حضرات خلفاء راشدین کی بات بھی محض اس لئے حجت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں ان کی سنت کو کچلیوں اور ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس صورت میں حقیقت اطاعت جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہے جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت دراصل خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اطَاعَ اللّٰهَ۔ چنانچہ نواب صدیق حسن صاحب قنوجی (المتوفی ۱۲۰۷ھ) لکھتے ہیں :

ان ما سنّ الخلفاء الراشدون من بعد فالأخذ به ليس إلا لاهو صلي الله عليه وسلم بالأخذ به۔
 آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد جو چیزیں حضرات خلفاء راشدین نے مسنون ٹھہرائی ہے، اس کو محض اس لئے اخذ کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے اخذ کرنے کا حکم دیا ہے۔
 (الدین الخالص ج ۲ ص ۲۳۵)

آقا حضرت عمرؓ نے جو رمضان مبارک میں ایک قاری پر مجتمع ہو کر نماز پڑھنے والوں کے عمل کو نعمت البدعہ سے تعبیر کیا ہے تو اس سے مراد بدعت لغوی ہے جو مذموم نہیں ہے۔ اس سے بدعت شرعی مراد نہیں جو مذموم اور تبیح ہے (اس کی پوری بحث بسط کے ساتھ اپنے مقام پر بیان ہوگی، انشاء اللہ العزیز) ورنہ اگر حضرات صحابہ کرامؓ اسی مذموم بدعت کے مرتکب ہوئے اور حضرت عمرؓ نے خلیفہ وقت ہوتے ہوئے بھی ان کو اس قبیح حرکت سے منع نہ کیا اور نہ ہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہ کیا تو خلیفہ راشد وہ کیسے رہے؟ اور وہ خود مہدین

(ہدایت یافتہ) کی فہرست میں کس طرح شامل رہے؟ اور جب خود انہوں نے بدعتِ قبیلہ کی اجازت دے دی یا اس پر سکوت اختیار کر لیا تو سنت کی پاسبانی کس نے کی؟

چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمان

ثالثاً خود امیر میانی، علامہ برماوی کی ایک تحقیق کی (خلفاء اربعہ کا اتفاق تو حجت ہے مگر ان کی انفرادی بات اور قول اس پوزیشن میں نہیں ہے) تردید کرتے ہیں :

قال البرماوی :- اذا اتفق الخلفاء الاربعة
على قول كان حجة لا اذا انفرد واحد
منهم والتحقيق ان الاقتداء ليس هو
التقليد بل هو غيره - (بطل السلام ج ۲ ص ۲۸)

کہ علامہ برماوی کہتے ہیں کہ جب خلفاء اربعہ کسی قول پر اتفاق
کر لیں تو وہ حجت ہو گا نہ کہ ان کا انفرادی قول۔ حالانکہ تحقیق
یہ ہے کہ اقتدارِ تقلید نہیں ہے، بلکہ اقتدار اور ہے، اور
تقلید اور ہے۔

اس عبارت میں علامہ امیر میانی نے علامہ برماوی کی یوں تردید کی ہے کہ حضراتِ خلفاء اربعہ میں سے
ہر ایک کا قول قابلِ اقتدار ہے، یہ الگ بات ہے کہ اقتدار اور چیز ہے اور تقلید اور۔ کچھ بھی ہو ان کا منفرد قول
بھی حجت ہے۔ ہمارے نزدیک اقتدار اتباع اور تقلید ایک ہی شے ہے غیر مقلدین کے ہاں اقتدار و
اتباع اور چیز ہے اور تقلید اور ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں :

”و تقلید عبارت است از قبول رائے
کسیکہ قائم نمیشود بدار حجت بلا حجت و ازین
جا معلوم شد کہ قبول قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم
و عمل بدار تقلید نیست زیرا کہ قول و فعل او
خود حجت است۔“

تقلید کا معنی یہ ہے کہ جس کی رائے حجت نہ ہو اس کی رائے
کو (محض حسن ظنی کی وجہ سے) بلا حجت تسلیم کیا جائے۔ اس سے
معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کو تسلیم
کرنا اور اس پر عمل کرنا تقلید نہیں ہے، اس لئے کہ آپ کا
قول و فعل خود حجت ہے۔

اس لحاظ سے حضراتِ خلفاء راشدین میں سے ہر ایک کی بات کو تسلیم کرنا تو تقلید نہ ہو مگر اقتدار اور
اتباع ضرور ہے۔ اس لئے کہ ان کا قول و فعل تسلیم کرنا حسب تصریح جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
ہمارے لئے لازم ہے، اور خصوصیت سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی اقتدار کے متعلق مستقل حدیث

آئی ہے :-

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا ادري ما بقائى فيكم فاقتدوا من بعدى ابى بكر وعمر
آنحضرت صلى الله تعالى عليه وسلم نے فرمایا، مجھے معلوم نہیں کہ میں کب تک تم میں رہوں گا۔ سو میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کی اقتدار کرنا۔

(ترمذی ج ۲ ص ۲، ابن ماجہ ص ۲، مسند احمد ج ۵ ص ۳۸۵، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵، مستدرک ج ۳ ص ۵)

قال الحاكم والذهبي صحيح - امام حاکم اور علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ لکھتے ہیں :

قول الشيخين حجة اذا اتفقا لا يجوز العدول عنه وان اتفقا الخلفاء الامر بة ايضاً حجة -
حضرات شیخین کا قول حجت ہے۔ جب دونوں متفق ہو جائیں تو اس سے عدول جائز نہیں۔ اسی طرح حضرات خلفاء اربعہ کا اتفاق بھی حجت ہے (منہاج السنہ ج ۳ ص ۱۱۱)

حضرات صحابہ کرامؓ بھی معیارِ حق ہیں اور ان کا اجماع حجت ہے، حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد حضرات صحابہ کرام سے بڑھ کر عابد و زاہد، متقی و پرہیزگار اور کوئی نہیں گذرا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی دائمی خوشنودی اور رضا کا پروانہ اور سند ان کو ان پاکیزہ الفاظ سے عنایت فرمائی ہے :

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَئِكَ الْمُقَدَّمُونَ وَالَّذِينَ تَبِعُوا هُمُ الْآخِرُونَ
اور جو لوگ سب سے پہلے ہجرت کرنے والے، اور مدد کرنے والے ہیں، اور جو ان کی پیروی کرنے والے ہیں، نیکی کے ساتھ، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو چکا ہے۔

(پ ۱۱ - التوبہ - رکوع ۲۶) اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ ازلی میں تمام سابقین اولین کو خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار، اور ان کے پیچھے پیروکاروں کو اپنی ابدی رضا اور خوشنودی کی بشارت دی ہے۔ اسی ارشادِ الہی میں مہاجرین اور انصار کے سابقین اور لاحقین دونوں گروہوں کو (بلکہ ایک تفسیر کے لحاظ سے تابعین کرام کو بھی وَالَّذِينَ تَبِعُوا هُمُ الْآخِرُونَ) رضائے الہی کی سند مل چکی ہے کہ خدا ان سے راضی ہے، وہ خدا تعالیٰ سے راضی ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو بھی ہمارے معیارِ حق قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ (المتوفی ۳۸ھ) روایت

کرتے ہیں (اس روایت کے الفاظ میں اگرچہ جزوی اختلاف ہے مگر مفہوم سب کا ایک ہی ہے) کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثلاثین و سبعین
 ملۃ و تفرقت امتی علی ثلاث و سبعین ملۃ
 کلہم فی النار الا ملۃ واحدا قالوا من ہی
 یا رسول اللہ قال ما انا علیہ و اصحابی (ترمذی ج
 ۸، مستدرک ج ۱۲، اور مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۲)

کہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ چکے تھے اور میری امت
 بہتر فرقوں میں منقسم ہوگی، سب کے سب فرقے دوزخ
 میں جائیں گے مگر صرف ایک فرقہ۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا
 کہ وہ کونسا فرقہ ہوگا۔ فرمایا وہ فرقہ ہے جس نے وہ کام کئے
 جو میں نے اور میرے صحابہ نے کئے ہیں۔

اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں: وہی الجماعۃ (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۲۵، مستدرک

ج ۱۲۸، ابن ماجہ ص ۲۹۶، اور مشکوٰۃ شریف ج ۱ ص ۱۲) یعنی نجات حاصل کرنے والا صرف وہی فرقہ ہے جو

اس جماعت (صحابہ کرامؓ) کا ساتھ دینے والا ہو۔ اور اسلام کی اس جماعت سے کٹ کر الگ نہ ہونے والا

ہو۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ جیسے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات خلفائے راشدینؓ

کی سنت ہمارے لئے مشعل ہدایت ہے، اسی طرح ما انا علیہ و اصحابی کے ارشاد کے تحت حضرات

صحابہ کرامؓ کے اقوال و اعمال بھی ہمارے لئے حق کا معیار اور پیمانہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ما انا علیہ و اصحابی کا ارشاد فرما کر اپنی ذات بابرکات اور اپنے صحابہ

کرامؓ کی ذواتِ قدسیہ کو حقر اور باطل کے پرکھنے کا مقیاس بتایا ہے کہ محض کالے کالے نقوش ہی معیار نہیں،

بلکہ وہ ذوات بھی معیارِ حق ہیں جن میں یہ حروف و نقوش، اعمال و احوال بن کر سچ گئے ہیں اور اسی طرح

گسل مل گئے ہیں کہ اب ان کی ذوات کو دین سے الگ کر کے اور دین کو ان کی ذوات سے علیحدہ کر کے نہیں

دیکھا جاسکتا۔ ما انا علیہ و اصحابی کی حدیث سے صرف حضرات صحابہ کرامؓ کی منقبت اور

فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی اور نیز ان کی محض مقتداہیت اور مقبولیت ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ امت

کے حق و باطل کے لئے ان کی معیاری شان بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ محض حق پر ہی نہیں بلکہ حق کے پرکھنے

کی کسوٹی اور معیار بھی بن چکے ہیں، جن سے دوسروں کا حق و باطل بھی گسل جاتا ہے۔ اور ان کا معیارِ حق و

باطل ہونا صرف قیاسی ہی نہیں بلکہ ما انا علیہ واصحابی کے صریح ارشاد سے بطور نص ثابت ہے، نہ جیسا کہ باطل اور گمراہ فرقوں نے ان کو ہدفِ ملامت بنا کر درحقیقت کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر کلوخ اندازی کی اور اسلام کی بنیادی حقیقت کو کھوکھلا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ حضرات صحابہ کرامؓ کی ثقاہت و عدالت، ویانت و امانت، صداقت اور للہیت ایسے کم امور ہیں جن پر مدارِ اسلام ہے، اور ان پر جرح و تعدیل کرنے والا دین کی عمارت کو گرتا ہے۔ حضرت ملا علی ان تقاری لکھتے ہیں :

والصحابة کلهم عدول مطلقاً
حضرات صحابہ کرامؓ سب کے سب مطلقاً عادل اور ثقہ ہیں
لظواہر الکتاب و سنتہ و اجماع
کیونکہ قرآن کریم اور سنت اور معتمد علیہ لوگوں کے اجماع کے
من یعتد بہ۔ (مرقات ج ۵ ص ۵۱)

امام ابن اثیر عز الدین علی بن محمد الجزری (المتوفی ۷۳۳ھ) لکھتے ہیں :

والصحابة یشارکون سائر الرواة فی جمیع
حضرات صحابہ کرامؓ تمام باتوں میں تمام راویوں میں شریک
ذک الا فی الجرح والتعدیل فانہم کلہم
ہیں مگر جرح و تعدیل میں نہیں کیونکہ حضرات صحابہ کرامؓ
عدول لا یتطرق الیہم الجرح لان اللہ
سب کے سب عادل اور ثقہ ہیں، ان پر جرح نہیں کی جا
عز وجل ورسولہ زکاهم وعدلاہم
سکتی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ان کی
و ذلک مشہور لا نحتاج لذکرہ۔
پاکبازی اور تعدیل بیان فرمائی ہے اور یہ ایک ایسی مشہور بات
ہے جس کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

(اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ ج ۱ ص ۱۱)

غرضیکہ حضرات صحابہ کرامؓ امت کے لئے حق و باطل، خیر و شر، سنت و بدعت اور ثواب و عقاب
وغیرہ امور کے پرکھنے کی کسوٹی اور معیارِ حق ہیں۔ جو کام انہوں نے کیا وہ حق اور سنت اور باعثِ نجات
ہے، اور ان کا ہر قول و فعل ہمارے لئے ذریعہ فلاح اور وہی ہمارے لئے ترقی اور سعادت کی راہ ہے، اور
اس کی خلاف ورزی تباہی اور بربادی پر منتج ہوگی اور بس۔

مشہور غیر منقذ عالم مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب روپڑی تحریر فرماتے ہیں :

"اقوال صحابہ کے ساتھ استدلال کرنا ٹھیکہ اسلام میں داخل ہے" (ضمیمہ رسالہ اہل حدیث ص ۱۱)

نیز وہ لکھتے ہیں :

”اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ صحابہؓ کے اقوال میں اقل تو رفع یعنی رسولؐ کی حدیث ہونے کا احتمال قوی ہے، اور اگر کہیں فہم کا دخل ہو تو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روش کی طرف زیادہ نزدیک ہیں، کیونکہ صحابہؓ آپ کی طرزِ بات اور طرزِ استدلال کو دیکھتے تھے۔ اور آپ کے کنایہ و اشارے سے خوب سمجھتے تھے، اور حنبلی بانیں مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں اُن سے خوب واقف تھے۔ اور بعد کے لوگ ان باتوں سے محروم ہیں۔ اس لئے پھلوں کے لبتہا پر صحابہؓ کے اقوال کو مقدم کرنا لازم ہے، اور صحابہؓ چونکہ ان باتوں میں برابر ہیں اس لئے اُن کے اقوال آپس میں ایک دوسرے کو ماننے لازم نہیں۔ بس یہ ہیں اقوال صحابہؓ کے حجت ہونے کے معنی۔“ (فہم انتہی بلفظ۔ ایضاً ص ۸)۔

اگر حضرات صحابہ کرامؓ کا کسی بات پر اجماع و اتفاق ہو جائے تو اس کے حجت اور قطعی ہونے میں شاید ہی کوئی بد بخت کلام کرتا ہو۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (المتوفی ۷۲۸ھ) لکھتے ہیں کہ :

”صحابہ کرامؓ کا اجماع واجب الاتباع ہے، بلکہ صحابہ کرامؓ کا اجماع قوی تر حجت اور دوسری (غیر منصوص) حجتوں پر مقدم ہے۔“ (اقامۃ الدلیل ج ۳ ص ۱۱)۔

اور حافظ الدنیا امام ابن حجر عسقلانیؒ (المتوفی ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں :

ان اهل السنّة والجماعة متفقون علی ان اجماع الصحابة حجّة (فتح الباری ج ۳ ص ۲۶) صحابہ کرامؓ کا اجماع حجت ہے۔

حضرات صحابہ کرامؓ کے اجماع کے حجت ہونے پر متعدد حوالجات پیش نظر ہیں، مگر ہمارا مقصد لائل کا

۱۔ حضرت صحابہ کرامؓ کے تنقید اور جرح سے بالاتر ہونے کے لئے استیعاب ج ۱ ص ۱، اصابع ج ۱ ص ۱، تقریر الاصول ج ۲ ص ۲، فوائج الرحموت ج ۱ ص ۱۵۱، اور مسامرہ ج ۱ ص ۱۵۱ وغیرہ ملاحظہ کریں۔ اور اجماع صحابہ اور اقوال صحابہ کے حجت ہونے کے لئے : منہاج السنّة ج ۱ ص ۱۵۱، اعلام الموقعین ج ۱ ص ۶، بدائع الفوائد ج ۳ ص ۶، بلغات بسکی ج ۱ ص ۱۲، عمدۃ القاری ج ۳ ص ۱۲، کتاب العلم لابن عبد البر ج ۲ ص ۸ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

استیعاب نہیں بلکہ صرف بطور نمونہ یہ چند عبارتیں مدیہ قارئین کرام کر دی گئی ہیں، جن سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کے بعد حضرات صحابہ کرام کی ذوات کو بھی دین کے حق و باطل پہننے کا معیار اور مقیاس بنایا گیا ہے۔

اجماع اُمت | حضرات خلفائے راشدین کی سنت اور حضرات صحابہ کرام کے اجماع کے بعد اُمتِ مرحومہ کے اجماع و اتفاق کا درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اُمتِ مرحومہ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے یوں ارشاد فرماتا ہے کہ :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ - (پک - آل عمران - ۳۴)

کہ تم سب اُمتوں سے بہتر اُمت ہو جو بھی گئی انسانوں کی
بھلائی کے لئے، تم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو
بُرائے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ تعالیٰ پر۔

اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو نہ تو طاقتور اُمت کہا اور نہ دولت مند، بلکہ بہتر اور بھلی اُمت کہا۔ اس لئے کہ اس اُمت کا کام دنیا میں نیکی کی تعلیم دینا اور بدی سے روکنا ہے۔ پھر یہ صرف اپنی ہی قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام اقوامِ عالم کی بھلائی اور فلاح چاہنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس اُمت سے متعلق ارشاد فرمایا :

انتم شهداء الله في الارض (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱۲۵) کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین میں گواہ ہو۔
جس چیز کو یہ اُمت خیر کہے گی وہ عند اللہ تعالیٰ بھی خیر ہی ہوگی، اور جس چیز کو شر کہے گی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی شر ہی ہوگی۔ یہ اُمت سزاگاری گواہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قیامت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) احکام لعلامہ آمدی ج ۲ ص ۱۱۱، ازالۃ الخفافہ ج ۱ ص ۱۱۱، اور غیر مقلدین حضرات کی مشہور کتاب
یسر من رأی ج ۲ ص ۱۱۱ کا مطالعہ کیجئے۔

نوٹ: اسی جماعت کا ساتھ چھوڑنے والا تارکِ سنت کہلاتا ہے۔ چنانچہ امام حاکم، علامہ ذہبی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور
شاہ ولی اللہ صاحب کہتے ہیں واما تروک السنۃ فالخروج من الجماعۃ (متدرک ج ۱ ص ۱۱۱) تلخیص علیہ ج ۱ ص ۱۱۱،
وہجاء السنۃ ج ۲ ص ۱۱۱ وازالۃ الخفافہ ج ۱ ص ۱۱۱) کہ ترکِ سنت اس جماعت سے نکلنے کا نام ہے۔

ون اسی اُمت کی شہادت پر تمام اُمتوں کی قسمت کا فیصلہ ہوگا، اور اسی اُمت کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ یہ کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی۔

اس حدیث کو پیش کرنے کے بعد امام حاکم (المتوفی ۳۵۵ھ) لکھتے ہیں:

يستدل بها على الحجّة بالاجماع (مستدرک ج ۱ ص ۱۱۱) اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ اجماع حجت ہے۔

اور علامہ شمس الدین ابو عبد اللہ الزہبی (المتوفی ۳۴۸ھ) لکھتے ہیں:

تستدل على ان الاجماع حجة - یعنی (ان احادیث سے) اجماع کے حجت ہونے پر

(تلفیص المستدرک ج ۱ ص ۱۱۱) استدلال کیا گیا ہے۔

اور حضرت ملا علی نقاریؒ ان الله لا يجمع امتی علی ضلالت (الحدیث) کی شرح میں

لکھتے ہیں:

في الحدیث دلیل علی حقیقۃ الاجماع - کہ اس حدیث میں اس امر کی دلیل موجود ہے کہ اُمت کا

(مرقات علی مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳) اجماع حق اور صحیح ہے۔

اُمت کے اجماع کے حق اور صحیح ہونے پر بے شمار دلائل موجود ہیں، اور ارباب اصول نے اس پر

سیر حاصل بحث کی ہے۔ چنانچہ مشہور اصولی شیخ الاسلام علی بن محمد البزومی کھنفی (المتوفی ۳۸۲ھ)

تحریر فرماتے ہیں کہ:

فصار الاجماع کایة من الکتاب او حدیث اجماع کی مثال ایسی ہی ہے جیسے قرآن کریم کی آیت یا حدیث

متواتر فی وجوب الصل والعم فیکفر جاحدا متواتر۔ جیسے یہ موجب عمل و علم ہیں، اسی طرح اجماع بھی

فی الاصل۔ (اصول بزومی ج ۳ ص ۳۶) نتیجہ یہ ہوگا کہ نفس اجماع کا منکر کافر ہوگا۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ:

والاجماع اعظم الحجج۔ (الحسبہ ص ۶)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ:

واما اجماع الامة فهو فی نفسه حق لا یجتمع بہر حال اُمت کا اجماع فی نفسه حق ہے اُمت کبھی گمراہی

الامة على ضلالة وكذلك القياس صحيح -
 (الحسبة ۵۹ ومثله في معارج الاصول صلا) -
 پر مجتمع نہیں ہوگی اور اسی طرح قیاس صحیح بھی حق اور
 محبت ہے۔

خیر القرون کا تعامل بھی محبت ہے | حضرات صحابہ کرام کے بعد تابعین اور اتباع تابعین کی اکثریت
 کسی کام کو بلا نیکر کرنا یا چھوڑنا بھی ایک محبت شرعی ہے، اور ہمیں ان کی بھی پیروی کرنا ضروری ہے۔ اس
 امر کے ثبوت پر متعدد حدیثیں موجود ہیں۔ ہم اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند حدیثیں عرض کرتے ہیں۔
 حضرت عبداللہ بن مسعود (المتوفی ۳۲ھ) فرماتے ہیں کہ :

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، قال
 خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم ثم
 الذین یلونہم ثم یجئ اقوام تسبق
 شہادۃ احدہم یمینہ ویمینہ شہادۃ
 (بخاری ج ۱ ص ۳۶، والفظاہ وسلم ج ۲ ص ۳۹ و مسند
 طیالسی ص ۳۹، وموار والظمان ص ۵۶۹)۔
 آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
 کہ بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانہ میں ہیں۔ پھر
 ان کے بعد والے اور پھر ان کے بعد والے پھر ایسی
 قومیں آئیں گی جن کی شہادت قسم سے، اور قسم
 شہادت اور گواہی سے سبقت کرے گی۔

حضرت عمر روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

او صیکم باھبانی ثم الذین یلونہم ثم
 الذین یلونہم ثم یفشو الکذب حتی
 یحلف الرجل ولا یتحلف ویشہد ولا
 یتشہد فمن اراد منکم مجبوحۃ الجنۃ
 فلیلزم الجماعة (الحديث) - (مسند ابوداؤد
 طیالسی ص ۳، مستدرک ج ۱ ص ۱۴۱ قال الحاکم والذہبی
 علی شرطہما۔ مثله فی مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۵۲ و فی المقات
 رواہ النسائی و اسنادہ صحیح وموار والظمان ص ۵۶۸)۔
 میں تمہیں اپنے صحابہ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں
 (کہ ان کے نقش قدم پر چلنا) پھر ان کے بارے میں
 جو ان سے ملتے ہیں، پھر ان کے بارے میں جو ان
 سے ملتے ہیں، پھر سبھوٹ عام ہو جائے گا یہاں تک
 کہ آدمی بلا قسم دیتے بھی قسم اٹھائیں گے اور بلا گواہی
 طلب کئے بھی گواہی دیں گے۔ سو جو شخص جنت
 کے وسط میں داخل ہونا چاہتا ہے تو وہ اس جماعت
 کا ساتھ نہ چھوڑے۔

حضرت عمران بن حصین (المتوفی ۵۲ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خير
التاس قونی ثم الذین یلونہم ثم الذین
یلونہم ثم قاتی اقوام یعطون الشہادۃ
قبل ان یسئلوہا (متدرک ج ۳ ص ۳۶۶ واللفظ لہ
قال الحاکم والذہبی علی شرطہما وترندی ج ۲ ص ۴۵)

کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب
لوگوں سے بہتر قرن میرا ہے، پھر ان کا جو اس سے ملے
ہیں، پھر وہ جو اس سے ملے ہیں۔ پھر ایسی قومیں آئیں گی
جو اس سے قبل کہ ان سے گواہی طلب کی جائے وہ گواہی
دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

ان کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں :

ویخونون ولا یؤمنون ویفشوا
فیہم السمون۔ (ترمذی ج ۲ ص ۴۵)

اور خیر القرون کے بعد آنے والے لوگ خیانت کریں گے، اور
امانت میں ان پر اعتبار نہیں کیا جائے گا اور ان میں مٹوایا
خوب ظاہر ہوگا۔ (یعنی فکرِ آخرت سے غافل اور حلال و
حرام سے بے نیاز ہو کر خوب کھائیں گے۔)

اور ان کی ایک روایت میں یوں آتا ہے :

وینذرون ولا یوفون۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۸۴)

ان روایات سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیر القرون کے بعد جو لوگ پیدا ہوں گے، ان میں
دین کی وہ قدر و عظمت نہ ہوگی جو خیر القرون میں تھی۔ جھوٹ ان میں بکثرت رائج ہو جائے گا۔ بات بات
پر بلا طلب کے قسم اٹھاتے پھریں گے اور بے تحاشا گواہی دیں گے۔ امانت کی پروا نہ کریں گے اور خیانت
ان کا پیشہ ہوگا۔ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت سے ایسے بے نیاز ہوں گے کہ کھا کھا کر خوب فریب ہوں گے اور
پیٹ کی فکر کی وجہ سے حلال و حرام کی تمیز ہی جاتی رہے گی۔ تدریس اور منتیں مان تولیں گے مگر ان کو پورا
کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ الغرض ظاہری اور باطنی، قولی اور فعلی ہر قسم کے معاملات میں انہی دینی زندگی
میں انحطاط ہی انحطاط ہوگا۔ ظاہر امر ہے کہ امانت و صداقت و حق پسندی کا جو جذبہ خیر القرون کے
لوگوں میں تھا، وہ بعد والوں میں نہ تھا۔ کیونکہ خیر القرون کے بعد جھوٹ، خیانت اور جھوٹی گواہی کے

علاوہ ایسی ایسی بدعات اور خرافات نکالی گئیں کہ دین اسلام منظوم ہو گیا اور بدعت نے سنت کی جگہ لے لی۔ بلاشک خیر القرون میں بھی فتنوں نے سر اٹھایا تھا مگر اولاً وہ بعد کے پیدا ہونے والے دینی اور دنیوی فتنوں سے بہت کم تھے۔ وثانیاً خیر القرون کی اکثریت نے ان کو قبول کرنے سے سراسر انکار کر دیا، بلکہ ان فتنوں کو مٹانے کے لئے انہوں نے اپنی عزیز جانیں بھی قربان کر دیں اور بعد کو آنے والوں میں یہ جذبہ نسبتاً بہت ہی کم رہا ہے۔

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ :

ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کون لوگ بہتر ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ وہ قرن بہتر ہے جن میں میں ہوں پھر دوسرا قرن بہتر ہے اور پھر تیسرا۔

سأل رجل النبي صلى الله عليه وسلم ائى الناس خير قال القرن الذى انا فيه ثم الثانى ثم الثالث (مسلم ج ۲ ص ۱۳۱)۔

حضرت امام محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی (المتوفی ۶۷۶ھ) خیر القرون کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے قرن کے متعدد معانی بیان کرتے ہیں، اور پھر آخر میں لکھتے ہیں :

والصحيح ان قرنه صلى الله عليه وسلم صحیح بات یہ ہے کہ آپ کے قرن سے حضرات صحابہ کرام کا قرن اور دوسرے قرن سے تابعین کا قرن اور تیسرے قرن سے تبع تابعین کا قرن مراد ہے۔

والصحيح ان قرنه صلى الله عليه وسلم الصحابة والثانى التابعون والثالث تابعوهم۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۱۳۱)۔

اس سابق بحث سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا کہ خیر القرون تین قرن ہیں اور انہی کو قرون ثلاثہ یا قرون مشہود کہا جاتا ہے اور یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ پہلے قرن سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے سے تابعین اور تیسرے سے تبع تابعین مراد ہیں۔

مشہور مؤرخ اسلام علامہ عبدالرحمن بن خلدون المغربی (المتوفی ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں :

هذا هو الذى ينبغى ان تحمل عليه افعال اسی خیریت پر مناسب ہے کہ سلف کے اعمال کو حمل کیا جائے جو حضرات صحابہ کرام اور تابعین تھے وہ امت کی بہترین الاممہ و اذا جعلناهم عرضة القرح فمن جماعت تھی اور جب ہم نے ان کو ہدف ملامت بنا دیا تو پھر

الذی یختص بالعدالة والتبى صلی اللہ علیہ وسلم یقول خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم مرتین اولاً ثانیاً ثم یفشیوا الکذب فجعل الخیرة وهی العدالة مختصة بالقرن الاول والذی یدیه فایاک ان تعود نفسک اولسانک التعرض لاحد منهم۔

عدالت کے ساتھ کون مختص ہوگا؟ حالانکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، لوگوں کا بہترین قرن میرا قرن ہے۔ پھر وہ ہے جو اس سے ملتا ہے، دو مرتبہ فرمایا یا تین مرتبہ، پھر جوٹ راج ہو جائے گا۔ آپ نے ان کی بہتری کو عدالت میں منحصر کر دیا ہے، اور وہ قرن اول اور ثانی، (اور ثالث) کے ساتھ خاص ہے۔ خیر دار ان میں سے کسی کے

متعلق دل میں بُرا خیال اور زبان پر بُرا لفظ ہرگز نہ لانا۔
۱ مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱۸

اور یہی علامہ عدالت کی تفسیر کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں :

العدالة وهی وظیفه دینیة۔ عدالت دین کا ایک وظیفہ ہے اور دین کی ایک عمدہ (مقدمہ ص ۲۲۴) خصلت ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ خیر القرون کے تین قرن ہیں اور ان قرون سے مراد حضرات صحابہ کرامؓ تابعین اور تبع تابعین کا قرن ہے تو طبقات رجال کی کتابوں میں اس کی تصریح ملتی ہے کہ تبع تابعین کا دور ۲۲ھ تک رہا ہے اور یہی وہ حضرات ہیں جن کے نقش قدم پر چل کر ہمیں کامیابی نصیب ہو سکتی ہے اور وہی اس اُمت مرحومہ کا بہترین گروہ ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فریق مخالف کے وہ اعتراضات جو خیر القرون کے مفہوم پر ان کی طرف سے وارد ہوتے ہیں، یہاں ہی عرض کر دیں اور ایک طائرانہ نگاہ ان پر بھی ڈال لیں کہ وہ کیا کہتے ہیں؟

پہلا اعتراض :

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عمران بن حصینؓ کی روایتوں میں جو مسلم وغیرہ میں ہیں، شک کے الفاظ آتے ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے قرن کے بعد دو قرن ذکر کئے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قرن ذکر کئے۔ اب کیسے معلوم ہو کہ تین قرن خیر القرون ہوں گے یا چار (محصلاً) ان کے اصل

بعض الفاظ بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں :

”پس قرونِ ثلاثہ کا قاعدہ بروایات صحیحہ مشکوک ٹھہرا۔“ (بلفظہ انوار ساطعہ ص ۱۱)

جواب :

ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت عمران بن حصینؓ اور حضرت عائشہؓ کی جو صحیح روایات پیش کی ہیں ان میں علی التعمین تین قرن ہی ذکر کئے گئے ہیں۔ چوتھے قرن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت بخاری شریف میں متعدد جگہ آتی ہے (مثلاً ج ۱ ص ۳۶۲ و ج ۱ ص ۵۱۵ و ج ۲ ص ۹۵۱ و ج ۲ ص ۹۸۵)۔ نزان میں شک کے الفاظ آتے ہیں اور نہ چوتھے قرن کا ذکر ہے۔ امام مسلمؒ نے جو روایت حضرت ابن مسعودؓ کی اصول میں پیش کی ہے اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ البتہ امام مسلمؒ نے جو روایات متابعات میں اور درجہ دوم میں پیش کی ہیں، جن میں ایک روایت حضرت ابن مسعودؓ اور دوسری حضرت ابوہریرہؓ کی اور تیسری حضرت عمران بن حصینؓ کی ہے ان میں شک کے الفاظ آتے ہیں۔ لیکن امام مسلمؒ کا قاعدہ ہی الگ ہے۔ وہ اپنے مقدمہ مسلمؒ ص ۳۴ میں لکھتے ہیں کہ ”ہم درجہ اول میں صرف وہ روایات پیش کریں گے جن کے راوی حفظ اور اتقان میں مسلمؒ ہوں گے اور وہ چنداں وہم اور خطا کا شکار بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ اور درجہ دوم میں ایسے راویوں کی روایتیں ہوں گی جو حفظ و اتقان میں بھی پہلے راویوں کے ہم پلہ نہ ہوں گے نیز ان سے خطا اور وہم بھی صادر ہوا ہوگا۔“ امام مسلمؒ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے تین قرن والی روایت بالکل صحیح ہے اور جن روایتوں میں چار قرون کا ذکر ہے وہ راویوں کے وہم اور ان کی غلطی پر محمول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام مسلمؒ ان شک والی روایتوں کے بعد حضرت عائشہؓ کی تین قرن والی روایت پیش کر کے اس پر مہر لگاتے ہیں، کہ صحیح تین ہی قرن ہیں۔ لہذا قرونِ ثلاثہ کا تعین صحیح روایات سے ثابت ہوا، اور شک والی روایتیں راویوں کے وہم اور خطا پر محمول ہوتیں۔ علاوہ بریں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ امام مسلمؒ نے جو روایتیں متابعات میں اور درجہ دوم میں نقل کی ہیں، ان میں بعض میں یہ الفاظ آتے ہیں : والله اعلم اذکر الثالث ام لا۔“ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ نے (اپنے قرن کے بعد) تیسرے قرن کا ذکر کیا ہے یا نہیں کیا؟

اور اہلس میں یوں آتا ہے : فلا ادری اقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد قرنہ مرتین
 او ثلاثا۔ ”مجھے معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے قرن کے بعد دو قرون کا ذکر کیا، یا
 تین کا۔ بخاری میں حضرت عمرانؓ سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ
 اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی لاعلمی سے جاننے والوں کی روایات پر (جن میں حضرت ابن مسعودؓ
 مدت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ ہیں) مطلقاً کوئی اثر نہیں پڑتا جو اپنے حفظ و اتقان صحیح اور پختہ علم
 کے مطابق وثوق کے ساتھ صرف تین قرون کا ذکر فرماتے ہیں اور ان کی روایات میں کوئی لفظ شک
 اور شبہ کا بھی نہیں ہے۔ بڑے تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ جو راوی اپنی لاعلمی کا ذکر کرتے ہیں، ان
 کی روایات کو لے کر تین قرون کے قاعدہ کو مشکوک ٹھہرایا جا رہا ہے، اور وثوق و اعتماد سے صرف تین
 دن قرن بیان کرنے والوں کی صحیح روایات کی طرف دھیان ہی نہیں کیا جاتا۔
 ایں کارانہ تو آید و مرداں چنیں کنند

دوسرا اعتراض :

مولوی عبد التیمع صاحب لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں لفظ قرن واقع ہوا ہے، اور یہ بہت
 معانی میں مشترک ہے۔ قرن، سید القوم کو بھی کہتے ہیں، کذا فی القاموس۔ اور بعضوں نے کہا، قرن
 زمانہ ہے اور بعضوں نے کہا مقید، پھر ان میں بھی اختلاف ہے۔ دس برس یا چالیس یا ستر یا سو،
 یا ایک سو بیس الخ۔ (انوار ساطعہ ص ۱۱۱ بلقظہ)۔

جواب :

مولوی صاحب کی بڑی نوازش ہے کہ انہوں نے قرن کے معنی قاموس سے سینک اور زلف کے نہیں
 نقل کر دیئے، ورنہ ان کا کوئی کیا بگاڑ لیتا؟ مگر یہ ان کی ایک اصولی اور کھلی غلطی ہے کہ وہ لفظ قرن کی تعیین میں
 کبھی قاموس کی طرف دوڑتے ہیں اور کبھی بعضوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ اگر وہ ذرا سی تکلیف گوارا کرتے،
 اور بناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کی طرف مراجعت کرتے تو خود بخود ان کا وہم دور ہو جاتا،
 اور نہ ان کو اقرار ہے کہ محدثوں میں یہ ٹھہرا ہوا ہے کہ بعض حدیثیں شرح ہوتی ہیں بعض حدیث کی (بلقظہ انوار

بساطہ ص ۲)۔ مسلم کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کی یہ روایت پہلے نقل کی جا چکی ہے کہ ایک سائل کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا: "سب سے بہتر قرن وہ ہے جس میں میں ہوں اور پھر دوسرا اور پھر تیسرا"۔ یہ جواب آپ نے اسی الناسِ خیر (کہ کون لوگ بہتر ہیں؟) کے سوال پر ارشاد فرمایا تھا۔ اس صحیح اور صریح روایت سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ آپ نے خیریت کو تین قرنوں میں منحصر کر دیا اور حرفِ ثَمِّ کے ساتھ درجہ بدرجہ خیریت کی تین قرنوں میں تنصیف اور تخصیص کر دی ہے۔ اور دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ آپ نے قرن کے معنی سید القوم نہیں کئے کہ ہمیں قاموس وغیرہ کی ورق گردانی کرنی پڑے، بلکہ آپ نے قرن کے معنی بہترین انسانوں کے ایک طبقہ سے کئے ہیں اور اس معنی میں پہلا قرن حضرات صحابہ کرام کا، دوسرا تابعین کا اور پھر تیسرا تبع تابعین کا قرن ہے۔

حضرت ابوسعید الخدریؓ (المتوفی ۳۷ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

یاتی علی الناس زمان فیغزو فتام من الناس
فیقال هل فیکم من صاحب رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم فیقولون نعم فیفتح لہم ثم
یاتی علی الناس زمان فیغزو فتام من الناس
فیقال هل فیکم من صاحب اصحاب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم فیقولون نعم فیفتح لہم ثم
یاتی علی الناس زمان فیغزو فتام من الناس
فیقال هل فیکم من صاحب اصحاب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیقولون نعم
فیفتح لہم۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۵۵ و مسلم ج ۲ ص ۳۸۸)۔

لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا، جس میں لوگوں کی ایک
جماعت جہاد کرے گی۔ کہا جائے گا کہ کیا تم میں کوئی صحابی
ہے؟ وہ کہیں گے ہاں۔ سو ان کی وجہ سے ان کو فتح نصیب
ہوگی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ایک گروہ جہاد
کرے گا۔ کہا جائے گا، کیا تم میں کوئی تابعی ہے؟ وہ
جواب دیں گے ہاں۔ سو ان کی برکت سے کامیابی
حاصل ہوگی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا، کہ ایک
طاقتہ جہاد کرے گا۔ کہا جائے گا، کیا تم میں کوئی تبع
تابعی ہے؟ وہ بولیں گے، ہاں! سو ان کی بدولت
فتح و کامرانی ہوگی۔

حضرت عائشہؓ کی سابق روایت سے روزِ روشن کی طرح یہ بات واضح اور آشکارا ہو جاتی ہے کہ

خیر القرون کا معنی اور مفہوم کوئی مجمل اور گول مول حقیقت نہیں ہے بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق خیر القرون کا مفہوم قرن اول، ثانی اور ثالث کے اندر بند اور منحصر ہے۔ اور قرن کا معنی اور مفہوم بھی مجمل نہیں بلکہ اس سے انسانوں کا بہترین طبقہ مراد ہے اور اس لحاظ سے حضرت ابوسعید الخدریؓ کی حدیث کے پیش نظر خیر القرون کا مفہوم حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؓ اور تبع تابعینؓ میں بند ہے، نہ تو یہیں قرن سے دس سال مراد لینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ چالیسؓ نہ ستر اور نہ سو وغیرہ۔ باقی جن لوگوں نے قرن کے یہ معانی کئے ہیں، تو صحیح اور صریح حدیث کے ہوتے ہوئے ان کی بات قابل التفات ہی نہیں ہے۔

تنبیہ : حضرت ابوسعید الخدریؓ کی ایک روایت میں جس کو امام مسلمؒ نے درجہ دوم میں بطور متابعت پیش کیا ہے، چار طبقوں کا ذکر آیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں :

وفی روایۃ مسلم ذکر طبقۃ رابعۃ وہی
روایۃ شاذۃ واکثر الروایات یقتصر
على الثلاثة۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۷۰)۔

مسلم کی ایک روایت میں چوتھے طبقہ کا ذکر بھی آیا ہے
مگر وہ روایت شاذ ہے، اور اکثر روایات میں صرف
تین ہی طبقوں کا ذکر آیا ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ صحیح روایات میں صرف تین ہی طبقوں کا ذکر ہے جو حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کے طبقات ہیں۔ چوتھے طبقے کا ذکر جس روایت میں آیا ہے وہ حضرات محدثین کرامؓ کے نزدیک معلول اور شاذ ہے۔ اور یہ اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ شاذ روایات کو لے کر اس کی وجہ سے صحیح روایات کو معلول نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اور شاذ روایت خود متروک اور ناقابل احتجاج ہوگی۔ (دیکھئے توجیہ النظر ص ۱۱ وغیرہ)۔

تیسرا اعتراض :

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں کہ: "کوئی یہ نہ سمجھے کہ قرون اولیٰ میں جو کچھ ہوگا سب خیر ہوگا اس لئے کہ تمام بدعتیں ذر و ذر خارج و خروج و رفض وغیرہ سب قرون ثلاثہ ہی میں پیدا ہوئیں اور اوقات خیر القرون میں ہونے کے سبب ان کو کوئی اہل سنت و جماعت، جماعت خیر نہیں کہتا (بلغتہ انوار ساطعہ ص ۲۹)۔"

اور مفتی احمد یار خان صاحب نے تو کمال ہی کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: یہ مطلب نہیں کہ ان تین زمانوں میں جو بھی کام ایجاد ہوا، اور کوئی بھی ایجاد کرے وہ سنت ہو جائے۔ یہاں سنت ہونے کا ذکر ہی کہاں ہے۔ ورنہ مذہب جبریہ اور قدریہ زمانہ تابعین میں ایجاد ہوا، اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قتل اور حجاج کے مظالم ان ہی زمانوں میں ہوئے۔ تو کیا معاذ اللہ ان کو بھی سنت کہا جائے گا؟ (بلفظ جبار الحق وزہق الباطل ص ۱۲)۔

جواب: یہ دونوں معترض صاحبان خود ایک اصولی غلطی کا شکار ہیں، اس لئے وہ دُور از کار باتیں بنا کر ایجادِ بدعات کا چور دروازہ تلاش کرتے ہیں۔ ان دونوں نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ خیر القرون کی احادیث میں قرن سے مراد زمانہ ہے اور خیر القرون سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین اور تبع تابعین کے تین زمانے مراد ہیں، جب ہی تو ان کو جبریہ اور قدریہ کے فرقوں کا اور خارجیوں اور رافضیوں کے گروہوں کا اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حجاج کے مظالم کا قصہ چھیڑنا پڑا کہ یہ سب کام ان تین زمانوں میں ہوئے ہیں، حالانکہ ان کو کوئی بھی سنت نہیں کہتا، اور خیر القرون کی حدیث سے استدلال کرنے والے یا تو ان بدعات اور مظالم کو بھی سنت کہیں اور یا اس حدیث سے استدلال ہی نہ کریں، تاکہ ہمارے لئے بدعات کی ایجاد میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے اور ہم جس چیز کو چاہیں سنت یا کم از کم بدعتِ حسنہ کا غلاف پہنا کر اس پر عمل کرتے رہیں۔ لیکن انہوں نے اس امر پر مطلقاً غور نہیں کیا کہ اگرچہ لغت میں قرن کے جہاں اور معنی بیان کئے گئے ہیں وہاں ایک معنی زمانہ بھی ہے، اس سے انکار نہیں ہے، مگر سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرن کا خود کیا معنی اور مفہوم بیان فرمایا ہے۔ سو آپ نے صحیح روایات میں یہ پڑھا کہ آپ نے قرن کا معنی زمانہ نہیں کیا، بلکہ قرن کا معنی آپ نے اہل زمانہ کیا ہے۔ زمانہ اور اہل زمانہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور اہل زمانہ کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ انسانوں کا وہ طبقہ جو ایک زمانہ میں اکٹھا رہے، اور وہ قرنِ اول میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، قرنِ ثانی میں

لہ علامہ فیومی، مصباح المنیر میں لکھتے ہیں القرون الجیل من الناس، زجاج قرن کا معنی اہل کل مدۃ کان فیہا نبی او طبقۃ من اہل العلو کرتے ہیں۔ صاحب مجمع البحار قرن کا معنی اہل کل زمان کرتے ہیں (تبیہ صغیراً بندہ)

تابعین اور قرن ثالث میں تبع تابعین ہیں۔ اور ان روایات کی تشریح میں امام نووی اور علامہ ابن خلدون کی عباراتیں بھی نقل کی جا چکی ہیں کہ قرن اول سے حضرات صحابہ کرام اور ثانی سے تابعین اور ثالث سے تبع تابعین کے پاک نفوس اور خود ان کی برگزیدہ ہستیاں مراد ہیں۔ اور اگر احادیث پر معمولی غور بھی کر لیا جاتا تو معاملہ سہل ہو جاتا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سائل نے ان الفاظ سے سوال کیا تھا ائى الناس خیر؟ کون لوگ بہتر ہیں؟ سائل نے اہل زمانہ کا سوال کیا ہے زمانہ کے متعلق سوال نہیں کیا۔ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ بہترین قرن میرا ہے پھر ثانی اور پھر ثالث۔ یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ سائل تو ائى الناس خیر کہتے ہوئے اہل زمانہ کی خیریت پوچھتا ہو اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کو زمانہ کی خیریت بتاتے ہوں۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان۔ یہ کیا قصہ ہوا؟ بخاری کی ایک روایت میں خیر الناس قرنی آیا ہے اور دوسری میں خیر کو قرنی آیا ہے، اور سلم وغیرہ میں خیر امتی قرنی آیا ہے۔ یہ تمام روایات آفتاب نیم روز کی طرح اس پر دلالت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زمانہ کی خیریت نہیں بیان فرمانا چاہتے بلکہ الناس، کھ اور امتی (کہ لوگوں میں بہتر، تم میں بہتر اور میری امت میں بہتر) سے اہل زمانہ کی خیریت بیان فرماتے ہیں۔ اور حضرت عمرؓ کی یہ روایت بھی نقل کی جا چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں اپنے صحابہ کے متعلق پھر ان کے بعد والوں کے متعلق اور پھر ان کے بعد آنے والوں کے متعلق وصیت کرتا ہوں (کہ انکی پیروی کرنا) یہ تو نہیں فرمایا کہ میں صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ کے بارے میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اس زمانہ کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تین زمانوں کی پیروی کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ ان تین زمانوں میں جو اہل زمانہ تھے، ان کی پیروی کا حکم دیا ہے اور وہ حضرات صحابہ کرام

(ایتیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ابن حجرؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی قرن کا معنی اہل زمانہ واحد متقارب الخ سے کرتے ہیں۔ دلیل الطالب ص ۸۳۶ و ص ۸۳۷ اور صاحب المطالع معنی کرتے ہیں: القرن امة هلكت

فلم یبق منهم (ایضاً ص ۸۳۸)

اور تابعین اور تبع تابعین کی ذوات اور ان کی ہستیاں تھیں۔ باقی صحابی کی تعریف واضح ہے، اس کی تشریح کی ضرورت ہی نہیں۔ اور تابعی وہ ہوتا ہے جس نے صحابی کی اتباع کی ہو۔ اور تبع تابعی وہ ہوتا ہے جس نے تابعی کی اتباع کی ہو۔ اگر تبع تابعی نے تابعی کی اتباع نہ کی، اور تابعی نے صحابی کی اتباع نہ کی تو وہ برگز تبع تابعی اور تابعی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ جیسا کہ صحابی وہ ہے جس نے بحالت ایمان تاملگ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی نہ چھوڑی ہو۔ جو آپ کے طریقے سے ہٹ گیا وہ صحابی نہ رہا بلکہ مرتد اور منافق کہلایا۔ اس بحث کو پیش نظر رکھ کر مولوی عبدالسمیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب سے پوچھنے کہ وہ کونسا صحابی یا تابعی یا تبع تابعی تھا جس نے جبریہ اور قدریہ کے فرقے ایجاد کئے اور فرض و خردوج کی بدعت ایجاد کی۔ وہ کونسا تابعی اور تبع تابعی تھا جس نے امام حسینؑ کو شہید کیا، اور حجاج کو مظالم کی اجازت دی؟ بلاشک یہ اور ان سے بڑھ کر بدعات اور مظالم ان زمانوں میں ظاہر ہوئے۔ لیکن خیر القرون زمانے نہیں کہ ان زمانوں میں جو بھی ایجاد ہو ان کی پیروی کی جائے۔ بلکہ خیر القرون ان زمانوں میں رہنے والوں کا نام ہے اور وہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین اور تبع تابعین ہیں۔ اور نہ تو انہوں نے بدعات ایجاد کیں اور نہ مظالم کئے اور ہمیں انکی پیروی کا حکم ہے۔ باقی جو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جاوید مستقیم سے ہٹ گیا، نہ وہ صحابی رہا اور نہ تابعی اور نہ تبع تابعی، اور ہم ان کے نقش قدم پر چلنے کے برگز پابند اور مکلف نہیں بلکہ ان کی مخالفت کرنا ضروری ہے۔ باقی رہی اجتہادی غلطی تو وہ محل نزاع سے خارج ہے۔ مولوی عبدالسمیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب کی یہ ایک اصولی غلطی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے خیر القرون کی تفسیر غلط سمجھی اور غلط کی اور یہ نہ سمجھے کہ ہم خود غلط کار ہیں۔ سچ ہے ع

میں الزام ان کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

مفتی احمد یار خان صاحب نے خیر القرون کے مفہوم پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں سنت

ہونے کا ذکر ہی کہاں ہے؟ سبحان اللہ تعالیٰ! کیا ہی زالی اور عجیب مفتیانہ تحقیق ہے۔ اگر جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صرف اتنا ہی ارشاد فرمادیتے کہ میرے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کی پیروی کرنا اور اس جہات کا ساتھ نہ پیدرنا تو یہ بھی آپ کی سنت ہی ہوتی۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کی روایت میں یہ الفاظ اقل کے جاچکے

ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے :

او صیکم باصحابی ثم الذین یلو فیہم
ثم الذین یلو فیہم الی ان قال فیلزم
الجماعة۔
ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں اپنے صحابہ کے بارے میں وصیت
کہتا ہوں، پھر تابعین اور پھر تبع تابعین کے بارے میں۔
اس جماعت کا ساتھ نہ چھوڑنا۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو حضرات صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین کی جماعت کو لازم پکڑنے اور
اس کو نہ چھوڑنے کی وصیت اور ضروری حکم فرماتے ہیں، اور مفتی صاحب کہتے ہیں کہ اس میں سنت کا ذکر ہی
کہاں؟ شاید مفتی صاحب کی یہ تحقیق ہو کہ سنت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور تاکید ہی حکم (وصیت) کا
نام نہیں ہے بلکہ لفظ سنت ہو تو تب ہی سنت کا اثبات ہوگا ورنہ نہیں۔

یہ تو مفتی احمد یار خان صاحب کی تحقیق تھی۔ اب مولوی عبدالمصعب صاحب کی بھی سینے۔ وہ خیر القرون کی
احادیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "ان روایتوں میں کسی جگہ بدعت اور احداث کا ذکر نہیں" (بلقظہ انوار
ساطعہ ص ۲۱)۔ یہ بھی عجیب استدلال ہے۔ ان روایات میں بدعت اور احداث کا ذکر نہیں، لیکن ان میں
اس کا ذکر تو ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کی جماعت کا
دامن پکڑنے کی وصیت فرمائی ہے، اس لئے کہ یہ حضرات صحیح معنی میں متبع سنت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے
رسول برحق کی مرضی کو حاصل کرنے والے اور ان کی مخالفت سے ڈرنے والے ہیں، اور دین پر چل کر امت
کے لئے ایک بہترین عملی نمونہ ہیں، اور دوسری روایات میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے
ارشاد فرمایا کہ :

ایاکم ومحدثات الامور۔ کل محدثۃ بدعة
کل بدعة ضلالة۔ من احدث فی امرنا هذا
مالیس منہ فہورڈ۔
بچو تم نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے سے۔ ہر نئی چیز بدعت ہے
ہر بدعت گمراہی ہے جس نے دین میں کوئی نئی چیز ایجاد
کی تو وہ مردود ہوگی۔

اور ان روایات میں بدعات سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ خیر القرون کی حدیث سے اتباع
کے متعلق وصیت کرتے ہوئے آپ نے سنت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرمائی ہے کہ سنت اس راستہ کا نام

ہے جس پر یہ اکابر عامل رہے ہیں، اور بدعات کی تردید کی احادیث میں اس امر کو مبرہن کیا گیا ہے کہ خیر القرون کے خلاف جو کچھ ایجاد کیا جائے گا، جس کا تعلق دین سے ہو تو وہ بدعت بھی ہے اور مردود بھی۔ خیر القرون کے مفہوم سے اتباع کا حکم دیا اور ایسا کہ و محدثات الامور سے اجتناب کا۔ کیا خوب کہا گیا ہے

وبضدھا تقبین الاشیاء

باقی رہا یہ سوال کہ ان روایتوں میں بدعت اور احداث کا ذکر نہیں، تو نہ سہی۔ جو چیز ان احادیث میں بیان کی گئی ہے وہ ان سے اخذ کر لو، اور جو چیز دوسری احادیث میں بیان ہوئی ہے وہ ان سے لے لو کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی سے

ترے زندوں پہ سارے کھل گئے اسرارِ دین ساقی
ہوا علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین ساقی

چوتھا اعتراض :

مولوی عبدالسمیع صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفاء میں تحریر فرماتے ہیں کہ خیر القرون میں قرن اول آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات پر اور قرن ثانی حضرت عمرؓ کی وفات پر اور قرن ثالث حضرت عثمانؓ کی وفات پر ختم ہو گیا اور حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ھ کو ہوئی ہے، اور مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری (المتوفی ۱۲۹۷ھ) لکھتے ہیں کہ معنی خیر القرون کے نہایت موزوں اور چسپاں ہیں، اسلام کی شوکتِ جمعی تک خوب رہی، پھر خانہ جنگی شروع ہو گئی، اور خیریت قرونِ ثلاثہ کی کم ہو گئی۔ (محصلاً انوارِ ساطعہ صلاً)۔

جواب :

حضرت شاہ صاحب کی عبارت سے یہ مطلب اخذ کرنا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جمہور صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین کی عقائد اور اعمال میں پیروی کرنا خیر القرون کے مخالف ہے، یقیناً اور قطعاً باطل ہے۔ اولاً اس لئے کہ پہلے صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام حضرات صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین کی پیروی بھی اُمت کے لئے لازم قرار دی گئی ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ

و سلم نے اس کے بارے میں وصیت فرمائی ہے۔ یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت شاہ صاحبؒ انکی پیروی اور اتباع کو خیر القرون کے تعامل کے خلاف سمجھتے ہیں۔ و ثانیاً حضرت شاہ صاحبؒ تو ازالۃ الخفا میں خلافت منتظمہ اور خلافت علیٰ منہاج النبوة کا مفہوم واضح کرتے ہوئے یہ ارقام فرماتے ہیں کہ کمال خیریت جس میں نبوت و رسالت کی کما حقہ نجلک تھی وہ صرف حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت تک ہی رہی ہے اور اس کے بعد کمال خیریت باقی نہیں رہی اور خلافت منتظمہ کی جگہ خلافت غیر منتظمہ نے لے لی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نفس خیریت بھی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ساتھ ختم ہو چکی تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ پہلے قرن حبسی خیریت دوسرے میں نہ تھی اور دوسرے حبسی خیریت تیسرے قرن میں نہ تھی۔ مع ہذا فی الجملہ قرون ثلاثہ خیر القرون ہی تھے۔ و ثالثاً اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت شاہ صاحب کی تحقیق ہی یہی ہے کہ وہ خیر القرون کو حضرت عثمانؓ کی شہادت پر ختم سمجھتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دوسرے دلائل اور صحیح احادیث کے پیش منظر دیگر حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ وغیر ہم کی پیروی کو ضروری نہیں سمجھتے، یا ان کی اتباع کو باعثِ نجات تصور نہیں فرماتے، یا عقیدہ و عمل میں ان کی اتباع کے علاوہ کسی اور کی اتباع کو صحیح خیال فرماتے ہیں خود حضرت شاہ صاحبؒ اپنی مایہ ناز کتاب میں ارقام فرماتے ہیں :

اقول الفرقة الناجية هم الابخذون في
العقيدة والعمل جميعا بما ظهر من الكتاب
والسنة وجري عليه جمهور الصحابة
والتابعين الى ان قال وغير الناجية كل فرقة
انتقلت عقيدة خلاف عقيدة السلف او
عملا دون اعمالهم حجة الله البالغة من كتابه
میں کہتا ہوں کہ فرقہ ناجیہ صرف وہی ہے جو عقیدہ اور عمل
دونوں میں کتاب و سنت کی اور جس پر جمہور صحابہ کرامؓ
اور تابعینؓ کا رہنمائی ہے (پھر آگے ارشاد
فرمایا) اور غیر ناجی ہر وہ فرقہ ہے جس نے سلف کے عقیدہ
کے خلاف کوئی اور عقیدہ یا ان کے عمل کے خلاف کوئی اور
عمل اختیار کر لیا۔

اس عبارت کو بار بار پڑھئے اور ملاحظہ کیجئے کہ حضرت شاہ صاحبؒ تو صرف اس فرقہ کو ناجی تسلیم کرتے ہیں جو عقیدہ اور عمل دونوں میں سلف یعنی حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ عظام کی پیروی کرتا ہو، اور فرماتے ہیں کہ ان کے عقیدہ اور عمل کے خلاف جو عقیدہ یا عمل کسی نے اختیار کیا وہ یقیناً غیر ناجی ہوگا

اور دوسرے مقام پر اس فرقہ ناجیہ اور اہل حق کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :
 فاخذوا يتبعون احاديث النبي صلى الله عليه
 وسلم واثار الصحابة والتابعين والمجتهدين -
 ان اکابر نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث
 اور آثار صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کی خوب پیروی
 (حجۃ اللہ البالغہ اطلالاً ومثلہ فی الانصاف ص ۳۱) کی ہے۔

مشہور ائمہ مجتہدین میں حضرت امام ابوحنیفہ (المتوفی ۱۵۰ھ) تابعی ہیں اور دیگر ائمہ مثلاً حضرت
 امام مالک اور امام شافعی وغیرہ تبع تابعین میں شامل ہیں۔ غرضیکہ حضرت شاہ صاحب حضرت صحابہ کرامؓ
 اور تابعین اور تبع تابعین کی عقیدہ و عمل دونوں میں اتباع کو نجات کا ذریعہ اور اس کی علامت اور نشانی
 بتاتے اور ان کی خلاف ورزی کو باعثِ ہلاکت اور سببِ عدم نجات فرماتے ہیں۔ یہ اس امر کی واضح دلیل
 ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک حضرات خلفاء راشدین کے علاوہ جمہور صحابہ کرامؓ اور تابعین وغیرہم
 کی اتباع بھی ضروری ہے اور نجات و فلاح انہی کی پیروی میں منحصر ہے۔

قائدہ : سنت اور بدعت کے پیش نظر بغرض اختصار بعض نے خیر القرون کا مفہوم یہ بیان
 کیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی عقیدہ اور عمل ثابت نہ ہو۔ بعض نے شیخینؓ اور خلفائے راشدینؓ کے
 خلاف کو خیر القرون کے خلاف کہا۔ بعض نے عام صحابہ کرامؓ اور تابعین کی خلاف ورزی کو خیر القرون کے
 منافی کہا۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ خیر القرون کا مفہوم ہی بس اتنا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے
 اپنے مذاق کے مطابق انہوں نے اہم اور عمدہ کلامی کو بیان کر دیا ہے، اور دوسروں کو بالاتباع سمجھ کر بیان
 نہیں کیا۔ اور جنہوں نے خیر القرون کی پوری تشریح بیان کی اور بدعت کی جامع و مانع تعریف اور حد سامنے
 رکھی ہے، تو انہوں نے خیر القرون کی تعریف حضرات صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین سے کی اور ان کے خلاف
 عقیدہ اور عمل کو بدعت کہا ہے، اور اکثر و بیشتر خود ان حضرات کی اپنی عبارات (جب وہ اس کو تفصیل سے
 بیان کرتے ہیں تو) اس کی تشریح کرتی ہیں۔ و صاحب البیت ادوی بہافیہ۔

اس قاعدہ کو نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی عبدالسمیع صاحب نے انوارِ ساطعہ میں اور مفتی احمد یار خان صاحب
 نے جہاں الحق میں اور اسی طرح دیگر بدعت پسند حضرات نے اپنی اپنی کتابوں اور رسالوں میں ٹھوکریں کھائی ہیں

اور خواہ مخواہ اپنے ذہن اور عوام کو مشوش کیا ہے۔ ان حضرات کی خدمت میں یہی عرض ہے کہ سہ

ٹھوکریں مت کھائیے، چلیے سنبھل کر، دیکھ کر

چال سب چلتے ہیں لیکن بندہ پرور، دیکھ کر

اسلامی فقہ اور قیاس بھی ایک شرعی دلیل ہے

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ انسانی ضروریات اور انسانی ماحول ایک حالت پر قائم رہنے والی چیز نہیں ہے اور تمدنی ترقیات کے ساتھ ہی ساتھ انسانی ضروریات کا تبدیل ہوتے رہنا ضروری امر ہے۔ لہذا آپ نے بہت سی فرعی باتوں سے متعلق خود احکام صادر فرمانے مناسب نہیں سمجھے، اور ان باتوں کا ان لوگوں کے فہم و فراست پر فیصلہ چھوڑ دیا ہے جو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغمبر مانتے اور کتاب و سنت کے اصولی احکام کو واجب التعمیل جانتے ہیں۔ کتاب و سنت کے قوانین کو لازمی اور قابل عمل جاننے والوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اجتہاد و تفقہ سے کام لیں اور کتاب و سنت کی روشنی میں ضروری اور ہنگامی قانون بنائیں، اسی کو فقہ اور قیاس کہتے ہیں۔ اور مجتہد مصیب بھی ہو سکتا ہے اور مخطیٰ بھی۔ لیکن اگر صاحب اجتہاد نے اپنی پوری طاقت اور وسعت صرف کی اور مع ہذا اس سے غلطی ہو گئی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ وہ مجتہد ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں سے ثواب کا مستحق ہوگا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ :

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا حكم الحاكم فاجتهد واصاب فله اجران واذا حكم فاجتهد واخطا فله اجر واحد. (بخاری ج ۱ ص ۲۹۱)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ جب کوئی فیصلہ کرنے والا فیصلہ کرے اور اجتہاد کرتے ہوئے درست فیصلہ کرے تو اس کو دو برابر اجر ملے گا، اور اگر اس سے خطا سرزد ہو تو اس کو ایک ہی اجر ملے گا۔

مسلم ج ۲ ص ۲۱۱ و مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲۲۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت اور مشقت کو ہرگز رائیگاں نہیں کرتا، تو اجتہاد کرتے وقت جو تکلیف اور

کاوش مجتہد کو ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر اس کو ضرور ایک اجر مرحمت فرمائے گا، اور اصابتِ رائے کی صورت میں ایک اجر اجتہاد کا اور ایک اصابتِ رائے کا اس کو حاصل ہوگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مجتہد صحیح معنی میں مجتہد ہو، ورنہ القضاة ثلاثہ کی حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ جاہل آدمی کا فیصلہ اس کو دروخ میں لے جائے گا (رواہ ابوداؤد، ابن ماجہ، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲۴)۔ اس صحیح روایت سے اجتہاد کا درست ہونا اور خطا کی صورت میں مجتہد کا معذور بلکہ ماجور ہونا صراحت سے ثابت ہوا۔ صرف بطور تائید و شاہد کے حضرت معاذ بن جبلؓ (المتوفی ۱۸ھ) کی روایت بھی سن لیجئے۔ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو اُس وقت آپ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ :

تو کس طرح فیصلہ کرے گا جب تیرے سامنے کوئی جھگڑا پیش ہوگا؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے موافق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں وہ بات تجھے نمل سکے؟ عرض کیا تو پھر سنتِ رسول اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا۔ اگر سنتِ رسول اللہ میں بھی نہ ہو؟ تو حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ یٰٰن کر آپ نے فرمایا کہ الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے قاصد کو اُس چیز کی توفیق عطا فرمائی، جس پر اللہ تعالیٰ کا رسول راضی ہے۔

کیف تقضى اذا عرض لك قضاء قال اقبى بكتاب الله قال فان لم تجد في كتاب الله قال فبسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فان لم تجد في سنة رسول الله قال اجتهد برأى ولا الو قال ف ضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم على صدره وقال الحمد لله الذي وفق رسول الله يرضى به رسول الله - (رواه الترمذی و ابوداؤد و الدارمی)

مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲۴

حافظ عمار الدین ابن کثیرؒ (المتوفی ۷۱۴ھ) اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

باسناد جید کہا ہو مقرر فی موضعہ۔ اس روایت کی سند عمدہ اور کھری ہے جیسا کہ اپنے

(تفسیر ج ۱ ص ۱) موقع پر ثابت ہے۔

اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کے جواب پر کہ اجتہاد برائی

(کہ میں قیاس اور رائے سے کام لوں گا) اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا اور اظہارِ مسرت کیا، جس سے صاف طور

پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فروعی قوانین کو منجمد رکھنا پسند نہیں فرمایا۔ بلکہ ضرورت کے پیش نظر ایسے قوانین کو استقرانی رکھنا چاہا ہے تاکہ انسان کے قوائے دماغیہ کی نشوونما اور انسانی ترقیات میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے۔ حضرت ابوبکرؓ (المتوفی ۳۱ھ) کے پاس جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا تو کتاب اللہ، اور سنت رسول اللہ میں اس کو تلاش کرتے تھے، ورنہ اجتہاد سے کام لیتے تھے۔

ن ابابکرؓ اذا نزلت به قضیة لم یجد
یہا فی کتاب اللہ اصلاً ولا فی سنة اثرًا
فقال اجتهد برائی فان یکن صوابا
فمن اللہ وان یکن خطأ فنی واستغفر
اللہ۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۳۱)۔

حضرت ابوبکرؓ کے پاس جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا، تو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں، اگر ان کو اس کی وضاحت نہ ملتی تو فرماتے، میں اپنی رائے سے اجتہاد کرتا ہوں۔ اگر درست ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی معافیت ہوگی۔ ورنہ میری خطا ہوگی، اور میں اللہ سے معافی چاہتا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے مشہور تابعی قاضی شریح (المتوفی ۱۵۸ھ) کو خط لکھا۔ اس میں کتاب و سنت اور اجماع کے بعد خاص طور پر اجتہاد کرنے کا ذکر ہے۔ (دیکھئے مسند دارمی ص ۳۳۰ و مشنفی کنز العمال ج ۳ ص ۱۷۱)۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی اجماع کے بعد قیاس اور اجتہاد کرنے کا حکم دیا کرتے تھے (مسند دارمی ص ۳۱۱)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ معمول تھا کہ جب کتاب و سنت کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے کوئی ثبوت نہ مل سکتا تو قال فیہ بواہ (مسند دارمی ص ۳۱۱ و مستدرک ج ۱ ص ۱۷۱ و قال علیٰ شرطہما) اپنی رائے سے کام لیتے تھے۔

الغرض جمہور اہل اسلام قیاس شرعی کو صحیح اور حجت تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں:

جمہور از صحابہ و تابعین و فقہاء و متکلمین ہاں
رفتہ کہ اصلی از اصول شریعت است استدلال
میرود بدان بر احکام وارده بسع ظاہریہ
نکارش کہ وہ اندہ (افادہ الشیوخ ص ۱۲۱)

جمہور صحابہ و تابعین اور فقہاء و متکلمین اس کے قائل ہیں کہ قیاس شریعت کے اہموں میں سے ایک اصل ہے اس سے احکام وارده بسع میں باقاعدہ استدلال صحیح ہے اور اہل ظاہر نے قیاس کا انکار کیا ہے۔

اہل ظاہر کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ غیر نبی کو یہ مقام کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ

دین کی باتوں میں دخل دے۔ اعتراض بظاہر بڑا معقول اور وزنی ہے مگر حقیقت سے بالکل دُور ہے۔ اسلئے کہ موجب حکم مجتہد اور قائل کا قیاس و اجتہاد نہیں ہے بلکہ موجب اصل میں وہی شرعی دلیل ہے جو قرآن کریم اور حدیث وغیرہ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ مجتہد کا کام صرف اتنا ہے کہ مسکوت عنہ جزئی کی کڑی دلیل شرعی سے جوڑ دیتا ہے اور بس۔ چنانچہ مشہور فیلسوف اسلام علامہ ابن رشد ابوالولید محمد بن احمد (المتوفی ۵۹۵ھ) لکھتے ہیں :

وَأَمَّا الْقِيَاسُ الشَّرْعِيُّ فَهُوَ الْحَاقُّ الْحَكْمَ
الْوَاجِبَ لِشَيْءٍ مَا بِالشَّرْعِ بِالشَّيْءِ الَّذِي
أَوْجِبَ الشَّرْعَ لَهُ ذَلِكَ الْحَكْمَ أَوْ لِعِلَّةِ
جَامِعَةٍ بَيْنَهُمَا۔ (ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۰۰)۔
کہ قیاس شرعی اس کو کہتے ہیں کہ حکم شریعت میں کسی چیز
کے لئے ثابت ہو چکا ہے اس حکم کو اُس چیز کے اوپر بھی
چسپاں کیا جائے جو مسکوت عنہ ہے۔ یا تو اسلئے کہ یہ اُس کے
مشابہ ہے اور یا اسلئے کہ ان دونوں میں علتِ عامہ مشترک ہے۔

نواب صاحب اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں۔ "وَأَمَّا الْقِيَاسُ فَسُورَةُ فِي مَعْنَى جَمَلٍ مَعْلُومٍ بِمَعْلُومٍ
أَسْتَدْرَاجًا لِشَيْءٍ أَوْ بِأَمْرٍ جَامِعٍ مِثْلَ مَا فِي صِفَتِ وَأَخْتَارَهُ جَمْعُ الْمُتَّقِينَ"۔ (افادۃ السیوخ ص ۱۳۱)
مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب روپڑی لکھتے ہیں :

"جب انسان کو کوئی مسئلہ قرآن و حدیث سے صراحتاً نہیں ملتا، تو وہ قرآن و حدیث میں اجتہاد و استنباط
کرتا ہے اور وہ اجتہاد و استنباط قرآن و حدیث سے الگ نہیں کہلاتا۔ اسی طرح صحابی کے اس قول کو جو
اجتہاد و استنباط کی قسم سے ہو، اس کو قرآن و حدیث سے الگ نہ سمجھنا چاہیے بلکہ قرآن و حدیث میں دخل
سمجھنا چاہیے۔" (بلفظ ضمیمہ رسالہ اہل حدیث ص ۱۰)۔

نیز لکھتے ہیں۔ "رہا یہ شبہہ کہ (برصورتِ تسلیم قول صحابی) قرآن و حدیث کے سوا تیسری شے
کس طرح حجت ہوگی تو اس کا جواب یہ ہے کہ تیسری شے ہے ہی نہیں، جیسا کہ ہمارا اجتہاد تیسری شے
نہیں (ص ۱۰) بلکہ جو حضرات اقوال صحابہ اور اجتہاد کو حجت نہیں تسلیم کرتے اور ان کی تقلید سے گریز کرتے
ہیں ان کی ان الفاظ سے شکایت کرتے ہیں کہ۔ آج کل کے بعض اہل حدیث اصل روش اہل حدیث
سے لکھتے دُور ہیں، اللہ ان کو قریب کرے، آمین ثم آمین"۔ (ص ۱۰)۔

مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں :

”باقی رہا وہ شخص جو ابھی اس مرتبہ (اجتہاد) تک نہیں پہنچا تو اس کے لئے سلامتی اسی میں ہے، کہ وہ ائمہ فن کی تحقیقات اور ان کی آراء کا اتباع کرے۔ تمام ذہنی علوم کی طرح مذہبی علوم میں بھی یہی طریقہ بہتر اور صحیح تر ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو لوگ اجتہاد بلا علم کا علم بلند کرتے ہیں وہ دنیا اور دین دونوں میں اپنے لئے رسوائی کا سامان کرتے ہیں۔“ (تفہیمات ص ۲۸۶)۔

کاش مودودی صاحب خود بھی اس بہترین اور زرخیز نصیحت پر عمل کرتے، اور بلا راسخ علم کے خام اجتہاد کا چور دروازہ نہ کھولتے، جس کی بدولت وہ خود بھی اس رسوائی سے بچتے اور لوگوں کو بھی گمراہی سے بچاتے۔

عباد اور زہاد کا قیاس | یہ بات طے شدہ ہے کہ اجتہاد کے لئے چند نہایت ضروری شرطیں ہیں

جن میں وہ نہ پائی جاسکیں، ان کی بات ہرگز حجت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح محض صوفیوں کی باتیں بھی شرعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، الا یہ کہ وہ شریعت کے موافق ہوں۔ چنانچہ علامہ قاضی ابراہیم الحنفی (المتوفی فی حدود متلہ) لکھتے ہیں :

”اور جو عابد و زاہد اہل اجتہاد نہیں، وہ عوام میں داخل ہیں، ان کی بات کا کچھ اعتبار نہیں ہاں

اگر ان کی بات اصول اور معتبر کتابوں کے مطابق ہو تو پھر اس وقت معتبر ہوگی (نقائس الاطہار ترجمہ مجالس الابرار ص ۲۳) مجالس الابرار و مسالک الاخیار علامہ ملا احمد بن عبدالقادر الرومی (المتوفی ۷۸۷ھ) کی کتاب ہے مصابیح

کی سوا منتخب احادیث کی شرح اس میں کی گئی ہے ہر حدیث اور اسکی شرح کو مجلس کا عنوان دیا گیا ہے جو کل ۱۲۰ مجلسیں ہیں (کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ص ۱۵۹) علامہ ملا کاتب چلبی (المتوفی ۱۲۶۷ھ) طبع نور محمد کراچی

مجالس الابرار کی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے بھی بڑی تعریف کی ہے فرماتے ہیں کہ کتاب ”معتبر است“ (فتاویٰ عزیز ص ۱۱۱)۔

حضرت مجدد الف ثانی نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ :

عمل صوفیہ در حل و حرمت سندلیست ہمیں پس
اسد کہ ما ایشاں را معذور داریم و ملامت نہ کنیم
حضرات صوفیاء کی بات حل و حرمت میں سند
نہیں ہے۔ یہی کافی ہے کہ ہم ان کو ملامت نہ کریں اور
ان کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کریں۔ اس جگہ حضرت امام
و مرایشاں را بحق سبحانہ و تعالیٰ مفوض داریم

ابنجا قول امام ابوحنیفہؒ و امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ معتبر ہوگا
 محمد معتبر است نہ عمل ابو بکر شیبلیؒ و ابو حسن
 نوریؒ (مکتوبات دفتر اول صفحہ ۳۳۵، مکتوب ۲۶۶)
 ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول معتبر ہوگا
 نہ کہ ابو بکر شیبلیؒ اور ابو حسن نوریؒ جیسے صوفیاء
 کہ امام کا عمل۔

قیاس بدعت نہیں ہے | پہلے باحوالہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ قیاس و اجتہاد قرآن و حدیث
 سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس میں غیر منصوص کی کڑی کو منصوص سے ملا دیا جاتا ہے، اور یہ ایک شرعی حجت
 ہے۔ قیاس و اجتہاد سے نہ تو دین میں خلل واقع ہوتا ہے اور نہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر بدعت کا اطلاق
 ہرگز درست نہیں ہے۔ چنانچہ امام ابو اسحاق شاطبیؒ (المتوفی ۳۷۹ھ) لکھتے ہیں :

ولیس من شأن العلماء اطلاق لفظ البدعة
 علی الفروع المستنبطة التي لم تكن في ماسلف
 وان دقت مسائلها فكذا لا يطلق علی دقائق
 الاخلاق الظاهرة والباطنة انما بدعة لان
 الجميع يرجع الى اصول الشرعية (الاعتصام ج ۱ ص ۲۷۵)
 اور دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ یعنی

کہ علماء کی شان سے بعید ہے کہ وہ ان فروع مستنبطہ پر بدعت
 کا اطلاق کریں جو ماضی زمانہ میں نہ تھے۔ اگرچہ ان کے مسائل
 بڑے دقیق ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح اخلاق ظاہرہ اور باطنہ
 کے دقائق پر بھی لفظ بدعت کا اطلاق صحیح نہیں ہے اس لئے
 کہ یہ سب کے سب اصول شریعت کی طرف راجع ہیں۔

واما الكلام في دقائق التصوف فليس
 ببدعة۔ (ج ۱ ص ۲۷۴)۔
 تصوف کے دقائق اور اسرار میں کلام کرنا اور ان کا اثبات
 کرنا بھی بدعت نہیں۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ معتبر بزرگان دین نے تصفیہ قلوب کے لئے جو اعمال و اشغال بتائے
 ہیں وہ بدعت نہیں ہیں کیونکہ یہ سب امور اصول شریعت سے ثابت ہیں بخلاف بدعات کے کہ ان کا ثبوت اصول
 شریعت سے ہرگز نہیں ہے بلکہ ان میں مبتدعین کی اپنی آراء اور خواہشات کار فرما ہیں ذلک قولہم بافواھم۔
 صدحیرت ہے مولوی عبدالسمیع صاحب پر کہ وہ لکھتے ہیں: "تعجب ہے کہ جو لوگ اعمال و اشغال مشائخ
 صوفیہ عمل میں لائیں اور تقلید شخصی کو واجب اور حق کو منحصر چار امام میں جانیں اور اجماع امت کو درست
 جانیں اور پھر یہ بات زبان پر لائیں کہ بعد قرون ثلاثہ کے جو کچھ حادث ہوگا وہ بدعت ضلالت اور فی النار ہوگا۔"

(انوارِ ساطعہ ص ۱۲)۔ مگر خیر سے خیر القرون کا مفہوم خود ہی نہیں سمجھے۔ بحث گذر چکی ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ نہ معلوم وہ کونسا متفق عالم ہے جس نے یہ کہا ہو کہ حق صرف ائمہ اربعہ میں منحصر ہے اور جو ان کی تقلید نہیں کرتا وہ قطعاً اور یقیناً باطل پر ہے۔ سینکڑوں امام ان کے علاوہ بھی گذرے ہیں، اور لوگ ان کی بھی تقلید کرتے رہے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ حسب تحقیق حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ہندوستان وغیرہ کے مزاج کے مطابق حضرت امام ابوحنیفہ کی فقہ قریب تر ہے اور ان پر ان کی تقلید واجب ہے اور مجموعی لحاظ سے اب ائمہ اربعہ کی تقلید نہایت ضروری ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن عابدون (دیکھئے مقدمہ ص ۱۲۸) وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے، مگر تقلید کے انحصار سے حق کا انحصار ان میں کیسے اور کس طرح لازم آیا؟

اور مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ: "تصوف کے اشغال صوفیاء کی ایجاد ہے اور ہر زمانہ میں نئے نئے ہوتے رہتے ہیں اور جائز ہیں، بلکہ راہ سلوک ان ہی سے طے ہوتی ہے۔ کہتے اب وہ قاعدہ کہاں گیا کہ ہر نئی چیز حرام ہے۔" (جاء الحق و زہق الباطل ص ۲۱)۔

قاعدہ تو اپنی جگہ پر ہے مگر مفتی صاحب کی اپنی سمجھ کا تصور ہے۔ اس لئے کہ ابھی الاعتصام کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ تصوف کی باریکیوں اور ان کے اسرار کو بدعت نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ سب اصول شریعت کی طرف راجع ہیں اور ان میں محض حضرات صوفیاء کرام کی آراء اور قیاسات ہی کا دخل نہیں، تاکہ ان کی بات قابل التفات نہ ہو اور ہم ان کو معذور تصور کریں بلکہ یہ سب اصول شریعت کی طرف راجع ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ صوفی ظاہری علوم سے بہرہ ور ہو، کتاب و سنت کا عالم ہو، اخلاص اور للہیت میں نمایاں اور اتباع سنت کا شیدائی ہو۔ ہر صوفی، صوفی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

نہ ہر کہ موئے برافروخت دلبری داند

بات دُور جا پڑی۔ بات یہ عرض کی جا رہی تھی کہ قیاس بدعت نہیں ہے، اور حضرت مجدد

الف ثانی فرماتے ہیں:

واما القیاس والاجتہاد فلیس من البدعة
بہر حال قیاس واجتہاد تو اس کا بدعت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کیونکہ قیاس نصوص کے معانی کو ظاہر کرنے والا
فی شیء فانہ مظهر لمعنی النصوص لا مثبت

امر زائد۔ (مکتوبات حصہ سوم ص ۷۷) ہے، کسی زائد چیز کا اثبات نہیں کرتا۔
اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ :

”علماء مجتہدین اظہار احکام دین فرمودہ اند نہ اعدا ثالیس منہ، پس احکام اجتہاد یہ از امور
محدثہ نباشند بلکہ از اصول دین بوند۔“ (مکتوبات حصہ چہارم ص ۹۷، مکتوب ۲۶)۔

الحاصل ان سابقہ احکامات کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات آفتاب نمرود کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ دلائل اور
براہین کی اصولی چار قسمیں ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ اور یہ امر بھی ثابت ہو
چکا ہے کہ قیاس بھی شرعی حجت ہے، بدعت نہیں ہے۔ جب قیاس اور اجتہاد صحیح ہے تو پھر کسی مجتہد کی
تقلید کرنا کیسے بدعت ہوگا؟ اب ہمیں اپنے ہر قول و فعل کو ان دلائل کی کسوٹی پر پرکھنا ہے۔ جو ان کے
موافق ہو، وہ حق ہے اور اسی میں نجات و فلاح ہے۔ اور جو ان سے ٹکرائے، یا اس کا ثبوت ان سے نہ
ہو سکے تو وہ باطل اور مردود ہوگا، اور بقول علامہ اقبالؒ (المتوفی ۱۳۵۷ھ) اسے طرد

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

قیاس کے متعلق ایک نفیس اور عمدہ بحث | یہ بالکل ٹھیک ہے کہ دین کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہو چکی تھی۔ مگر تکمیل دین کا یہ مطلب ہے کہ قواعد و ضوابط اور کلیات دین
پورے طور پر مکمل ہو چکے تھے۔ بعد کو پیش آنے والے واقعات اور حوادث کو ان اصول اور کلیات کے
تحت درج کرنا اور انہی جزئیات کو کلیات پر منطبق کرنے کا نام قیاس و اجتہاد ہے، لیکن بسا اوقات
جزئیات کا کلیات میں داخل کرنا کسی خاص عارضہ کی وجہ سے بعض لوگوں پر مخفی رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ فروعی مسائل میں فقہاء اسلام کا اختلاف رہا ہے، اور ایسے مواقع پر جو چیز اقرب الی الحق ہو، اس کو
قبول کر لینا اور اس پر عمل کرنا نجات کے لئے کافی ہے۔ ہاں اگر قرآن اور حدیث سے کوئی نص مل جائے، یا
اجماع پر اطلاع ہو جائے تو اس صورت میں قیاس سے رجوع کرنے میں ہرگز تاثر نہیں ہونا چاہیے، اور
یہی کچھ ائمہ دین نے فرمایا ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ راقم الحروف کی کتاب الکلام المفید فی اثبات
التقلید کا مطالعہ کافی ہوگا،

جن مسائل اور امور میں حضرات فقہاء کرام نے اجتہاد و قیاس کیا ہے، ان کے اصول و ضوابط اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام و تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں موجود تھے مگر ان کے دوائی و اسباب و محرکات اُس وقت رونما ہوئے تھے۔ جب ان مسائل کے اسباب و محرکات مجتہدین کے زمانہ میں پیدا ہوئے تو ان کو قیاس و اجتہاد کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے اپنے اپنے قیاس و اجتہاد سے ان کی کڑی نصوص شرعیہ سے جوڑ دی اور جزئیات کو کلیات میں داخل کر دیا بخلاف ان جملہ بدعات کے جن پر آج شدت کے ساتھ بدعت پسند حضرات عامل ہیں (حتیٰ کہ انہوں نے اپنے عمل اور اصرار سے ان کو شعار دین بنا رکھا ہے، اور ان بدعات میں شریک نہ ہونے والوں کو دہانی اور خدا معلوم کیا کیا خطابات مرحمت فرماتے ہیں) کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایک بدعت کا سبب اور محرک خیر القرون میں موجود تھا، مگر ان خود ساختہ بدعات کا اس وقت برگز وجود اور رواج نہ تھا۔ لہذا ان بدعات کو قیاس و اجتہاد کی مد میں شامل کرنا سراسر بے دینی اور نرمی جہالت ہے۔ مثلاً میلاد کے منانے کا سبب، (یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت یا سعادت) اُس وقت موجود تھا۔ چالیس سال قبل از نبوت اور تیس سال بعد از نبوت آپ نے ولادت کے بعد اپنی قوم اور حضرات صحابہ کرام میں گزارے، تھے اور حضرات صحابہ کرام و تابعین وغیرہم میں آپ کا گہرا عشق اور محبت بھی تھی لیکن کسی نے آپ کا یوم ولادت نہ منایا جیسے آج منایا جاتا ہے، اور نہ عرفی میلاد کا ان میں کوئی ثبوت تھا جب سبب اور محرک موجود تھا اور یہ بدعت موجود نہ تھی، تو بعد کو اس میں قیاس کرنے کی ہرگز نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش اسی طرح آپ کی دو ازواج مطہرات حضرت خدیجہ اور حضرت زینب ام المساکین اور آپ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ اور آپ کی تین صاحبزادیاں حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم اور حضرت زینب اور جملہ صاحبزادے آپ کی زندگی میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے تھے، مگر نہ تو آپ نے ان کا تیجہ کیا اور نہ ساتواں اور نہ دسواں اور نہ چالیسواں۔ نہ ان کی قبروں پر میلاد لگایا اور نہ عرس کیا، نہ چراغ جلانے، اور نہ اوپر چادریں ڈالیں، نہ پھول چڑھائے اور نہ گنبد بنوائے۔ بلکہ ان میں بشیر اشیار کے متعلق صریح نہی بلکہ لعنت فرمائی۔ (مثلاً قبروں پر چراغ روشن کرنا وغیرہ) پھر نص کے مقابلہ میں قیاس کا کیا مطلب ہے؟ اور آپ کی وفات

کے بعد باوجود کمالِ عشق و محبت کے حضرات صحابہ کرام نے ان میں سے کوئی کام نہ کیا، اور نہ حضرات صحابہ کرام کی وفات کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے ایسا کیا۔ یہ سب کے سب اسباب اور دواعی موجود تھے اور کوئی مانع بھی نہ تھا جو بعد کو زائل ہو گیا ہو۔ لیکن ان خود تراشیدہ بدعات کا مطلقاً وجود نہ تھا و علیٰ ہذا القیاس۔ ایصالِ ثواب کیا جاتا تھا مگر نہ تو دنوں کی تعیین ہوتی تھی اور نہ کھانا سامنے رکھ کر اس پر کچھ پڑھا جاتا تھا۔ (تبرک کے لئے کھانے پر کچھ پڑھنا محلِ نزاع سے بالکل خارج ہے)۔ نخلتے ہوتے تھے مگر آج کل کی بدعات اور رسوم نہ ہوتی تھیں۔ شادیاں ہوتی تھیں مگر نہ تو سہرے باندھے جاتے تھے اور نہ پیسے وغیرہ پھینکے جاتے تھے۔ اسی طرح دیگر خرافات کا وجود اُس وقت نہ تھا۔ جنازے ہوتے تھے مگر جنازہ کے ساتھ جہرے نہ تو کلمہ پڑھا جاتا تھا اور نہ کلّ حتیٰ میوت کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ نماز جنازہ تو پڑھی جاتی تھی مگر نماز سے فارغ ہونے کے بعد مل کر دعا نہ مانگی جاتی تھی۔ دفن کرنے کے بعد تلقین تو ہوتی تھی مگر قبر پر اذان نہیں دی جاتی تھی۔ مردوں کو کفن تو وہ پہنتے تھے مگر الفی اور کفنی لکھنے کا دستور نہ تھا۔ ذکر بھی کیا کرتے تھے اور درود شریف بھی پڑھتے تھے مگر مل کر اجتماعی صورت میں جہر سے ذکر کرنے اور درود شریف باوازی بلند پڑھنے کا ان میں ہرگز رواج نہ تھا۔ الغرض آج جتنی بدعات رائج ہیں، ان میں سے ایک ایک کا سبب خیر القرون میں موجود تھا مگر یہ بدعات نہ ہوتی تھیں، تو پھر ان میں قیاس و اجتہاد کا کیا مطلب ہے؟ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان امور میں اگر قیاس و اجتہاد کی ضرورت اور گنجائش ہوتی، تو حضرات ائمہ مجتہدینؒ اس سے ہرگز نہ چوکتے۔ یہ بالکل سمجھ سے بالاتر ہے کہ اُس وقت یہ قیاس و اجتہاد اُن کو نہ سوجھا اور آج یہ قیاس جائز ہو گیا۔ عشق و محبت اُن میں زیادہ تھی، علم و تقویٰ ان میں زیادہ تھا۔ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت ان میں کامل اور مکمل تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُس وقت ان امور کو دین بنانا نصیب نہ ہوا اور آج بیک انقلابِ یردین اور شعارِ دین اور علاماتِ اہل السنّت بن گئے۔ اللہ کچھ تو فرمائیے! اسے

یہ کاوشیں بے سبب ہیں کیسی، کدورتوں کی کچھ انتہا بھی؟

زبان رکھتے ہیں ہم بھی آخر، کبھی تو پوچھو سوال کیا ہے؟

یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جس کو ذہن نشین کر لینے کے بعد تمام خود ساختہ بدعات کی کموکھلی عمارت خود

خود بیونہ زمین ہو جاتی ہے۔ ایسے امور میں جن کے تمام اسباب و دواعی اور محرکات اُس وقت موجود

تھے، نہ قیاس ہو سکتا ہے اور نہ یہ بدعتِ حسنہ کا درجہ پاسکتے ہیں۔ یہ امور قطعی طور پر بدعتِ قبیحہ اور سنیہ کی
مدیں داخل ہیں، اس میں ایک رتی برابر بھی شک نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ قاضی ابراہیم الحنفی تحریر فرماتے ہیں:
”اور اگر آپ کے زمانہ میں سبب موجود ہو لیکن کسی عارضی وجہ سے متروک ہو اور حضور کی وفات کے

بعد وہ مانع جاتا رہا ہو تو ایسے امر کا احداث بھی جائز ہے جیسے قرآن کا جمع کرنا۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم کی حیات میں یہ مانع تھا کہ وحی برابر آتی رہتی تھی، اللہ تعالیٰ جو چاہتا تھا بدل دیتا تھا۔ حضور کی وفات کے
بعد وہ مانع جاتا رہا اور جس فعل کا سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود ہو اور کوئی مانع بھی نہ
ہو اور باوجود اس کے حضور نے نہ کیا ہو، تو ایسا کام کرنا اللہ تعالیٰ کے دین کو بدلنا ہے؟ کیونکہ اگر اس کام میں
کوئی مصلحت ہوتی، تو سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس فعل کو خود ضرور کرتے یا ترغیب فرماتے اور
جب آپ نے نہ خود کیا نہ کسی کو ترغیب دی، تو معلوم ہوا کہ اس میں کوئی بھلائی نہیں، بلکہ وہ بدعتِ قبیحہ سنیہ
ہے۔“ (نفائس الاظہار ترجمہ مجالس الابرار ص ۱۲)۔

یہ عبارت اس پر واضح حجت ہے کہ محرک اور سبب کے ہوتے ہوئے جبکہ کوئی مانع بھی موجود نہ تھا، آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اگر کسی کام کو نہیں کیا اور کرنے کی ترغیب بھی نہیں دی تو وہ کام بدعتِ قبیحہ اور
بدعتِ سنیہ ہوگی۔ اگرچہ وہ بظاہر عبادت ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ:

اتبعوا اثارنا ولا تبتدعوا فقد کفیتم۔ تم ہمارے نقش قدم پر چلو، اور نئی نئی بدعات مت ایجاد کرو

(الاعتصام ج ۱ ص ۵۷) کیونکہ تم کفایت کے گئے ہو۔

اور حضرت حذیفہ (المتوفی ۳۱ھ) نے ارشاد فرمایا کہ:

کل عبادۃ لم یعبدها اصحاب رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم فلا تعبدوها (الاعتصام ج ۱ ص ۱۱) تم بھی اس کو مت کرو۔

اور حافظ ابن کثیر نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ:

واما اهل السنۃ والجماعۃ فیقولون

فی کل فعل وقول لم یثبت عن الصحابة جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سفارت

رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہو بدعة لانه لوکان
 خیراً لسبقونا الیہ انہم لم یتروا خصلۃ
 من خصال الخیر الا وقد بادروا الیہا۔
 (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۱۵۱)

صحابہ کرام سے ثابت نہ ہو تو اس کا کرنا بدعت ہے کیونکہ
 اگر وہ کام اچھا ہوتا تو ضرور حضرات صحابہ کرام ہم سے پہلے
 اس کام کو کرتے۔ اس لئے کہ انہوں نے نیکی کے کسی پہلو اور
 کسی نیک اور عمدہ خصلت کو مشنہ عمل نہیں چھوڑا بلکہ
 وہ ہر کام میں گونے سبقت لے گئے ہیں۔

الحاصل مجتہد کا قیاس و اجتہاد تو حق اور صحیح ہے، مگر صرف ان امور اور مسائل میں جن کے دواعی
 و اسباب اور محرکات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ظہور پذیر ہوئے اور ایسے امور میں برگزہرگز
 قیاس و اجتہاد جائز نہیں ہے جن کے دواعی و اسباب اور محرکات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور
 حضرات صحابہ کرام کے وقت موجود تھے، اور آج کل عموماً جتنی بھی بدعات رائج ہیں وہ بیشتر وہی ہیں جن
 کے اسباب اور محرکات اُس وقت موجود تھے، ایسے امور میں فلاح و نجات صرف ان حضرات کے نقش قدم
 پر چلنے سے ہی نصیب ہوگی اور ان کی مخالفت کرنے پر اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوگا اور جناب نبی کریم صلی اللہ
 تعالیٰ علیہ وسلم بھی برگزہراضی نہ ہوں گے اور صرف اسی پہلو میں حضرات صحابہ کرام اور تابعین وغیرہم کا صحیح
 عشق منحصر ہے اور اس کے خلاف گمراہی بھی ہے اور بدعت بھی، آخر وہی تباہی بھی ہے اور بربادی بھی۔
 اعادنا اللہ تعالیٰ منہ

الہی خیر ہو کہ فتنہ آخر زماں آیا
 ہے ایمان و دین باقی کہ وقت امتحاں آیا

باب دوم

بدعت لغوی اور شرعی کی تعریف، اس کی اقسام اور اس کے احکام کے بیان میں

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شرک کے بعد جس طرح بدعت اور اہل بدعت کی تردید فرمائی ہے شاید ہی کسی اور چیز کی ایسی تردید فرمائی ہو، اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ بدعت سے دین کا اصلی علیہ اور صحیح نقشہ بدل جاتا ہے، اور اصل و نقل اور حق و باطل میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی اور قرآن کریم نے صراحت سے اس امر کو بیان کیا ہے کہ دین کے مٹ جانے کے اصولی دو طریقے ہیں۔ کفر و کفران حق اور تلبیس حق و باطل۔ اور اسی اختلاط اور تلبیس کی وجہ سے دین الہی لوگوں کی خواہشات اور اہوار کا ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ جس کا جی چاہا کسی چیز کو اپنی مرضی سے دین بنا دیا، اور جس کی خواہش ہوئی کسی چیز کو دین سے خارج کر دیا۔ خدا تعالیٰ کا دین نہ ہوا، بچوں کا کھیل ہوا (معاذ اللہ تعالیٰ)۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ کسی امر کے باعث ثواب اور موجب عذاب ہونے کا فیصلہ صرف باری تعالیٰ کا کام ہے اور اس کو لوگوں تک پہنچانا اور بیان کرنا نبی اور رسول کا کام ہے، اپنی مرضی اور خواہش سے کسی چیز کا کارِ ثواب اور کارِ عقاب کہنے والا گویا دراصل اپنے لئے منصب الوہیت اور رسالت تجویز کرتا ہے (عیاذ باللہ تعالیٰ)۔ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کامل اور مکمل نمونہ بنا کر ہمیں ہر کام میں (جو آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہ ہو) آپ کی اتباع اور پیروی کرنے کا حکم دیا ہے، اور ہمیں اپنی مرضی پر ہرگز نہیں چھوڑا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

البتہ تمہارے لئے بھلی ہے چال اور نمونہ رسول اللہ،

لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ

اُس کے لئے، جو کوئی امید رکھتا ہے اللہ تعالیٰ کی اور

اللَّهُ كَثِيرًا ○ (پ ۲۱، احزاب، رکوع ۲) - آخرت کے دن کی -

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو بہترین اور اعلیٰ نمونہ قرار دے کر ہم سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ہم ہر معاملہ میں اور ہر ایک حرکت و سکون میں اور ہر شہت و برخواست میں اور ہر قسم کی غمی اور خوشی کے معاملات میں آپ کے نقش قدم پر چلیں۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ :

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ
 اے محمد! آپ اعلان کر دیں کہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ
 تعالیٰ سے تو میری اتباع اور پیروی کرو، تاکہ محبت کرے
 تم سے اللہ تعالیٰ اور بخشے گناہ تمہارے۔ (پ ۳، آل عمران، رکوع ۴)

یہ آیت کریمہ اس امر کی صاف اور واضح دلیل ہے کہ اگر آج کسی جماعت یا شخص کو اپنے مالکِ حقیقی کی محبت کا دعویٰ ہے تو لازم ہے کہ اس کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لینا چاہیے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا۔

آپ کے اس بہترین اسوہ اور بدی و سیرت کی اتباع کا نام سنت، اور خلاف و رزی کا نام بدعت ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ (المتوفی ۱۰ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جمعہ کے خطبہ میں جبکہ ہزاروں کا مجمع سامنے ہوتا تھا، پُر زور اور بلند آواز سے یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ :

أما بعد فان خير الحديث كتاب الله
 وخير الهدى هدى محمد صلي الله
 عليه وسلم وشر الأمور محدثاتها وكل
 بدعة ضلالة - (مسلم ج ۱ ص ۲۸۵ و مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲)
 اما بعد! بہترین بیان اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور
 بہترین نمونہ اور سیرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت
 ہے، اور وہ کام بُرے ہیں جو نئے نئے گھڑے جائیں اور
 ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی بدی اور سیرت کا بدعت سے تقابل کر کے یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ کی سیرت اور نمونہ کے خلاف جو کچھ ایجاد کیا جائے گا وہ سب بدعت ہوگا اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر بدعت بُری نہیں ہے بلکہ دنیاوی ایجادات بھی مذموم

ہو جائیں، بلکہ وہ بدعت بُری ہے جو کتاب اللہ اور بدی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خلاف ہو۔ لہذا جو چیز کتاب و سنت کی روش کے خلاف نہ ہوگی وہ بدعت اور گمراہی نہ ہوگی، اور گمراہی سے خدا تعالیٰ کبھی راضی نہیں ہوتا۔ بلکہ بُرائی کو مٹانے کے لئے اس نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث کیا اور ان پر کتابیں بھیجی اور وحی نازل کی۔ امام نسائی (المتوفی ۳۲۳ھ) کی اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

وكل ضلالة في النار (نسائی ج ۱ ص ۱۹۱) اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اہل بدعت کو تمام کائنات کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے، اور ان کی تعظیم و توقیر کرنے سے منع کیا ہے، اور ان کی تمام عبادات کو بے کار فرمایا ہے۔ تا وقتیکہ وہ اپنی بدعت سے باز نہ آجائیں۔ اور نیز فرمایا کہ اہل بدعت کو توبہ تک نصیب نہیں ہوتی۔ اعادنا اللہ منها ومن سائر انواع المعاصی۔

چنانچہ حضرت علیؑ، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة حرام ما بين عير الى ثور فمن احدث فيها حدثا او اوى محدثا فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين لا يقبل منه صرف ولا عدل (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۸ و بخاری ج ۲ ص ۱۰۸۲ و مسلم ج ۱ ص ۱۴۴)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ منورہ مقام غیر سے لے کر مقام ثور تک حرم ہے سو جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو، نہ تو اس کی فرضی عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفلی۔

اس حدیث میں حدود حرم کی قید محض تبیح اور تشنیع کے لئے ہے۔ یہ قید احترامی نہیں ہے کہ حرم مدینہ میں

تو بدعت بُری ہو اور خارج از حرم وہ بُری نہ ہو۔ جو چیز بدعت اور بُری ہے وہ ہر جگہ اور ہر وقت بدعت اور بُری ہی ہوگی۔ ہاں البتہ شرفِ مکان یا فضیلتِ زمان کی وجہ سے اس کی بُرائی اور قباحت اور بڑھ جانے کی بدعت اور بدعتی کی تردید اور مذمت کے لئے اس سے بڑھ کر اور سخت الفاظ کیا ہو سکتے ہیں جو جناب رؤف رحیم اور رحمتہ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبانِ پاک سے نکلے ہیں۔ بدعت کی تردید کے لئے یہ روایتیں بالکل کافی ہیں۔ صرف بطور شاہد اور اعتبار کے چند روایتیں اور بھی ملاحظہ کر لیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم
ابن الله ان يقبل عمل صاحب بدعة حتى
يدع بدعته - (ابن ماجه ص ۱۱۱)

کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو
قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تا وقتیکہ وہ اپنی بدعت
کو ترک نہ کر دے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے :

من احدث فيها حدثا
او اوعى محدثا فعليه لعنة
الله والملائكة والناس اجمعين
لا يقبل منه صرف ولا عدل.
(بخاری ص ۲۵۱)

کہ جس کسی نے مدینہ طیبہ میں بدعت گھڑی یا کسی بدعتی
کو ٹھکانا دیا تو اس پر اللہ تعالیٰ اور تمام فرشتوں اور
انسانوں کی لعنت ہو نہ تو اسکی نقلی عبادت قبول ہوگی اور نہ
فرضی بدعت جہاں بھی ہو بدعت ہی ہے ہاں مدینہ طیبہ
میں اسکے گناہ کا وزن زیادہ ہوگا کیونکہ وہ منع رشد ہدایت ہے۔

حضرت ابراہیم بن مسیرہ (المتوفی ۳۲ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من
وقر صاحب بدعة فقد اعان على هدم الاسلام
(رواه البيهقي في شعب الایمان رسلاً - مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱)

کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی بدعتی کی
تعظیم و توقیر کی، تو اس نے اسلام کو گرانے پر اس کی
مدد اور اعانت کی۔

یہی وجہ تھی کہ حضرات صحابہ کرام کو بدعت اور اہل بدعت سے انتہائی نفرت تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن
عمر (المتوفی ۳۷ھ) کے پاس ایک شخص کسی کا سلام لایا تو حضرت ابن عمر نے فرمایا :

بلغني انه قد احدث فان كان قد احدث
فلا تقره مني السلام - (ترمذی ج ۲ ص ۳۸،
دارمی ص ۵۹، ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۸، ابن ماجه ص ۱۱۱، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱)

کہ مجھے سلام بھیجنے والے کی یہ شکایت پہنچی ہے کہ اس
نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے۔ اگر واقعی اس نے کوئی
بدعت ایجاد کی ہے تو میرا سلام اس کو نہ دینا۔

حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ :

الاقتصاد في السنة احسن من الاجتهاد
سنت میں میاں روی اختیار کرنا بدعت میں گوشش

فی البدعة۔ (متدرک ج ۳ اعلیٰ شرطاً)۔ کرنے سے بہتر ہے۔

حضرت انس بن مالک (المتوفی ۳۹ھ) روایت کرتے ہیں کہ :

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله حجب التوبة عن كل صاحب بدعة۔ نے ہر بدعتی پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا ہے (اعاذنا اللہ منہا)۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ رجال الصیح غیر ہارون بن موسیٰ الفرہبی وھو ثقہ۔ مجمع الزوائد ج ۱۸۹)

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ بدعت ایسی قبیح، بُدی اور منحوس چیز ہے کہ انسان کے دل میں فطری طور پر جو نورانیت اور صلاحیت ہوتی ہے، بدعت اس کو بھی ختم کر دیتی ہے اور اس کی نحوست کا یہ اثر ہوتا ہے کہ توبہ کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ اور عقلی طور پر بھی یہ بات بالکل درست ہے اس لئے کہ جب بدعتی بدعت کو کارِ ثواب سمجھ کر کرتا ہے تو اس سے وہ توبہ کیوں کرے گا؟ توبہ تو گناہوں اور جرائم پر کی جاتی ہے نہ کہ نیکیوں پر۔ کوئی مسلمان نماز پڑھ کر اور روزہ رکھ کر یہ نہیں کہتا۔ اے اللہ! میری نماز اور روزہ سے توبہ۔ بدعتی نے توبہ کا دروازہ اپنے اوپر اسی وقت بند کر دیا ہے جس وقت کہ اُس نے بدعت کو کارِ ثواب سمجھا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ روایت کرتی ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

من احدث فی امرنا هذا ما لیس منہ فھو رد۔ جس کسی نے ہمارے اس معاملہ میں کوئی نئی بات نکالی تو وہ مردِ ہونگے

(بخاری ج ۳ واللفظہ، مسلم ج ۲ مکہ، ابوداؤد ج ۲، ابن ماجہ ص ۶۳۶ صحیح ۱۲)

نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فی امرنا هذا کی قدر سے تشریح کر دیں تاکہ کسی کوتاہ فہم کو مغالطہ پیش نہ آئے۔ حافظ ابن رجب حنبلی لکھتے ہیں :

کل من احدث فی الدین ما لھ یاذن به اللہ ورسولہ فلیس من الدین فی شیء۔ (جامع العلوم والحکم طبع مصر ص ۱۲)

جس نے دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جس کا اذن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے نہیں دیا، تو اس کا دین ہے کوئی تعلق نہیں ہے۔

علامہ موصوف یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہر احدث مردود نہیں بلکہ جو احدث فی الدین ہو

لہ حضرت نظام الدین اویار فرماتے ہیں کہ بدعت از معصیت بالاتر است کفر از بدعت بالاتر بدعت بکفر نزدیک است (فوائد الفہم وطلہ)

مردود ہے۔ نیز لکھتے ہیں کہ اسی حدیث کے بعض الفاظ میں فی امرنا ہذا کی جگہ صریح طور پر دین کا لفظ آیا ہے :

و فی بعض الفاظہ من احدث فی دیننا اور اس حدیث کے بعض الفاظ میں فی دیننا کے الفاظ آئے ہیں

مالیس منہ فہو ردّ - (ص ۴۲) یعنی جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی تو وہ مردود ہوگی

جب جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اسی روایت کے اندر دوسرے الفاظ میں

فی امرنا ہذا کی جگہ فی دیننا کے الفاظ وارد ہوئے ہیں تو پھر اس سے بڑھ کر صحیح تفسیر اور کیا ہو سکتی ہے۔

حافظ ابن حجر فی امرنا ہذا کی شرح میں لکھتے ہیں کہ :

"والمراد امر الدین" (فتح الباری ج ۵ ص ۳۲)۔ فی امرنا ہذا سے دین کا امر مراد ہے یعنی جس

نے دین کے اندر کوئی نئی چیز نکالی تو وہ مردود ہوگی۔ علامہ تفتازانی لکھتے ہیں ان المراد بذالک هو ان

یجعل فی الدین مالیس منہ... الخ (شرح المقاصد ص ۲۷)

علامہ عزیزی (المتون ص ۱۸۸) لکھتے ہیں کہ: "من احدث فی امرنا ہذا ای فی دین الاسلام"

والسراج المنیر ج ۳ ص ۳۳) یعنی فی امرنا ہذا سے "دین اسلام" مراد ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات واضح سے واضح تر ہو گئی ہے کہ بدعت اور ہر احدث بُرا اور مردود نہیں

ہے، بلکہ وہ بدعت اور وہ احدث بُرا اور مردود ہے جو دین اسلام کے اندر دین سمجھ کر کیا یا چھوڑا جائے، اور

یہ صرف شرح حدیث نے ہی نہیں کہا، بلکہ بقول ابن رجب اسی حدیث کے بعض الفاظ میں دین کی قید (فی دیننا)

خود جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لگائی ہے۔ یہ حدیث اس بات کے لئے نص صریح ہے کہ جتنی بدعتیں

لوگوں نے دین کے امور میں نکالی ہیں، وہ سب کی سب مردود ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا خرم علی صاحب الخفنی

(المتون ص ۱۸۸) مترجم مشارق الانوار لکھتے ہیں :

"جتنی بدعتیں لوگوں نے خلاف شرع نکالی ہیں، اس حدیث سے سب رد ہو گئیں۔ تفصیل کی کچھ حاجت

نہیں۔ مثلاً قبر پر گچ کرنا، گنبد بنانا، قبروں پر روشنی کرنا، تعزیر بنانا، بزرگوں کا میلہ کرنا، اولیاء کی منت

ماننا، جھنڈے نشان کھڑے کرنا سراسر دین کے خلاف ہیں۔ قرآن اور حدیث اور اجماع اور قیاس شرعی

میں ان کی کچھ اصل نہیں۔" (ترجمہ مشارق الانوار ص ۱۸۸)۔

اکابرین علماء دیوبند | اس حدیث سے اکابرین علماء دیوبند بھی یہی سمجھے ہیں کہ فی امرنا ہذا سے امرِ دین مراد ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ (المتوفی ۱۳۲۶ھ) لکھتے ہیں کہ فی امرنا ہذا سے امرِ دین مراد ہے۔ (بذل المہودج ۵ ص ۱۹۵)۔ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (المتوفی ۱۳۶۹ھ) لکھتے ہیں: "والمراد بالامر الدین كما صرحوا به" (فتح الملہم ج ۲ ص ۴۰۴)، کہ مراد اس سے امرِ دین ہے، علماء نے اس کی تصریح کی ہے۔

بریلوی عقائد کے علماء | اس حدیث کی تفسیر بریلوی حضرات نے بھی امرِ دین سے کی ہے چنانچہ مولوی محمد صالح صاحب (مشہور بریلوی عالم) لکھتے ہیں کہ "مراد امر سے امرِ دین کا ہے۔ مطلب یہ ہے، کہ امورِ دینیہ عبادات ہوں یا معاملات کہ جن کے حدود شارع نے مقرر کئے ہیں، ان میں کمی بیشی کرنا مردود ہے۔" (تحفۃ الاحباب فی تحقیق ایصال الثواب ص ۱۱۱)۔

مولوی عبدالسمیع صاحب رام پوری لکھتے ہیں کہ "یہ حدیث صحیحین کی ہے، یعنی جس نے نکالی اس دین میں وہ بات جو دین کی قسم سے نہیں یعنی کتاب اور سنت کے مخالف ہے، وہ بات اس کی رد ہے۔" (انوارِ ساطعہ ص ۳۲)

فریقِ مخالف کے مجددِ ملت اعلیٰ حضرت مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی (المتوفی ۱۳۲۴ھ) تمباکو کو حلال بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "رہا اس کا بدعت ہونا یہ کچھ باعثِ ضرر نہیں کہ یہ بدعت کھانے پینے میں ہے نہ کہ امورِ دین میں، تو اس کی حرمت ثابت کرنا ایک دشوار کام ہے۔" (احکامِ شریعت حصہ سوم ص ۱۶۸)۔ آپ نے فریقِ مخالف کے محقق اور مسلم علماء سے بھی یہ سُن لیا کہ بدعت وہی مذموم ہے، جو امورِ دین سے سمجھ کہ کی جائے۔ جس کا تعلق امورِ دین سے نہیں، اس کی حرمت ثابت کرنا ایک دشوار امر ہے۔

بدعت کی تعریف ائمہ لغت سے | قارئینِ کرام نے یہ ملاحظہ کر لیا کہ جو چیز قرآن کریم، حدیث، اجماع اور شرعی قیاس سے ثابت نہ ہو اور وہ کام جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرتِ اسوۂ حسنہ اور نمونہ کے خلاف ہو، اور وہ کام جب دین کے اندر ایجاد کیا گیا تو یقیناً بدعت ہوگا۔ اب آپ بدعت کی تعریف ائمہ لغت سے سُن لیجئے کہ وہ کیا کرتے ہیں:

مشہور امام لغت ابو الفتح ناصر بن عبدالسید المطر از می الحنفی (المتوفی ۶۱۶ھ) لکھتے ہیں کہ :

البدعة اسم من ابتداء الامر اذا ابتداء
واحدثة كالرفعة اسم من الارتفاع والخلفة
اسم من الاختلاف ثم غلب على ما هو زيادة
في الدين او نقصان منه - (مغرب ج ۱ ص ۳۰۳)۔

بدعت ابتداء کا اسم ہے جس کا معنی یہ ہے کہ کوئی نئی چیز ایجاد
کی جائے رفعت ارتفاع کا اور خلفت اختلاف کا اسم ہے۔
لیکن پھر بدعت کا لفظ ایسی چیز پر غالب آگیا، جو دین میں
زیادہ یا کم کر دی جائے۔

علامہ محمد الدین فیروز آبادی (المتوفی ۱۱۸۱ھ) لکھتے ہیں :

بدعت بالكسر الحدث في الدين بعد
الاکمال او ما سجدت بعد النبي صلى الله عليه
وسلم من الاهواء والاعمال - (قاموس ج ۲ ص ۲۰۷)

بدعت (کسرہ بار کے ساتھ) ایسی چیز کو کہا جاتا ہے، جو
تکمیل دین کے بعد نکالی گئی ہو، یا وہ چیز جو آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد عواہشات اور اعمال
کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی ہو۔

امام راغب اصفہانی (المتوفی ۵۰۳ھ) لکھتے ہیں :

والبدعة في المذهب ايراد قول لعريستن
قائلها او فاعلها فيه بصاحب الشريعة و
امثالها المتقدمة واصولها المتقنة -

مذہب میں بدعت کا اطلاق ایسے قول پر ہوتا ہے جس کا
قائل یا فاعل صاحب شریعت کے نقش قدم پر نہ چلا ہو۔
اور شریعت کی سابق مثالوں اور اس کے محکم اصولوں پر وہ
(مفردات قرآن ص ۳۷) گامزن نہ ہوا ہو۔

امام محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر الرازی (المتوفی ۵۰۰ھ) لکھتے ہیں کہ :

والبدعة - الحدث في الدين بعد الاكمال -
(مختار الصحاح ص ۲۸)

بدعت، اکمال دین کے بعد اس میں احداث کا نام ہے۔

علامہ ابو الفضل محمد بن عمر الجمال القرظی (المتوفی ۵۰۰ھ) لکھتے ہیں :

"بدعت نو بیروں آوردن رسمے در دین بعد اکمال دین" - (صراح ج ۲ ص ۳۰۳)

اردو کی مشہور لغت فیروز اللغات میں ہے :

بدعت : ۱ : دین میں کوئی نئی بات یا نئی رسم نکالنا، نیا دستور یا رسم و رواج - ۲ : سختی، ظلم۔

۲ : جھگڑا، فساد، شرارت - (فیروز اللغات ص ۱۹۴)

اور مصباح اللغات میں ہے :

البدعة : بغیر نمونہ کے بنائی ہوئی چیز۔ دین میں نئی رسم۔ وہ عقیدہ یا عمل جس کی کوئی اصل قرون

ثلاثہ مشہور رہا یا تاخیر میں نہ ملے۔ (مصباح اللغات ص ۲۷۰)۔

امام نووی بدعت کا لغوی معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ :

”کل شیء عمل علی غیر مثال سبق“ (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۸۵) یعنی ہر وہ چیز جو کسی سابق

نمونہ کے بغیر کی جائے۔

بدعت کا شرعی معنی | حافظ بدرالدین عینی الحنفی (المتوفی ۸۵۵ھ) لکھتے ہیں کہ :

بدعت اصل میں ایسی نو ایجاد چیز کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھی۔

والبدعة فی الاصل احداث امر لم یکن فی زمن رسول الله صلی الله علیه وسلم (عمدة القاری ج ۵ ص ۳۵۶)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ :

بدعت اصل میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جو بغیر کسی سابق مثال اور

نمونہ کے ایجاد کی گئی ہو۔ اور شریعت میں بدعت کا اطلاق سنت کے مقابلہ میں ہوتا ہے لہذا وہ مذموم ہی ہوگی۔

والبدعة اصلها ما احدث علی غیر مثال سابق وتطلق فی الشرع فی مقابل السنة فتكون مذمومة - (فتح الباری ج ۲ ص ۲۱۹)۔

علامہ رضی الزبیدی الحنفی (المتوفی ۱۲۰۵ھ) لکھتے ہیں :

کل محدثة بدعة (کی حدیث) کا معنی یہ ہے کہ جو چیز اصول

شریعت کے خلاف ہو اور سنت کے موافق نہ ہو۔

كل محدثة بدعة انما یوید ما خالف اصول الشریعة ولذیوافق السنة - (تاج العروس ج ۵ ص ۲۷۰)۔

حافظ ابن رجب لکھتے ہیں کہ :

بدعت سے مراد وہ چیز ہے جس کی شریعت میں کوئی اصل

نہ ہو جو اس پر دلالت کے لئے، اور بہر حال وہ چیز جس کی

والمراد بالبدعة ما احدث مما لا اصل له فی الشریعة یدل علیه واما ما كان له اصل

من الشرع يدل عليه فليس ببدعة شرعا و شرعیت میں کوئی اصل ہو جو اس پر وال ہے، تو وہ شرعا
ان کان بدعة لغة (جامع العلوم والحکم ص ۱۹۳)۔ بدعت نہیں ہے۔ اگرچہ لغتاً بدعت ہوگی۔

اور بعینہ ان الفاظ سے بدعت کی تعریف علامہ معین بن صفی (المتوفی ۸۸۹ھ) نے شرح اربعین نووی
میں کی ہے (الجذہ ص ۱۵۹)۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ :

” بدیع السموات کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ
کے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور لغت میں ہرنی چیز کو بدعت کہا جاتا ہے اور بدعت کی دو قسمیں
ہیں۔ ۱: بدعت شرعی جس کے متعلق جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کل محدثۃ
بدعة وکل بدعة ضلالة۔ کہ ہرنی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ۲: کسبی
بدعت لغوی ہوتی ہے، جیسے حضرت عمرؓ نے لوگوں کے بل کر تراویح پڑھنے کے متعلق فرمایا : نعمت
البدعة هذہ۔ یہ کیا ہی اچھی نو ایجاد ہے۔“

پھر آگے لکھتے ہیں کہ :

و كذلك كل محدث قولاً او فعلاً لم
يتقدم فيه متقدم فان العرب تسميه
مبتدعا۔ (تفسیر ص ۱۶۱)۔
اور اسی طرح ہر وہ قول یا فعل جس کو پہلے کسی نے نہ
کیا ہو، اہل عرب ایسے کام کو بدعت کہتے ہیں۔

علامہ ابواسحاق غرناطی بدعت شرعی کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ :

طريقة في الدين مختوعة تضاهي الشرعية
يقصد بالسلوك عليها المبالغة في التعبد
لله سبحانه۔ (الاعتصام ص ۱۳)۔
وہ دین کے اندر ایسا اختراع کیا جو طریقہ ہے جو شرعیت
کے مشابہ ہے اور جس پر عمل پیرا ہونے سے اللہ تعالیٰ کی
عبادت میں مبالغہ قصد کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالسمیع صاحب، حضرات فقہاء کرام سے بدعت کا معنی یہ نقل کرتے ہیں کہ علامہ شمشیری وغیرہ
محققین نے بدعت سنیہ مذمومہ کی تعریف اس طرح فرمائی ہے :

ما احدث على خلاف الحق المتلقى عن
(کہ بدعت وہ چیز ہے) جو اس حق کے خلاف ایجاد کی گئی ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من علم
 او عمل او حال بنوع شہدۃ و استحسان
 وجعلہ دینا قویما و صراطا مستقیما (انوار ساطعہ ص ۱۲۷)
 جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اخذ کیا گیا ہو، یا
 عمل یا حال اور کسی شبہ کی بنا پر اس کو اچھا سمجھ کر دین
 قویم اور صراط مستقیم بنا لیا گیا ہو۔

بدعت شرعیہ اور بدعت سیئہ کی بعینہ اسی عبارت سے بحر الرائق اور در مختار وغیرہ فقہ حنفی کی مستند
 اور معتبر کتابوں میں تعریف کی گئی ہے۔ (دیکھئے الجذہ ص ۱۶)۔

مولانا سخاوت علی صاحب الحنفی جو نپوری (المتوفی ۱۲۷۲ھ) لکھتے ہیں :

”بدعت وہ کام خواہ عقیدہ کہ دین کا ہو اور آخرت کا نفع اور ضرر اس میں سمجھتے ہو، ثابت نہ ہو
 ہو رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اور آپ کے صحابہ سے“۔ (رسالہ تقویٰ ص ۹)۔

اور نواب قطب الدین خان صاحب دہلوی الحنفی (المتوفی ۱۲۷۹ھ مؤلف مظاہر حق) لکھتے ہیں : پس بدعت اول
 نو احداث دین میں تو ہے تعزیر اور مہندی اور چھڑی مدار اور سالار کی الخ۔ (رسالہ گلزارِ جنت ص ۵۹)

فریق مخالف کے مشہور محقق عالم مولوی محمد صالح صاحب لکھتے ہیں کہ : ”اصطلاح شریعت میں بدعت
 اُس چیز کو کہتے ہیں جو امور دینیہ سے سمجھی جائے مگر کسی دلیل شرعی سے اس کا ثبوت نہ ملتا ہو، نہ کتاب سے
 نہ احادیث نبویہ سے، نہ اجتماع مجتہدین سے نہ قیاس شرعی سے“۔ تحفۃ الاحیاب ص ۹۵

اکابرین علماء دیوبند اکابرین علماء دیوبند ہر مسئلہ میں اتباع سنت کے ساتھ سلف صالحین کی
 تحقیق پر کامل اعتماد رکھتے ہیں۔ دیگر مسائل کی طرح وہ بدعت کی تعریف میں بھی سلف کی پیروی کرتے ہیں چنانچہ
 حضرت مولانا کریم بخش صاحب (المتوفی ۱۳۶۵ھ) لکھتے ہیں : اصطلاح شریعت میں بدعت ہر وہ فعل دین
 ہے جس کو قرون ثلاثہ کے اہل حق کی اکثریت نے قبول نہ کیا ہو، یا ان پاک زمانوں میں اس کو خلاف
 دین کہا گیا ہو، یا خود ان زمانوں کے بعد پیدا ہو جس میں عقیدہ غیر ضروری کو ضروری سمجھا جائے، یا
 ضروری کو غیر ضروری۔ (حقیقۃ الایمان ص ۳۸)۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ ”بدعت کہتے ہیں ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب سنت اور
 قرون مشہود لہا بالخیر میں نہ ہو، اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے“۔ (حامل شریف ص ۱۷)۔

اور حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب (المتوفی ۱۳۳۷ھ) لکھتے ہیں کہ "بدعت ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کی اصل شریعت سے ثابت نہ ہو، یعنی قرآن مجید اور احادیث شریف میں اس کا ثبوت نہ ملے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعین کے زمانہ میں اس کا وجود نہ ہو، اور اُسے دین کا کام سمجھ کر کیا یا پھوٹا جائے۔" (تعلیم الاسلام حصہ چہارم ص ۳۱)

قارئین کرام! ان ٹھوس حوالجات کو پڑھ پڑھ کر اور سن سن کر آپ یقیناً اکتا چکے ہوں گے، مگر ہم بھی مجبور ہیں۔ ہمیں ایسے حضرات سے سابقہ پڑ چکا ہے جو دین سے یقیناً بے بہرہ ہیں مگر لوگوں کے ایمان اور دین کو شبہات کی بدولت ٹوٹنے میں بڑے چُست اور ہوشیار ہیں، اور عوام بیچارے ان کے جُبوں اور قبہ نما دستاروں میں اُلجھ کر متاع ایمان گنوا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان گندم نما جو فروشوں سے محفوظ رکھے۔ ان عبارت میں آپ نے بخوبی ملاحظہ کر لیا کہ کیا دیوبندی حضرات اور کیا بریلوی اور کیا وہ اکابر علماء اُمت جو فریقین کے نزدیک مسلم ہیں۔ بدعت کی تعریف میں دین کی قید لگاتے ہیں اور علم اور عمل اور حال۔ عبادات و معاملات سب کو اس میں درج کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ جو عقیدہ یا عمل یا حال کتاب و سنت اجماع و قیاس شرعی کے تحت درج نہ ہو وہ بدعت ہے۔ دین کی اور عقیدہ کے علاوہ عمل کی خاص طور پر قید لگاتے ہیں اور حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ کی عبارت میں حضرات صحابہ کرامؓ کا ذکر بھی (کل قول و فعل لم یثبت عن الصحابة هو بدعة) گزر چکا ہے۔ اس سبب بحث کو پیش نظر رکھ کر آپ مفتی احمد یار خان صاحب بدایونیؒ تم گجراتی کی تحقیق انیق بھی ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے۔ احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدثین کے خلاف ہے۔ حدیث میں ہے کل محدثۃ بدعة (مشکوٰۃ باب الاعتصام) ہر نیا کام بدعت ہے۔ اس میں دینی یا دنیوی کی قید نہیں۔ نیز ہم اشعة اللمعات اور مرقات کی عبارتیں نقل کر چکے ہیں۔ اُس میں دینی کام کی قید نہیں لگائی۔" (جاء الحق و ذہق الباطل ص ۱۲۱)۔

نیز لکھتے ہیں کہ: "ان دونوں عبارتوں (مرقات اور اشعة اللمعات کی عبارت) میں نہ تو دینی کام کی قید ہے اور نہ زمانہ صحابہؓ کا لحاظ ہے، جو کام بھی ہو دینی ہو یا دنیوی حضور علیہ السلام کے بعد جب بھی ہوا خواہ

زمانہ صحابہ میں یا اس کے بعد، وہ بدعت ہے۔ (جاء الحق ص ۲۱)۔

مفتی صاحب کا یہ ارشاد سراسر جہالت پر مبنی ہے۔ اولاً اس لئے کہ سابق عبارات میں اس کی پوری تحقیق عرض کی جا چکی ہے کہ شرعی بدعت میں جو مذموم اور قبیح ہے، دین کی قید ملحوظ ہے بلکہ ایک روایت میں فی دیننا کے الفاظ آئے ہیں۔ وثانیاً اگر بالفرض مرقات اور اشعة اللغات کی عبارتوں میں دین کی قید اور صحابہ کرام کا ذکر نہیں تو کیا کسی اور کی عبارت میں بھی اس کا ذکر نہ ہوگا؟ لیجئے ہم مفتی صاحب کو مرقات اور اشعة اللغات سے دین کی قید بتاتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ کی ایک بدعتی کو سلام کا جواب نہ دینے کی روایت باحوالہ پہلے عرض کی جا چکی ہے۔ اس روایت میں بلغنی قد احدث کی شرح کرتے ہوئے علامہ ملا علی القاریؒ لکھتے ہیں کہ:

قد احدث ای ابتدع فی الدین ما یعنی اس نے دین میں ایسی چیز نکالی ہے، جو دین لیس منہ۔ (مرقات علی مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۱)۔ سے نہیں ہے۔

اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ: رسیدہ است مرا کہ وے احدث نموده و پیدا کرده است در دین چیزے را کہ نموده است۔ (اشعة اللغات ج ۱ ص ۲۱)

لیجئے مفتی صاحب کی منہ مانگی مراد پوری ہوگئی اور مرقات و اشعة اللغات کی عبارتوں میں دین کی قید نکل آئی۔ اب مفتی صاحب ان سے پوچھ لیں کہ انہوں نے محض اپنی طرف سے دین کی قید کیوں لگائی ہے اور احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدثین کی خلاف ورزی کیوں کی ہے؟ اسی طرح علیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدین اور ما انا علیہ و اھلبانی کی شرح میں ان دونوں بزرگوں کی عبارتیں ملاحظہ کر لیں کہ حضرات صحابہ کرام کا عمل سنت ہے یا بدعت؟ طبیعت صاف ہو جائے گی، اور اشعة اللغات کی یہ عبارت پہلے نقل کر دی گئی ہے کہ حضرات خلفاء راشدین نے اجتہاد و قیاس سے جو احکام صاؤ کئے ہیں، وہ بھی سنت ہیں: و اطلاق بدعت بر آن نتوان کرد، چنان کہ فرقہ زائغہ کند۔ مفتی احمد یار خان صاحب تو صحابہ کے عمل کو بھی الزامی طود پر بدعت کہہ کر بدعت کا پورہ دروازہ کھولتے ہیں تعجب اور حیرت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو حضرات خلفاء راشدین کے عمل کو سنت فرمائیں اور حضرات صحابہ کرام کو معیار حق

قرار دیں اور خیر القرون کے نقش قدم پر چلنے کی وصیت فرمائیں، اور مفتی احمد یار خان صاحب یہ کہیں کہ خواہ زمانہ صحابہ میں یا اس کے بعد، وہ بدعت ہے۔ وثالثاً مفتی صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے، احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدثین کے خلاف ہے۔ یہ ان کا خالص مہتان اور اقرار اور سفید جھوٹ ہے۔ دینی کام کی قید نہ تو احادیث صحیحہ کے خلاف ہے اور نہ اقوال فقہاء اور محدثین کے خلاف ہے۔ کسی ایک معتبر امام و فقیہ اور محدث عالم کا حوالہ پیش نہیں کیا جاسکتا جو یہ کہتا ہو کہ بدعت مذمومہ اور شرعی بدعت کی تعریف میں دین کی قید ملحوظ نہیں۔ فہل من مبادرہ

ستعلم لیلی ای دین تداینت

و ای غریم فی التقاضی غریہا

حضرت امام مالکؒ کا حوالہ الاعتصام سے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ابتداءً فی الاسلام کی قید لگاتے ہیں اور باقی علماء اور فقہاء و محدثین کی عبارتیں (بلکہ فریق مخالف کے محقق اور مسلم علماء کی عبارتیں بھی) عنقریب نقل کی جا چکی ہیں، اور ائمہ لغت سے بھی یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ وہ بدعت کی تعریف کرتے ہوئے دین کی قید سے بے اعتنائی اور بے پروائی نہیں کرتے اور کل محدثہ بدعت کے متعلق بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کتاب و سنت کے مقابلہ میں اس کو بیان کر کے متعین فرمادیا ہے کہ اس سے مراد شرعی بدعت ہے اور حافظ ابن کثیر اور علامہ زبیدی کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد شرعی بدعت ہے، لغوی نہیں۔ ضرورت تو نہیں کہ ہم کچھ اور عرض کریں، مگر مفتی صاحب کی خود فریبی اور مغالطہ آفرینی کے پیش نظر چند حوالجات اور سپرد قلم کئے جاتے ہیں۔

حبر اُمت ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ (المستوفی علیہ السلام) آیت فلا تقعدوا معهم

الایۃ کفی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں :

ابو شیخ عبدالحق صاحب، حضرت ابن مسعودؓ کی مرفوع روایت خط لنا الخ کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ صراط مستقیم صرف وہ ہے جس پر سلف صالحین از صحابہ و تابعین باحسان و من بعدہم براس اعتقاد و بریں طریقہ بودہ اند و اس بدع و اہوار و در مذہب

واقوال بعدہ بر اول حادثہ شہ - (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۷۷)

دخلى فى هذه الآية كل محدث فى الدين و
كل مبتدع الى يوم القيمة۔
اس آیت میں ہر وہ بدعت جو دین میں نکالی جائے اور تمام
بدعتی جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے داخل ہیں۔

(خازن ج ۱ ص ۵۰۹ و معالم بر خازن ج ۱ ص ۵۰۹)

مفتی صاحب ہمت کر کے مفسر قرآن اور بلند پایہ صحابی سے دریافت کریں کہ آپ نے فی الدین کی قید
محض اپنی طرف سے کیوں لگائی ہے۔ بدعت تو ہر نئی چیز کا نام ہے، دینی ہو یا دنیاوی؟
حضرت حسن تابعی (المتوفی بعد ۱۳۱ھ) فرماتے ہیں:

ما ابتدع قوم بدعة فى دينهم الا نزع الله
من سنتهم مثلها ثم لا يعيدها اليهم
الى يوم القيمة۔ (دارمی ص ۲۶ و مشکوٰۃ ج ۳ ص ۳۱)
کوئی قوم دین میں بدعت نہیں نکالے گی مگر اللہ تعالیٰ
اُتنی ہی مقدار میں سنت اُن سے اٹھالے گا۔ اور پھر
قیامت تک ان کو وہ سنت واپس نہ دے گا۔

حضرت حسن بھی بدعت کے ساتھ فی دینہم کی قید لگاتے ہیں اور سنت اور بدعت کا تقابل کر کے
یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ اگر سنت دینی کام ہے تو بدعت بھی دینی ہی کام کا نام ہے بلکہ حضرت غصیف
بن الحارث الثمالی (المتوفی ۱۶۵ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما
احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة
فتسك بسنة خیر من احداث بدعة۔
کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی قوم بدعت
ایجاد نہیں کرے گی مگر اسی کی مقدار میں سنت اُن سے
اُٹھالی جائے گی۔ سو سنت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت کے
ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۱۰۵ و مشکوٰۃ ج ۳ ص ۳۱)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی بدعت کا تقابل سنت سے کیا ہے۔ اگر سنت دینی کام ہے، تو
بدعت بھی دینی کام ہوگا۔ اگر بدعت دنیاوی کام ہو جیسا کہ مفتی صاحب کو دھوکا ہوا ہے تو اتحاد محل نہ رہا۔
پھر بدعت کے لئے احداث سے سنت کیسے رفع ہوگی؟

شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں کہ سنت بمعنی سیرت و طریقہ مسلوک در دین (اشعة اللمعات ج ۱ ص ۶۸) یعنی سنت کے معنی

سیرت کے اور دین میں اُس راستہ کے ہیں جس پر چلا جائے۔

علامہ سعد الدین تفتازانی (المتوفی ۷۹۲ھ) تحریر فرماتے ہیں :

ان البدعة المذمومة هو المحدث في الدين من غير ان يكون في عهد الصحابة والتابعين ولا دل عليه الدليل الشرعي (شرح المقاصد ص ۲۴۱) مذموم بدعت وہ ہے جو دین کے اندر ایجاد کی جائے۔ اور وہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین کے عہد میں نہ ہو اور نہ اس پر کوئی شرعی دلیل دلالت کرتی ہو۔

علامہ عبد العزیز فرہارویؒ رو بدعت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

هو كل ما حدث في الدين بعد زمن الصحابة بلا حجة شرعية (بنا ص ۱۷۱) بدعت ہر وہ چیز ہے جو حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانہ کے بعد بلا حجت شرعیہ دین میں نکالی جائے۔

اس سے صاف طور پر یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ جس بدعت کی مذمت کی گئی ہے وہ بقول مفتی احمد یار خان صاحب ہرنیا کام نہیں جو دینی ہو یا دنیاوی، بلکہ وہ بدعت مذموم ہے جو محدث فی الدین ہو، اور یہی بدعت حرام ہے۔ اور جو بدعت امور دین میں نہ ہو اس کی حرمت ثابت کرنا بقول خان صاحب بریلوی ایک شور نام ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی ایک مقام پر ارقام فرماتے ہیں :

”از حق تعالیٰ تضرع است کہ ہرچہ در دین محدث شدہ است و مبتدع گشتہ کہ در زمان خیر البشر و خلفاء راشدین او بودہ اگرچہ آں چیز در روشنی مثل فلق صبح بود این ضعیف را با لجمے کہ باو مستند اند گرفتار عمل نگرداناد و مفتون حسن آں مبتدع نکند و بکرمۃ سید المرسلین“ (مکتوبات حصہ سوم ص ۱۸۶ مکتوب ص ۱۸۶)

اسی مکتوب میں حضرت مجدد صاحبؒ نے حضرات خلفاء راشدین کے علاوہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا ذکر بھی کیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے لے کر فریق مخالف کے مسلم عالم مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی تک سب بدعت کے ساتھ دین کی قید لگاتے ہیں مگر مفتی احمد یار خان صاحب ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ ! کیا بعید ہے کہ وہ یہ کہہ دیں ۔

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے نا صحیح۔ نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں الغرض مذموم بدعت صرف وہ ہے جو کارِ ثواب اور دین سمجھ کر کی جائے اور اسی کی مذمت

پر حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین اور سلف صالحین کا اجماع ہے چنانچہ علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ یعنی :

اجماع السلف الصالح من الصحابة والتابعین
حضرات صحابہ کرامؓ و تابعین اور تبع تابعین وغیر ہم سلف صالحین
ومن یدلہم علی ذمہا کذلک (الاعتصام ج ۱ ص ۱۸۱)
کا اسی بدعت کی مذمت پر اجماع و اتفاق رہا ہے۔

اور اس میں دینی کام کی قید موجود ہے۔ ذبیویؒ امور اس بدعت میں ہرگز داخل نہیں ہیں بلکہ یقین سے
یکجا کہا سکتا ہے کہ وہ مکروہ تک بھی نہیں ہے جاسیکہ وہ حرام اور بدعت مذمومہ میں داخل ہوں۔ ہمارے کہنے
پر یقین نہ آئے تو آپ شیخ الاسلام ابن دقیق العید (المتوفی ۷۰۰ھ) کی سن لیجئے :

انا اذا نظرنا الی البدع المتعلقة بامور الدنیا
لمتساو البدع المتعلقة بامور الاحکام الفرعیة
ولعل البدع المتعلقة بامور الدنیا لا تکرہ
اصلاً بل کثیر منها یجزم فیہ بعدم الکراہة
واذا نظرنا الی البدع المتعلقة بالاحکام
الفرعیة لم تکن مساویة للبدع المتعلقة
باصول العقائد۔ (احکام الاحکام ج ۱ ص ۱۵۱)

ہم نے جب ان بدعتوں کو دیکھا جو امور دنیا سے متعلق ہیں
تو وہ ان بدعات کے مساوی نظر نہ آئیں جو بدعات فرعی
احکام سے متعلق ہیں اور شاید کہ وہ بدعتیں جو امور دنیا سے
متعلق ہیں بالکل مکروہ بھی نہ ہوں بلکہ ایسی بہت سی
ذبیوی بدعات کے متعلق یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مکروہ
بھی نہیں ہیں اور جب ہم نے ان بدعات کو دیکھا جو
فرعی احکام سے متعلق ہیں تو وہ ان بدعات کے مساوی
نہیں جو بدعات اصول عقائد سے متعلق ہیں۔

اس عبارت کو ذہن نشین کر لیجئے جس میں صراحت سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ بدعت عقائد میں
بھی ہوتی ہے اور اعمال میں بھی۔ دینی امور میں بھی اور ذبیوی میں بھی۔ مگر ذبیوی امور کی بدعت نہ تو حرام
ہے اور نہ مذموم، بلکہ مکروہ تک بھی نہیں۔ جو لوگ امور دنیاوی کو بدعت کی مد میں شامل کرتے ہیں، وہ
نرے جاہل ہیں۔ ہم نہیں کہتے۔ مؤلف انوار ساطعہ شرح جو اہر توحید سے نقل کرتے ہیں :

ومن الجہلۃ من یجعل کل امر لم یکن فی
ذمن اصحابہ بدعة مذمومة وان لم یقم
دلیل علی قبحہ تمسکاً بقولہ صلی اللہ علیہ

وہ لوگ جاہل ہیں جو ہر اس چیز کو جو حضرات صحابہ کرامؓ
کے زمانہ میں نہ تھی، بدعت مذمومہ قرار دیتے ہیں اگرچہ
اس کی قبحہ پر کوئی دلیل قائم نہ ہو سکی ہو، اور وہ جاہل

وسلم ایاکم ومحدثات الامور ولا یعلمون
المواد بذلك ان یجعل فی الدین ما
لیس منه - (انوار ساطعہ ص ۳۷)

دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ تم نئی نئی چیزوں سے بچو۔ اور وہ جاہل یہ نہیں
جانتے کہ محدثات الامور سے مراد یہ ہے کہ دین میں ایسی
چیز ایجاد کی جائے جو اس میں نہ ہو۔

ان تمام اقتباسات کو دیکھئے اور پھر مفتی احمد یار خان صاحب کی علمی تحقیق ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں :
"آج کل دنیا میں وہ وہ چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں جن کا خیر القرون میں نام و نشان بھی نہ تھا، اور
جن کے بغیر اب دنیاوی زندگی مشکل ہے۔ شخص ان کے استعمال پر مجبور ہے۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز، سمندری
جہاز، ٹانگہ، گھوڑا گاڑی۔ پھر خط، لفافہ، تار، ٹیلیفون، ریڈیو، لاؤڈ سپیکر وغیرہ یہ تمام چیزیں اور ان کا
استعمال بدعت ہے، اور انہیں ہر جماعت کے لوگ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ بولو دیوبندی وہابی بغیر بدعت
حسنہ کے دنیاوی زندگی گزار سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں!" (انتہی بلفظہ جار الحق وزہق الباطل ص ۱۲)

اس کی تحقیق تو اپنے مقام پر آئے گی کہ بدعت حسنہ کیا ہے اور بدعت سیئہ کیا ہے؟ مگر سابق عبارت
کو ملاحظہ کر کے مفتی صاحب کو مناسب ہے کہ وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنا محاسبہ کر لیں کہ غلطی ان
کی ہے جو ہر نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں یا دیوبندیوں اور وہابیوں کی ہے؟

میری تعمیر میں مضمحل ہے ایک صورت خرابی کی ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا

قارئین کرام! غور تو کیجئے کہ خود مفتی احمد یار خان صاحب حدیث من احدث فی امرنا هذا
مالیس منہ فہورد کا کیا معنی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "جو شخص ہمارے اس دین میں وہ عقیدے
ایجاد کرے جو کہ دین کے خلاف ہوں وہ مردود ہے۔ ہم نے ہمارے معنی عقیدے اس لئے کہے کہ دین عقائد
ہی کا نام ہے، اعمال فروع ہیں۔" (بلفظہ جار الحق ص ۲۰۷ و ص ۲۰۵)

مفتی صاحب سے دریافت کیجئے کہ آپ نے محض اپنی طرف سے احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و
فقہاء اور محدثین کے خلاف کرتے ہوئے کیوں دین کی قید لگائی ہے؟ خصوصاً جب کہ بقول آپ کے اشعۃ
اللمعات اور مرقات کی عبارتوں میں بھی دین کی قید نہیں لگائی گئی۔ فرمائیے کیا داعیہ پیش آیا ہے؟ اور

پھر یہ بھی خوب کہی کہ دین عقائد ہی کا نام ہے، اعمال فروع ہیں۔ بلاشک نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ احکام عقائد کے لحاظ سے فروع ہیں مگر اپنے مقام پر وہ ارکانِ اسلام اور اصولِ دین بھی ہیں، اور قرآن کریم اور احادیث میں نماز اور جہاد وغیرہ احکام پر صراحت کے ساتھ لفظ دین کا اطلاق کیا گیا ہے۔ بیسیوں مثالیں اس پر پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہمارا مقصد ابھی بہت وسیع ہے لہذا اشارہ ہی کافی ہے۔ الغرض عقائد ہوں یا اعمال، بدعت سب میں ہوتی ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی محض اپنی طرف اختراع مفتی صاحب نے ہا کے معنی کو صرف عقائد پر بند رکھا ہے اور اسی کی بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "ثابت ہوا کہ بدعت عقیدے کو فرمایا گیا۔"

(جہاد الحق ص ۲۰۵)۔ آگے لکھتے ہیں: بدعت اور بدعتی پر جو سخت وعیدیں احادیث میں آئی ہیں ان سے مراد بدعتِ اعتقادیہ ہی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس نے بدعتی کی تعظیم کی، اس نے اسلام کے ڈھلنے پر مدد دی یعنی بدعتِ اعتقادیہ والے کی فتاویٰ رشیدیہ جلد اول کتاب البدعات ص ۱۹ میں ہے جس حدیث میں ایسی شدید وعید ہے وہ بدعت فی العقائد ہے جیسا کہ روافض خوارج کی بدعت۔ (بلفظہ، جاء الحق وزهق الباطل ص ۲۰۵)۔

بلاشک وعید شدید ایسی ہی بدعت پر وارد ہوئی ہے جو عقائد کی بدعت ہے مگر مفتی صاحب ہی بتائیں کہ کیا علم غیب، حاضر و ناظر اور مختارِ کل اور بشریت وغیرہ کے مسائل عقائد ہیں یا محض دل لگی کا سامان ہے؟ اور کیا ایسی شدید وعید ایسی بدعتِ اعتقادیہ پر آئے گی یا نہیں؟ خیر القرون میں تو یہ عقائد کسی کے نہ تھے۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ اگر وعید شدید کا اطلاق بدعتِ اعتقادیہ پر ہوا ہے تو احکام اور فروع اور غیر اعتقادی امور پر نفس بدعت کا اطلاق ہی نہ ہو اور ان پر نفس وعید بھی نہ ہو۔ متعدد حوالے سپردِ قلم کئے گئے ہیں کہ بدعت، اعتقاد اور عمل دونوں میں ہوتی ہے۔ حافظ ابن کثیر کی عبارت میں قول و فعل کے الفاظ اور صاحبِ قاموس کی عبارت میں اہوار و اعمال کی قید اور علامہ شمنی وغیرہ محققین کی عبارت میں علم و عمل اور حال کی قید اور ابنِ دقیق العید کی عبارت میں احکام فرعیہ اور اصولِ اعتقادیہ کی قید خاص طور پر مذکور ہے۔ حافظ ابن رجب لکھتے ہیں کہ:

فکل من احدث شیئاً ونسبہ الی الدین
ولم یکن له اصل من الدین یرجع الیہ
فہو ضلالة والذین بری منه وسواء فی
ذلک الاعتقادات والاعمال والاقوال
الظاہرۃ والباطنۃ وامام واقع فی کلام
السلف من استحسن بعض البدع فانما
ذلک فی البدع اللغوۃ لا الشرعیۃ۔
جس نے بھی کوئی چیز ایجاد کی اور اس کو دین کی طرف
منسوب کیا جب کہ اس کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے
جس کی طرف وہ راجع ہو تو وہ گمراہی ہے اور دین اس
سے بری ہے برابر ہے کہ وہ ایجاد کر وہ چیز اعتقادات ہوں
یا اعمال یا اقوال ظاہرہ اور باطنہ، رہا سلف کے کلام
میں بعض بدعات کے حسن کا ثبوت تو بجا ہے۔ مگر وہ
حسی لغوی بدعات میں ہے نہ کہ شرعی بدعات میں۔
اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ :

”ولازم است اتباع سنت سنینہ اور عبادات و عادات و اعتقاد باید کرد کہ ہرچہ ضلالہ
سنت و طریقہ او است باطل است و ہرچہ پیدا کردہ اند و ہرچہ پیدا کردہ است از انچہ
بدل تغیر بہت و مخالفت ال لازم آید قولاً و عملاً و اعتقاداً ضلالت است و مردود
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احدث فی امرنا ہذا ما لیس منہ فہو
رد و فرمود کل بدعة ضلالة و گفته اند ہرگز دور ولی کہ گرفتار بدعت است نور ولایت
ورنیاید۔“ (مکتوبات شیخ ص ۱۶۰ برعاشیہ اخبار الاخیار)۔

حضرت شیخ صاحب کی اس عبارت میں ایک تویہ واضح کیا گیا ہے کہ جو چیز جناب رسول اللہ صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت کی تغیر اور مخالف ہو، وہ بدعت ضلالت اور مردود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر
نو ایجاد اور احداث مردود نہیں دینی ہو یا دنیوی۔ بلکہ وہ احداث مردود ہے جو سنت کا تغیر اور مخالف
ہو۔ دوسرا یہ امر واضح ہوا کہ عبادات، عادات اور اعتقاد تمام چیزوں میں سنت کی پیروی لازم ہے
اور اس کی مخالفت بدعت اور مردود ہے۔ تیسرا یہ امر واضح ہوا کہ کل بدعة ضلالة سے ہر نیا کام مردود نہیں
جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحب نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ بقول شیخ صاحب اس سے شرعی بدعت مراد ہے جو
سنت سنینہ کے مخالف ہو اور چوتھا یہ امر واضح ہوا کہ بدعتی میں نور ولایت کبھی نہیں آسکتا۔ اسلئے کہ نور ولایت

تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع سے حاصل ہوتا ہے اور بدعتی اس سے سراسر محروم ہوتا ہے۔
 ایک وہم اور اس کا ازالہ | ممکن ہے مفتی احمد یار خان صاحب یہ فرمادیں کہ میں نے یہ تو نہیں کہا
 کہ دین کی قید اس حدیث میں نہیں ہے، میں نے تو یہ کہا ہے کہ دینی کام کی قید محض اپنی طرف سے ہے۔
 سو اس کا جواب یہ ہے کہ پیش کردہ عبارات میں دونوں قیدیں موجود ہیں۔ دین کی قید بھی اور عمل
 کی قید بھی۔ اور یہ روشن ہو چکا ہے کہ عقیدہ ہو یا عمل، جو بھی دین میں نو ایجاد کیا جائے گا وہ باطل اور
 مردود ہے۔ اور حدیث من احدث فی امرنا هذا ما الخ مطلق ہے۔ حرف ما عقائد اعمال اور
 اقوال و خواہشات سب کو شامل ہے جیسا کہ باحوالہ عرض کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو محض عقائد پر بند
 کر دینا جیسا کہ مفتی صاحب نے کیا ہے سراسر باطل ہے بلکہ اس حدیث کے دوسرے سیاق میں صراحت
 کے ساتھ عمل کا لفظ وارد ہوا ہے۔ پختاچہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ
 علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فہورد۔ جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہماری طرف سے ثبوت
 (بخاری ج ۱ ص ۱۹۲ و مسلم ج ۲ ص ۱۷۷ و مسند احمد ج ۱ ص ۱۷۷) موجود نہیں تو وہ کام مردود ہوگا۔

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ بدعت صرف اعتقاد کا نام ہی نہیں بلکہ بدعت عملی
 بھی ہوتی ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس ارشاد میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ جس کام کے لئے
 آپ سے ثبوت موجود نہ ہو اور جس پر آپ کی مہر نہ لگی ہو وہ عمل باطل اور مردود ہوگا۔

لیجئے ہم مفتی احمد یار خان صاحب کی زبانی ان کو یہ مسئلہ منوادیتے ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ:
 ”بدعت کے شرعی معنی ہیں وہ اعتقاد یا وہ اعمال جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ
 حیات ظاہری میں نہ ہوں، بعد میں ایجاد ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بدعت شرعی دو طرح کی ہوتی بدعت
 اعتقادی اور بدعت عملی۔“ (بلفظہ جامع الحق ص ۲۰۴)

۱۔ بلکہ ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۱ کی روایت میں من صنع امرأ علی غیر امرنا فہورد کے الفاظ آئے ہیں اور یہی الفاظ
 من غیر امرنا کے مسند احمد ج ۲ ص ۱۷۷ میں بھی ہیں یعنی جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کا ہماری طرف سے ثبوت نہیں تو وہ مردود ہے

اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں کہ بدعت دو طرح کی ہوتی ہے بدعتِ اعتقادی اور بدعتِ عملی اور وعید دونوں پر وارد ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بدعتِ اعتقادی پر وعید شدید آتی ہے اور بدعتِ عملی پر نفسِ وعید وارد ہوتی۔ مگر وعید کی مد اور اس کی زد میں دونوں بدعتیں آتی ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی ایک غلطی | وہ لکھتے ہیں کہ: "اگر مان لیا جاوے کہ بدعت میں دینی کام کی قید ہے تو دینی کام اسی کو تو کہتے ہیں جس پر ثواب ملے (الٰہی ان قال) اور دنیا کا کوئی کام بھی نیتِ خیر سے کیا جاوے اس پر ثواب ملتا ہے (الٰہی ان قال) لہذا مسلمان کا ہر دنیاوی کام دینی ہے۔ اب بتاؤ کہ نیتِ خیر سے پلاؤ کھلانا بدعت ہے یا نہیں؟ (جاری الحق ص ۲۱۲)۔

اس کا فلسفہ تو مفتی صاحب ہی جانیں کہ پلاؤ کی تخصیص میں کیا حکمت مضموم ہے؟ اور اس کا راز بھی وہی جانیں کہ لوگوں کو پلاؤ کھلانے کی ترغیب کیوں دی ہے کھانے کی کیوں نہیں دی؟ مگر مفتی صاحب یہ تو بتائیں کہ کیا انہوں نے کتب فقہ اور اصول فقہ میں مباح کی تعریف بھی کہیں پڑھی ہے؟ اگر اور کتابیں نصیب نہیں ہو سکیں تو خلاصہ کیدانی ہی ملاحظہ کر لیتے۔ اور اگر وہ بھی دستیاب نہ ہو تو انوارِ ساطعہ تو پیش نظر ہی ہوگی جس سے رطب یا بس حوالے چن چن کر جاری الحق تیار کی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

"اور بعضے مباح یعنی ان کے کرنے میں نہ ثواب نہ عذاب" (بلفظہ انوارِ ساطعہ ص ۱۶۱)

لیجئے مسلمانوں کے بعض کام ایسے بھی نکل آئے جن کے کرنے میں گو عذاب بھی نہیں مگر ثواب بھی نہیں ہے بلکہ خود مفتی صاحب نے اپنے استدلال میں ایک عبارت نقل کی ہے جس میں اس کی تصریح ہے کہ مباح سے ثواب متعلق نہیں ہوتا (دیکھئے جاری الحق ص ۲۱۵) مفتی صاحب کو اس سے بڑا ثبوت اور کیا درکار ہے؟

مانتے جس کو نہ تھے لیجئے پہنچے وہاں

اہل بدعت حضرات کا ایک اصولی مغالطہ | دیگر اہل بدعت حضرات عموماً اور مولوی عبدالسمیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب خصوصاً اس مغالطہ کا شکار ہیں کہ لیس منہ سے وہ عقائد

۱۔ مباح وغیرہ کے متعلق توضیح ص ۲۶ میں لکھا ہے لایثاب ولا يعاقب علیہ۔ یعنی نہ تو اس کے کرنے میں

ثواب، نہ تاج اور نہ عذاب۔

اور اعمال مراد ہیں جو سنت اور دین کے خلاف ہوں اور مخالفت کا یہ مطلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نہی ان پر موجود ہو اور جو امور مسکوت عنہا ہیں ان کا احداث بدعت نہیں اور اگر بدعت بھی ہوں تو بدعتِ حسنہ ہوں گے۔ چنانچہ مولوی عبدالمصعب صاحب لکھتے ہیں کہ :

”پس جمیع اہل اسلام کو جاننا چاہیے کہ حدیث من احدث فی امورنا کے ذیل میں جو شارحین حدیث لکھ رہے ہیں کہ نکالنا اس چیز کا جو مخالف کتاب و سنت کے نہ ہو بُرا نہیں۔ اس کے صاف یہی معنی ہیں کہ جس چیز کی نہی کتاب اور حدیث رسول اللہ میں موجود نہیں، اس کا نکالنا بُرا نہیں۔ اور جس کی نہی موجود ہو، وہ ایجاد و احداثِ مردود ہے۔ (بلفظہ انوار ساطعہ ص ۳۷۲)

اور مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ :

”اگر اعمال بھی ہوں تو لیس منہ سے مراد وہ اعمال ہیں جو خلاف سنت یا خلاف دین ہوں۔“ (بلفظہ جوار الحق ص ۲۱۱)

الجواب : یہ ان کی اصولی غلطی اور جہالت کا بدترین مظاہرہ ہے۔ اولاً اس لئے کہ ابھی حدیث نقل کی جا چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کوئی ایسا کام کیا (لیس علیہ امرنا) جس پر ہمارا ثبوت موجود نہیں تو وہ مردود ہوگا۔ یہ تو آپ نے نہیں فرمایا کہ وہ کام مردود ہوگا (نہینا عنہ) جس پر ہماری نہی موجود ہو یا جس سے ہم نے منع کیا ہو، اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس چیز پر (باوجود اس کے کہ اُس وقت اس کا سبب اور محرک موجود تھا) آپ کی طرف سے ثبوت موجود نہ ہو تو وہ یقیناً بدعت ہوگی اگرچہ اس پر صریح نہی موجود نہ ہو۔ و ثانیاً جس چیز پر آپ کی نہی موجود ہو وہ تو ممنوع اور منہی عنہ ہوگئی۔ وہ چیز احداث اور ابتداء کی مد میں کیسے رہی؟ پھر بدعت اور احداث کو الگ بیان کرنے کی کیا ضرورت رہی حالانکہ بدعت اور احداث نہیں سے الگ چیز ہے جیسا کہ صحیح روایات اور اجماعِ اُمت سے ثابت ہے۔

و ثالثاً اگر احداث اور بدعت کی یہ تعریف ہے کہ اُس پر نہی موجود ہو تو پھر اس کی دوئیں بدعتِ حسنہ

اور بدعتِ سنیہ کیسے بنائی گئی؟ کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نہیں کے بعد بھی اس کا احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ اس میں حسن موجود ہو؟ اور اس صریح نہیں کے ہوتے ہوئے علماء اُمت یہ نہ سمجھ سکے کہ آپ کی نہیں کا اقل درجہ کراہت ہے۔ پھر بدعت کے یہ احکام کہ واجب، مندوب، حرام، مکروہ اور مباح کیسے تجویز ہوئے (دیکھئے شرح مسلم للنووی ج ۱ ص ۲۸۵ و مدخل لابن امیر الحاج ج ۲ ص ۲۵۷)۔

و سلباً یہ کہنا کہ جس چیز کی نہیں کتاب و سنت میں نہ ہو، اس کا نکالنا اور کنا برا نہیں، یہ بھی سراسر باطل اور قطعاً مردود ہے اور محدثین عظام و فقہاء کرام کے صریح ضوابط کے خلاف ہے۔ علماء اسلام نے اس کی تصریح کی ہے کہ جیسے عزائم سے خدا تعالیٰ کی بندگی اور عبادت و خوشنودی کی جاتی ہے اسی طرح رستوں سے بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی متعلق ہے اور جس طرح جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی کام کو کرنا سنت ہے اسی طرح کسی کام کو چھوڑنا بھی سنت ہے۔ لہذا آپ کے ترکِ فعل کی اتباع بھی سنت ہے اور اس کی مخالفت بدعت ہے۔ چنانچہ حضرت ملا علی نقاری اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایک حدیث شریفینا یوں پیش کرتے ہیں :

ان الله يحب ان يؤتى رخصة كما يحب ان يؤتى عزيمة (مرقات ج ۲ ص ۱۵۱ و اشعة المعاني ص ۱۲۸) من ان الله تعالى جیسے عزائم کی ادائیگی کو پسند کرتا ہے اسی طرح وہ اسکو بھی پسند کرتا ہے کہ اسکی رخصتوں پر بھی عمل کیا جائے۔ نیز حضرت ملا علی نقاری مشکوٰۃ شریف کی پہلی حدیث انما الاعمال بالنیات کی شرح میں یہ نقل کرتے ہیں :

والمتابعة كما تكون في الفعل يكون في الترك
ايضا فمن واخطب على فعل لم يفعل الشارع
فهو مبتدع (مرقات ج ۱ ص ۱۷۱)۔
کہ متابعت جیسے فعل میں ہوتی ہے اسی طرح ترک میں بھی
متابعت ہوتی ہے۔ سو جس نے کسی ایسے کام پر مواظبت
کی جو شارع نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہے۔

اور اسی موقع پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ :

”اتباع ہمچنان کہ در فعل واجب است و ترک نیز اتباع جیسے فعل میں واجب ہے اسی طرح ترک میں بھی

می باید پس آنکہ مواظبت نماید بفعل آنچه شارع نکرده
باشد مبتدع بود، کذا قال المحققون۔
اتباع ہوگی۔ سو جس نے کسی ایسے کام پر مواظبت کی
جو شارع نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہوگا۔ اسی طرح محدثین

(اشعة اللغات ج ۱ ص ۱۷۱) کرام نے فرمایا ہے۔

اور مظاہر حق ج ۱ ص ۱۹۱ میں بعینہ یہ مضمون مذکور ہے :

شرح مسند امام ابوحنیفہ میں ہے :

والا اتباع كما يكون في الفعل يكون في التروك
فمن واظب على ما لم يفعل الشارع صلى الله عليه
وسلم فهو مبتدع لشمول قوله صلى الله عليه
وسلم من عمل عملاً ليس عليه امرنا فهو رد۔
اتباع جیسے فعل میں ت اسی طرح ترک میں بھی ہے۔
سو جس نے ایسے فعل پر مواظبت کی شارع علیہ السلام
نے نہیں کیا تو وہ مبتدع ہوگا۔ کیونکہ اس کو آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ قول شامل ہے کہ جس
نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا ثبوت نہیں تو وہ مردود ہوگا۔

امام علامہ السید جمال الدین المحدث (المتوفی ۸۰۵ھ) فرماتے ہیں :

ترکہ صلی اللہ علیہ وسلم سنتہ کما ان فعلہ سنتہ۔
(مواہب لطیفہ بحث مذکور)۔ (الجنتہ ص ۱۷۱)۔
آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی چیز اور کام کو ترک کرنا
بھی سنت ہے جیسا کہ آپ کا فعل سنت ہے۔

ان تمام عبارات سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم کا کسی کام کو نہ کرنا ایسا ہی سنت ہے جیسا کہ آپ کا کسی کام کو کرنا سنت ہے۔ اور جو شخص آپ کی
اس سنت پر عمل نہیں کرتا، وہ محدثین کرام کی تصریح کے مطابق بدعتی ہوگا۔ اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں، کہ وہ
تمام کام جو اہل بدعت کرتے ہیں ان کے دوائی اور محرکات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وقت بھی موجود تھے
مگر آپ نے ان کو ترک کیا ہے اور آپ کا ان کو ترک کرنا سنت ہے اور اس کی مخالفت بدعت ہے۔

لہ الجنتہ لا صحاب السنۃ مؤلفہ مولانا عبدالغنی خان صاحب صدر مدرس مدرسہ علم شاہجہان پور جس میں آنحضرت صلی
محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی کی بلند پایہ اور گراں قدر تقریظ موجود ہے۔ اس کتاب میں جہاں بھی الجنتہ کا حوالہ آئے گا
اُس سے یہی کتاب مراد ہوگی۔ بڑی بہترین کتاب ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ دعائیں سب سے بچو، کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام دعائیں سب سے بچیں کیا کرتے تھے (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۳۸)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ:

ان رفعکم ایدیکم بدعة ما زاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی هذا یعنی الی الصدر (مسند احمد ج ۲ ص ۶۱)۔
تمہارے (اس طرح) ہاتھ اٹھانے بدعت ہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سینہ مبارک سے اوپر ہاتھ نہیں اٹھائے۔

حضرت عمارہ بن رویہ (المتوفی ۱۰۰ھ) نے بشر بن مردان کو منبر پر دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا، تو سخت لہجہ میں یوں ارشاد فرمایا کہ:

قبہ اللہ ہاتین الیدین لقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما یزید علی ان یقول ہکذا بیدہ و اشار باصبعہ المسبحة (مسلم ج ۲ ص ۲۸۴)
اللہ تعالیٰ ان دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا ناس کرے میں نے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اشارہ کی انگلی سے زیادہ اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا (اور یہ دونوں ہاتھ اٹھا رہا ہے)۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عمارہ بن رویہ تینوں جلیل القدر صحابی ہیں اور وہ ایسے امور کا سختی سے رد فرما رہے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ اور ابن عباسؓ دعائیں سب سے منع کرنے سے صرف اس لئے منع کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ نے ایسا نہیں کیا۔ اگرچہ دعا اپنے مقام پر ایک بہت بڑی عبادت ہے لیکن بقید سب سے منع ہے کہ آپ سے اور آپ کے صحابہ کرامؓ سے ایسا ثابت نہیں۔ اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دعائیں ہاتھ اٹھانے ثابت ہیں مگر صرف سینہ مبارک تک ہی، اور تم لوگ سینہ سے اوپر اٹھا کر آپ کے عمل کے خلاف کرتے ہو، لہذا یہ فعل بدعت ہے۔ اور حضرت عمارہ بن رویہؓ بشر بن مروان کے لئے قبہ اللہ الخ کے سنگین الفاظ سے صرف

لہذا یہ دعائیں صحابہ کرامؓ نے نہیں کی تھیں اور یہ اس سے مستثنیٰ ہیں دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۳۱ و قال متفق علیہ۔

اس لئے بددعا کرتے ہیں کہ آپ کے عمل پر اس نے زیادتی کی ہے جو ہر رات میں قابلِ ملامت ہے۔

غور تو کیجئے کہ کس طرح یہ اکابر آپ کے عمل پر زیادتی کو اور تغیرِ ہیئت اور کیفیت کو بدعت قرار دیتے

اور اس سے منع کرتے ہیں۔ علامہ سدید الدین کاشغری الحنفی (المتوفی فی حدود ۷۸۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

والزیادة على ثمان ركعات ليلاً وعلى اربع

رات کے وقت آٹھ رکعات سے زیادہ اور دن کے وقت

رکعات تھاراً مکروہ بالاجماع۔

چار رکعات سے زیادہ ایک سلام کے ساتھ نقلی نماز پر

(منیۃ المصلی ص ۱۰۲)

ائمہ احناف کے اجماع سے مکروہ ہے۔

اور نہر الفائق میں اس کی تصریح ہے کہ مکروہ تحریمی ہے۔ حضرات فقہار احناف نے اس کی دلیل یہ

پیش کی ہے: لعدم ورود الاثر به۔ اس لئے مکروہ ہے کہ اس کے لئے کوئی اثر اور دلیل موجود نہیں ہے

اور ملک العلماء علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی الحنفی (المتوفی ۷۸۸ھ) بعض فقہار کرام سے

نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں بکرا لان الزیادة على هذا المردوعن رسول الله صلى الله تعالى

عليه وسلم الخ (البدائع والسنائع ج ۲۹۵)۔ یعنی یہ اس لئے مکروہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ

عليه وسلم سے اس سے زیادہ مروی نہیں ہے۔ اور صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ:

ودليل الكراهة انه عليه السلام لم يزد على

ذلك ولولا الكراهة لزد تعليم الجواف (ہدایہ ج ۱ ص ۱۲)

فتاویٰ کبریٰ در مختار، فتاویٰ عجیب، فتاویٰ ابراہیم شاہی اور کنز العباد شرح اوراد میں ہے کہ:

يكره الدعاء عند ختم القرآن في شهر رمضان

وعند ختم القرآن بجماعة لان هذا الم

ينقل عن النبي صلى الله عليه وسلم و

لا عن الصحابة (بحوالہ الجند ص ۱۲)

سے ایسا کرنا منقول نہیں ہے۔

دیکھا آپ نے کہ حضرات فقہار کرام نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے

عدم فعل کو ایک مستقل قاعدہ اور ضابطہ سمجھ کر متعدد مقامات میں اس سے استدلال کیا ہے۔ مزید چند

حوالہ جات اور سن لیجئے :

الامام المحقق المدقق علی بن ابی بکر الخنقی صاحب ہدایہ (المتوفی ۳۵۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

وَمِكْرًا أَنْ يَتَنَفَّلَ بَعْدَ طُلُوعِ الْفَجْرِ بِأَكْثَرِ مَنْ
رُكْعَتِي الْفَجْرِ لِأَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمْ يَزِدْ عَلَيْهِمَا
طُلُوعِ فَجْرِ كَعَبْدِ فَجْرِ كِي دُوسْتُوں كَعِ عِلَاوَهُ كُوْنِي زَايِد (نُفْلِي)
نَمَازِ پُڑھنَا كَرُوهُ هِي۔ اِس لِي كِي كِي جَنَابِ نَبِي كَرِيْمِ صَلَّى اللهُ
تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِي بَاوِجُوْدِ نَمَازِ پَرِ حَرِيصِي هُوْنِي كِي اِس سِي
مَعِ حَرِيصَهُ عَلِي التَّمَلُّوتِ۔

(ہدایہ جلد ۱ ص ۱۵۱) زیادہ نماز نہیں پڑھی۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ شیخ الاسلام نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عدم فعل کو کراہت کی دلیل بنایا ہے حالانکہ اس موقع پر نفلی نماز کے ترک کرنے پر صاحب ہدایہ کی رائے میں کوئی صریح نہی موجود نہیں ہے۔ اور باوجود اسکے حضرات فقہاء احناف کے دلیل "صاحب ہدایہ" انکو برا اور مکروہ کہتے ہیں اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں اور اگر حدیث لا صلوة بعد الفجر الا بسجدتين (جو نصب الرأیہ ص ۲۵۵ وغیر میں ہے) صحت کے ساتھ ثابت ہو جائے تو نور علی نور ممانعت قولاً وفعلاً ثابت ہو جائے گی۔ ایک دوسرے موقع پر صاحب ہدایہ یوں لکھتے ہیں :

وَلَيْسَ فِي الْكُسُوفِ خُطْبَةٌ لِأَنَّهُ لَمْ يُنْقَلْ۔ (ہدایہ ص ۱۵۶)

صلوة کسوف میں خطبہ نہیں کیونکہ خطبہ منقول نہیں ہے۔ جو صلوة کسوف کے لیے شرط ہو جو خطبہ منقول ہے وہ ایک دم کے ازالہ کے لیے تھا۔

دیکھیے صاحب ہدایہ عدم نفل کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ نہیں فرماتے کہ آنحضرت صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے منع کیا ہے، اس لیے یہ ممنوع اور منہی عنہ ہے۔ اور ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ :

وَلَا يَتَنَفَّلُ فِي الْمَصَلِّي قَبْلَ صَلَاةِ الْعِيدِ لِأَنَّ

اور عید گاہ میں نماز عید سے پہلے نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ

النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَفْعَلْ ذَلِكَ

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود نماز پر حریص ہونے کے ایسا نہیں کیا۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ کراہت

مَعِ حَرِيصِهِ عَلِي الصَّلَاةِ ثُمَّ قِيلَ الْكِرَاهَةُ

عید گاہ کے ساتھ خاص ہے، یہ بھی کہا گیا ہے۔ اور یہ بھی

فِي الْمَصَلِّي خَاصَةٌ وَقِيلَ فِيهِ وَفِي

کہا گیا ہے کہ عید گاہ اور غیر عید گاہ دونوں میں کراہت ہوگی،

غَيْرُهُ عَامَةٌ لِأَنَّهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عید گاہ وغیر

لَمْ يَفْعَلْهُ۔ (ہدایہ جلد ۱ ص ۱۵۱)

عید گاہ دونوں میں نماز نہیں پڑھی۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ صاحب ہدایہ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عدم فعل کو حجیت اور دلیل کے طور پر پیش کیا ہے حالانکہ صراحتاً مرفوع حدیث سے نہیں اس پر پیش کرنا ایک شرارِ کفر کہ آپ نے عید گاہ میں، یا عید کے دن کسی دوسری جگہ نفل پڑھنے سے علی الخصوص منع کیا ہے۔ مؤلف انوارِ ساطعہ اور مفتی احمد یار خان صاحب کے نزدیک اس فعل کو بُرا اور مکروہ نہیں ہونا چاہیے، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نہیں اس پر موجود نہیں ہے۔

علامہ ابراہیم حلبی الحنفی (المتوفی ۱۱۵۲ھ) نے صلوٰۃ رغائب (جو رجب میں پڑھی جاتی ہے) وغیرہ کے بدعت اور مکروہ ہونے کی یہ دلیل پیش کی ہے :

ان الصحابة والتابعين و من بعدهم من
الائمة المجتهدين لم ينقل عنهم (کبیری ص ۲۳۳) سے یہ منقول نہیں ہے۔

مشہور حنفی امام احمد بن محمد جو احد الفقہاء الکبار تھے (المتوفی ۲۴۱ھ) ایک مسئلہ کی تحقیق میں یوں ارقام فرماتے ہیں :

لانها بدعة لم تنقل عن الصحابة
والتابعين - (الوقعات) یہ بدعت ہے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ سے منقول نہیں ہے۔

فقہ حنفی کی سستند ترین کتاب محیط اور فتاویٰ عالمگیری سے کون مسلمان ناواقف ہوگا؟ ان میں صراحت سے یہ لکھتا ہے :

قراءة الكافرون الى الانحر مع الجمع
مكروهة لانها بدعة لم ينقل ذلك عن
الصحابة والتابعين (عالمگیری باب الکرہات ص ۲۶۲) منقول نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی صحیح روایت نہیں پیش کی جاسکتی جس سے یہ ثابت ہو کہ صلوٰۃ رغائب پر آپ کی نہیں موجود ہے اور سورہ کافرون کو آخر تک باجمع پڑھنے سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ لیکن حضرات فقہاء احناف اس کو مکروہ بھی کہتے ہیں اور بدعت بھی۔ اور دلیل صرف اتنی ہی پیش

کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ سے منقول نہیں ہے۔ اگرچہ ان پر صریح نہیں بھی موجود نہیں ہے۔ مولوی عبدالمصعب صاحب وغیرہ کے خود ساختہ اور خود تراشیدہ قاعدہ کے رُوسے ان اشیاء کو بدعت اور مکروہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ان میں صریح نہیں موجود نہیں ہے۔ دیکھئے اب مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ ان حضرات فقہاء احناف کی بات تسلیم کرتے ہوئے اپنے حنفی ہونے کا ثبوت دیتے ہیں یا صرف اسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور۔ ان عبارات میں حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کا خصوصیت سے حضرات فقہاء احناف نے ذکر کیا ہے کہ چونکہ یہ یہ کام حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ سے منقول نہیں لہذا بدعت ہے۔ مفتی صاحب کو اپنی یہ عبارت دیکھ کر کہ بدعت وہ کام ہے جو حضور علیہ السلام کے بعد پیدا ہوا اس میں صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کا ذکر نہیں؛ (جالحق ص ۲۱۵) حق کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ خدا توفیق دے برقات اور اشعة المعات وغیرہ میں سنۃ الخلفاء الراشدين ما انا عليه واصحابی اور خیر القرون کی حدیثیں بھی بغور دیکھ لیں کہ کیا حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کی بات کو تسلیم کرنا سنت ہے یا بدعت؟ فیصلہ انہی پر ہے۔ بہار شریعت ج ۲ ص ۲۱۵ میں ہے شب قدر میں جماعت کے ساتھ نماز نفل بعض لوگ ادا کرتے ہیں فقہاء اسے ناجائز و مکروہ و بدعت کہتے ہیں اور لوگ اس بارے میں جو حدیث بیان کرتے ہیں بخبرین اسے موضوع بتاتے ہیں۔

حق بات جانتے ہیں مگر مانتے نہیں ضد ہے جناب شیخ تقدس مآب میں

بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ کی تحقیق نہایت مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ کی قدرے وضاحت کر دی جائے تاکہ کسی کوتاہ فہم اور ابلہ فریب کو اس سے غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اور اگر ہو چکی ہے تو بشرط انصاف زائل ہو جائے۔

بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ لغوی بدعت اور شرعی بدعت۔ لغوی بدعت ہر اس نوا یا بجا کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیدا ہوئی ہو، عام اس سے کہ وہ عبادت ہو یا عادت۔ اور اس کی پانچ قسمیں ہیں۔ واجب، مندوب، حرام، مکروہ، مباح۔ اور شرعی بدعت وہ ہے جو قرونِ ثلاثہ کے بعد پیدا ہوئی ہو اور اس پر قولاً فعللاً، صراحتاً اور اشارتاً کسی طرح بھی شارع کی طرف سے اجازت موجود نہ ہو۔ یہی وہ بدعت ہے جس کو بدعتِ ضلالہ اور بدعتِ قلیبہ

اور بدعتِ سیئہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور علمائے اس کی تصریح کی ہے۔ ملاحظہ ہو :

ان البدعة على قسمين بدعة لغوية و
بدعة شرعية فالقول هو المحدث مطلقاً
عادةً كانت او عبادةً وهى التى يقسمونها
الى الاقسام الخمسة والثانى وهو ما زيد
على ما شرع من حيث الطاعة بعد القرض
الزمنى الثلاثة بغير اذن من الشارع لا قولاً
ولا فعلاً ولا صريحاً ولا اشارةً وهى المراد
بالبدعة المحكوم عليها بالضلالة۔

بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک لغوی بدعت ، اور
دوسری شرعی بدعت۔ لغوی بدعت ہر نو ایجاد کا
نام ہے جو عبادت یا عادت اور اسی بدعت کی پانچ
قسمیں کی جاتی ہیں اور دوسری بدعت ہے جو طاعت
کی مد میں کسی مشروع امر پر زیادت (یا کمی) کی جائے مگر
ہو قرونِ ثلاثہ کے ختم ہونے کے بعد اور یہ زیادتی شارع
کے اذن سے نہ ہو، نہ اس پر شارع کا قول موجود ہو اور
نہ فعل نہ صراحت اور نہ اشارہ ، اور بدعتِ ضلالہ

(ترویج الجنان ص ۱۶۱ و الجنبہ ص ۱۶۱) سے یہی مراد ہے۔

بدعتِ حسنہ اور قبیحہ کی مزید بحث کے لئے ارشاد الساری ج ۳ ص ۲۴۲، عمدۃ القاری ج ۵ ص ۳۵۶
نوی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۸۵ اور مدخل ج ۲ ص ۲۵۷ وغیرہ کتابوں کی طرف مراجعت کریں۔
حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ :

والتحقیق انها ان كانت مما تندرج تحت
مستحسن فی الشرع فہی حسنة وان كانت
مما تندرج تحت مستقبح فی الشرع فہی
مستقبحة و الالفی من قسم المباح وقد
تنقسم الى الاحکام الخمسة (فتح الباری ج ۲ ص ۲۱۹)

تحقیق یہ ہے کہ اگر بدعت، شریعت کی کسی پسندیدہ دلیل
کے تحت داخل ہے تو وہ بدعت حسنہ ہوگی اور اگر وہ
شریعت کی کسی غیر پسندیدہ دلیل کے تحت داخل ہے
تو وہ بدعتِ قبیحہ ہوگی، ورنہ مباح ہوگی اور بدعت
پانچ احکام کی طرف منقسم ہے۔

اسی کے قریب قریب عبارت علامہ عینی کی ہے۔ ملاحظہ ہو عمدۃ القاری ج ۵ ص ۳۵۶۔

اب اس بات پر غور کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ مستحسن فی الشرع کیا ہے اور مستقبح فی
الشرع کیا ہے حضرت امام شافعی (المتوفی ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ :

البدعة بدعتان بدعة خالفت کتابا و سنته
 او اجماعاً و اثرًا عن بعض اصحاب رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فہذا بدعة ضلالة
 و بدعة لم تخالف شیئاً من ذلك فہذا قد
 تكون حسنة لقول عمر رضی اللہ عنہ
 بدعت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ بدعت ہے جو کتاب یا سنت
 یا اجماع یا کسی صحابی کے اثر کے مخالف ہو ایسی بدعت مگر اسی
 اور دوسری بدعت وہ ہے جو ان میں سے کسی ایک کے مخالف
 نہ ہو تو ایسی بدعت کبھی اچھی ہوتی ہے جیسے کہ حضرت عمر رضی
 اللہ عنہ نے فرمایا۔ یہ کیا ہی اچھی نوا ایجاد اور بدعت ہے۔

(موافقہ صریح المعقول ایضاً المنقول لابن تیمیہ علی منہاج السنۃ ج ۱ ص ۱۲۸)

اس کی پوری تحقیق قارئین کرام نے پڑھ لی ہے کہ مخالفت جیسے قول میں ہوتی ہے، اسی طرح فعل
 میں بھی مخالفت ہوتی ہے۔ جو کام آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود داعی و اسباب کے ترک کیا
 اور خیر القرون نے بھی اُسے ترک کیا تو وہ یقیناً بدعت اور ضلالت ہوگا۔ کیونکہ وہ کتاب و سنت اور اجماع
 خیر القرون اور قیاس صحیح کے مخالف ہے، اور جو ان میں سے کسی دلیل میں داخل ہو تو وہ کبھی اچھا ہوگا،
 جس پر ثواب ملے گا اور کبھی صرف مباح ہوگا جس پر نہ ثواب ہوگا نہ عتاب۔

قیاس کی بحث میں مجالس الا برار کا حوالہ اور مذکورہ بالا عبارتیں پیش نظر رکھ کر بدعتِ حسنہ اور
 بدعتِ سیئہ کی تعریف یوں ہوگی :- بدعتِ حسنہ وہ دینی کام جس کا مانع آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
 کے بعد زائل ہو گیا ہو، یا اس کا داعیہ، محرک اور سبب بعد کو پیش آیا ہو اور کتاب و سنت اور اجماع و
 قیاس سے اس پر روشنی پڑتی ہو اور ان میں سے کسی دلیل سے اس کا ثبوت ملتا ہو تو وہ بدعتِ حسنہ اور بالفاظ
 دیگر لغوی بدعت ہوگی جو مذموم نہیں ہے۔ علامہ ابن رجب وغیرہ کی عبارتیں نقل کی جا چکی ہیں جو اس پر
 صراحت سے دلالت کرتی ہیں۔ اور جس چیز کا محرک اور داعیہ اور سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے
 زمانہ مبارک میں موجود تھا مگر آپ نے وہ دینی کام نہیں کیا اور حضرات صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین
 نے بھی باوجود کمال عشق و محبت اور محرکات و اسباب کے نہیں کیا تو وہ کام بدعتِ قبلیہ اور بدعتِ سیئہ
 اور بدعتِ شرعیہ کہلائے گا جو ہر حالت میں مذموم اور ضلالت و گمراہی ہوگا۔ باقی غیر مجتہد کا اجتہاد خصوصاً
 اس زمانہ میں ہرگز کسی بدعت کو حسنہ نہیں قرار دے سکتا۔ چنانچہ حضرات فقہاء کرام نے اس کی تصریح کی ہے۔

”در نصاب الفقہ می آرند ہر اچھے بدعتِ حسنہ مجتہدان قرار دادہ اند ہماں صحیح است و اگر کسے دریں زمانہ چیزے بدعتِ حسنہ قرار دہد خلاف است زیرا کہ در مصعفی میگوید کہ کُلُّ بدعة ضلالة فی زماننا (انتہی) (فتاویٰ جامع الروایات - والجنہ ص ۷۱)۔ یعنی نصاب الفقہ میں ہے کہ بدعتِ حسنہ وہ ہے جس کو حضرات مجتہدین نے بدعتِ حسنہ قرار دیا ہو۔ اور اگر کوئی شخص اس زمانہ میں کسی چیز کو بدعتِ حسنہ قرار دے گا تو وہ حق کے خلاف ہے کیونکہ مصعفی میں ہے کہ ہمارے زمانہ میں ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس عبارت سے صراحت کے ساتھ یہ بات واضح ہوگئی کہ بدعتِ حسنہ صرف وہی ہوگی، جس میں حضرات مجتہدین کا اجتہاد کار فرما ہوگا، اور اجتہاد و قیاس صرف ان احکام اور مسائل میں ہی ہو سکتا ہے جو غیر منصوص ہوں اور ان کے دوائی اور اسباب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خیر القرون میں موجود نہ ہوں بلکہ بعد کو ظہور پذیر ہوئے ہوں۔ اس نئی تہذیب کے زمانہ میں جو شخص بدعت کو حسنہ قرار دیتا ہے، اس کا قول سراسر باطل اور مردود ہے۔ اور ایسی چیز کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ

اٹھا کر پھینک دو با بر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اور یہی وہ بدعت ہے جس کے متعلق حضرت مجدد الف ثانیؒ (وغیرہ) فرماتے ہیں کہ: چیزے کہ مردود باشد حسن از کجا پیدا کند۔ (مکتوبات حصہ سوم ص ۱۷) یعنی جو چیز مردود ہے وہ حسن اور خوبی کہاں سے پیدا کرے گی؟

مفتی احمد یار خان صاحب کی تعلی | مفتی احمد یار خان صاحب نے تمام بدعاتِ سینہ کو بدعاتِ حسنہ قرار دے کہ اور بزعم خود اس کا ردائی پر مرقعات اور اشعة اللغات کی مجل عبارتوں سے دلائل پیش کر کے یہ مورچہ ایسا فتح کیا کہ فاتحانہ بلکہ حاکمانہ رنگ میں یوں فرماتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دیوبندی کوئی غیر مقلد اور کوئی شرک و بدعت کی رٹ لگانے والا ان چار چیزوں (بدعت، شرک، دین اور عبادت) کی تعریف ایسی نہیں کر سکتا جس سے اس کا مذہب بچ جائے۔ آج بھی ہر دیوبندی اور ہر غیر مقلد کو اعلانِ عام ہے کہ ان کی ایسی صحیح تعریف کرو جس سے محفل میلاد حرام ہو۔ (بلفظہ، ج ۱، ص ۱۷۱)۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے کسی کام کا خیر القرون میں نہ ہونا اور اس کا ترک کرنا سنت ہے۔ اور سنت کی مخالفت بدعت بھی ہے اور گمراہی بھی۔ مفتی صاحب ہی بتائیں کہ خیر القرون میں میلاد کس نے منائی؟ فیصلہ انہی پر ہے۔ بدعت کی تعریف تو اس کتاب میں ملاحظہ کر لیں، جس سے بخوبی واضح ہو گیا کہ اکابرین علماء دیوبند کے کسی کام کو بدعت کے ساتھ دور کی نسبت بھی نہیں ہے، اور شرک اور عبادت وغیرہ کی تعریف راقم الحروف کے رسالہ گلستا توحید وغیرہ میں ملاحظہ کیجئے، اور اپنی خاص محفل میں تو خوب تعلیٰ کا اظہار کیجئے، مگر میدان میں تعلیٰ کا کوئی کام نہیں۔ آخر ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں اور بقول شیخ مصلح الدین سعدی (المتوفی ۶۹۱ھ) سے

ہر پیشہ گماں میر کہ خالی ست شاید کہ پلنگ نختہ باشد

فائدہ: یہ تحقیق ان حضرات کے نظریہ کے مطابق ہے جو بدعت کی تقسیم کے قائل ہیں، اور جو حضرات اس تقسیم کے قائل نہیں (مثلاً حضرت مجدد الف ثانی وغیرہ) تو وہ بدعتِ حسنہ کو سنت میں داخل کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نزاع صرف لفظی ہو گا جیسا کہ متفق نہیں ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالمصعب صاحب لکھتے ہیں:

”یہ کہ (جو) بدعت کی تقسیم نہیں کرتے وہ بدعتِ حسنہ کو سنت میں داخل کرتے ہیں پس بدعتِ حسنہ کا لفظ وہی کہے گا جو تقسیم بدعت کا قائل ہو گا۔ اور جو تقسیم کا قائل نہ ہو گا وہ بدعتِ حسنہ کو سنت کہے گا۔“ (انوار ساطعہ ص ۴۵)

باب سوم

بدعات کے جواز پر جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں

اُن پر ایک نظر

دیگر اہل بدعت حضرات عموماً اور مفتی احمد یار خان صاحب خصوصاً لا تسئلوا عن اشیاء (الآیة) اور قُلْ لَا اِجْدُ فِيهَا اَوْحٰی اِلٰی مَحْرَمًا (الآیة) نقل کر کے لکھتے ہیں۔ "نیز فرماتے قُلْ مَا حَرَّمَ (اطل میں مَنْ حَرَّمَ ہے) زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِي اَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (الآیة) ان آیات سے معلوم ہوا کہ حرمت کی دلیل نہ ملنا حلال ہونے کی دلیل ہے نہ کہ حرام ہونے کی۔ یہ حضرات اس سے حرمت ثابت کرتے ہیں الخ" (جوار الحق ص ۲۱۹)۔ ان آیات سے بدعات کے جواز پر تو ہرگز ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا جیسا کہ ظاہر ہے۔ مگر مرکزی نقطہ ان آیات سے اباحت کا سمجھا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔

کیا اصل اشیاء میں اباحت ہے؟ اکثر مبتدعین حضرات بدعات کے جواز پر ان آیات سے

غلط مفہوم اخذ کر کے یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ چونکہ اصل اشیاء میں اباحت ہے اس لئے یہ کام جائز اور مُباح ہیں، اور اسی قاعدہ پر وہ بے شمار بدعات کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ چنانچہ مولوی عبد الباقی صاحب چند احادیث کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ ان احادیث سے علماء نے ایک اصل عظیم پیدا کی ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے۔ (انوارِ ساطعہ ص ۳)۔ اور مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں "ہدایت ضروریہ جو حضرات کہ ہر بدعت یعنی کام کو حرام جانتے ہیں وہ اس قاعدہ کلیہ کے کیا معنی کریں گے کہ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ"۔ تمام چیزوں کی اصل یہ ہے کہ وہ مُباح ہیں یعنی ہر چیز مباح اور حلال ہے۔" پھر

آگے شامی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: المختاران الاصل الاباحة عند الجمهور من الحنفية والشافعية۔ جمہور حنفی اور شافعی کے نزدیک یہ ہی مسئلہ ہے کہ اصل مباح ہوتا ہے۔ (جبار الحق ص ۳۱۸ و راجع ص ۳)۔

جواب: قطع نظر اس سے کہ بعض محققین کے نزدیک قاعدہ کلیہ صرف یہ ہے ان لا کلیة اور اس سے بھی صرف نظر کر لیجئے کہ ہر بدعت حرام ہی نہیں ہوتی بلکہ بعض بدعتیں مکروہ بھی ہوتی ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ اباحتِ اصلیہ کا کیا مفہوم ہے اور احادیث سے اس پر کیا روشنی پڑتی ہے؟ اور کیا یہ قاعدہ حضرات فقہاء کرامؒ کا اتفافی اور طے شدہ ہے یا اس میں بھی اختلاف ہے؟ اور راجح مسلک کے رو سے یہ کس گروہ کا مسلک ہے؟ اور یہ اختلاف درود و شرع سے قبل کا ہے یا بعد کا؟ نہایت متانت اور سنجیدگی سے ان امور پر غور کرنا ہے۔ اولاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الامر
ثلثة امر بين سر شد لا فاتبعه و امر
بين غيبه فاجتنبه و امر اختلف فيه
فكله الى الله عز وجل۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کام
تین قسم کے ہیں ایک وہ کہ اس کا ہدایت ہونا واضح ہو سو
اسکی اتباع کرو اور دوسرا وہ کام ہے کہ اسکی گمراہی ظاہر ہو
سو اس سے اجتناب کرو۔ اور تیسرا وہ جس میں اشتباہ
واقع ہو سو اس کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کرو۔

(دراہ احمد - مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۱)

اس روایت کے آخری جملہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جس معاملہ کا حکم مخفی ہو اور اس میں اشتباہ ہو تو ایسے معاملہ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر کے اُس میں توقف کرنا چاہیے، نہ یہ کہ اس کے ساتھ مباح کا سا معاملہ ہو۔ چنانچہ علامہ طیبی الحنفیؒ (المتوفی ۱۰۲۳ھ) لکھتے ہیں:

وما لم يثبت حكمه بالشرع فلا تقل
فيه شيئاً وقوض امره الى الله۔

کہ جس چیز کا حکم شرع سے ثابت نہ ہو تو اس میں تم
کچھ بھی نہ کہو اور اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو۔

اور حضرت شیخ عبدالحق صاحب فکله الى الله کی شرح میں لکھتے ہیں:

پس بسیار اور انجا و توقف کن در آل - و اس کو تم خدا تعالیٰ کے حوالے کرو، اور

(اشعة اللمعات ج ۱ ص ۹) اس میں توقف کرو۔

اس حدیث اور اس کی شرح سے بخوبی علم ہو گیا کہ جس چیز کا حکم شرع سے ثابت نہ ہو اس میں توقف کیا جائے گا اور اس کا معاملہ خدا تعالیٰ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ نہ یہ کہ اس کو مباح سمجھ کر اس پر بواز کا فتویٰ صادر کیا جائے گا۔ اور حضرت ابو ثعلبہ الخشنی (المتوفی ۳۵ھ) کی وہ روایت بھی اسی توقف کی دلیل ہے جس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

ان الله فرض فرائض فلا تضيعوها و
 حرم حرما ت فلا تنتهكوها وحد حردا
 فلا تعتدوها وسكت عن اشياء من
 غير نسيان فلا تبحثوا عنها۔
 ان الله تعالیٰ نے کچھ فرائض متعین فرمائے ہیں۔ سو ان کو
 مت ضائع کرو۔ اور کچھ چیزوں کو حرام کر دیا ہے سو ان
 کی پردہ درسی مت کرو۔ اور کچھ حدود مقرر کئے ہیں سو
 ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے بغیر

(رواه الدارقطنی - مشکوٰۃ ج ۳ ص ۳۲) نسیان کے سکوت کیا ہے سو ان سے بحث نہ کرو۔

یہ روایت بھی توقف کی دلیل ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ باقی رہی وہاں سکت عنہ فہو مہتا عفا عنہ
 تو اس حدیث سے بھی توقف ہی مراد ہے۔ اس سے اباحت کا اثبات درست نہیں ہے کہہ لانا یخفی۔
 مشہور امام علاء الدین محمد بن علی الخصکفی الخنفی (المتوفی ۸۸۰ھ) لکھتے ہیں :

علی ما هو المنصور من ان الاصل فی
 الاشياء التوقف۔ (در مختار ج ۱ ص ۱۷)
 یعنی منصور مسلک یہ ہے کہ اصل اشیا میں
 توقف ہے۔

اور طوابع الانوار حاشیہ در مختار میں اسی موقع پر ہے :

علی ما هو المنصور ای المؤمن بالادلة
 القویة من ان الاصل فی الاشياء التوقف
 فلا يعرف اباحة المباح الا بقوله وفعله
 علیہ الصلوة والسلام۔
 یعنی جس مسلک کی تائید قوی دلائل سے ہوتی ہے، وہ
 یہ ہے کہ اصل اشیا میں توقف ہے۔ سو مباح کی
 اباحت بھی جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے
 قول و فعل کے سوا معلوم نہیں ہو سکتی۔

اور یہی مضمون اس موقع پر طحاوی حاشیہ در مختار میں بھی ہے۔

اور تعلیقاتِ شرح منار میں ہے :

اور پھر اے اصحاب فرماتے ہیں کہ اصل اشیار میں توقف ہے اور اس باب میں میرے نزدیک یہی صحیح ترین قول ہے کیونکہ جس چیز کے بارے میں شریعت کی طرف سے سکوت ہو اس میں توقف ہی اصل تنزیہی ہے اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اور ان جیسے دیگر جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ کا یہی مذہب ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ اصل افعال میں حرمت ہے اور یہی حضرت علیؓ اور حضرت آمنہ اہل بیتؓ اور اہل کوفہ کا مسک ہے اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔

قال اصحابنا الاصل فيها التوقف الخ هذا اصح شيء عندى في هذا الباب لان التوقف اصل التقوى في الامور المسكوت عنه وهو مذهب ابى بكر وعمر وعثمان و اشباههم من الصحابة والصحيح ان الاصل في الافعال التحريم وهو مذهب على وائمة اهل البيت ومذهب الكوفيين منهم ابوحنيفة - (بحوالہ الجذہ ص ۱۶۵)

یجئے اس عبارت نے یہ آشکارا کر دیا کہ حضرات خلفاء راشدینؓ میں سے تین حضرات اور اسی طرح دیگر جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ کا یہ مسک ہے کہ اصل اشیار میں توقف ہے اور حضرت علیؓ اور اہل کوفہ کا صحیح میں خصوصیت سے حضرت امام ابوحنیفہؒ بھی شامل ہیں، یہ مسک ہے کہ اصل اشیار میں حرمت ہے۔

اور شیخ احمد المعروف بملاجیون الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۱۳ھ) لکھتے ہیں :

کہ اصل اشیار میں اباحت ہے جیسا کہ ایک گروہ کا مسک ہے، جمہور اس کے مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اصل اشیار میں حرمت ہے اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اصل اشیا میں بہر حال حرمت ہے۔

ان الاصل في الاشياء الاباحة كما هو مذهب طائفة بخلاف الجدهور فان عندهم الاصل هو الحرمة الى ان قال وعند الشافعي الاصل هو الحرمة في كل حال - (تفسیر احمدی ص ۱۶۵)

اور مشہور اصولی اور محقق عالم ملاحب اللہ بہاری الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۱۳ھ) لکھتے ہیں :

اباحت حکم شرعی ہے کیونکہ اباحت شرع کا خطاب ہے جس میں کرنے اور نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

الاباحة حكم شرعى لانه خطاب الشرع تبييناً - (مسلم الثبوت ص ۱۶۵)

اور علامہ ابن رشدؒ لکھتے ہیں :

وَمُخْتَرَفِيهِ وَهُوَ الْمَبَاحُ (بداية المجتهد ج ۱ ص ۱۷۰)۔
 اور ملامبیین شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ :
 المباحها اذن الشارع بالتخيير بين فعله
 وتروكه۔
 جس کے کرنے نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے ، وہ مباح ہے۔
 مباح وہ ہے جس میں شارع نے اس کے کرنے اور نہ
 کرنے میں اختیار دیا ہو۔

امام محمد بن محمد الغزالی (المتوفى ۵۰۵ھ) لکھتے ہیں کہ :

وحد المباح انه الذي ورد الاذن من
 الله تعالى بفعله وتركه غير مقرون بدم
 قاعله ومدحه ولا بدم تاركه و
 مدحه۔ (المستصفى ج ۱ ص ۱۷۰)۔
 مباح کی تعریف یہ ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے
 اس کے کرنے اور چھوڑنے کا اذن دیا گیا ہو۔ نہ تو اس
 کے کرنے والے کی مذمت اور تعریف ہو، اور نہ چھوڑنے
 والے کی مذمت اور تعریف کی گئی ہو۔

ان تمام عبارات سے یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ مباح بھی ایک شرعی حکم ہے جس کے کرنے اور
 نہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے۔ اور کسی مباح کی اباحت جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے
 قول و فعل کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بعض نے اصل اشیا میں اباحت تسلیم کی ہے لیکن جہور کا مسلک
 اس کے خلاف ہے۔ حضرت علیؑ اور حضرات ائمہ اہل بیتؑ اور کوفہ کے فقہاء و محدثین اور خاص طور پر حضرت
 امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ اصل اشیا میں حرمت کے قائل ہیں اور باقی جہور اصل اشیا میں توقف کے
 قائل ہیں بلکہ صاحب دَرِّ مَحْتَار نے صاف لکھا ہے کہ :

الصحيح من مذهب اهل السنة ان الاصل
 في الاشياء التوقف والاباحة دأى
 المعتزلة۔ (دَرِّ مَحْتَارِ مَجْتَبَايَ ج ۱ ص ۳۲۵)۔
 اہل سنت و الجماعت کا صحیح مذہب یہ ہے کہ اصل اشیا
 میں توقف ہے اور اباحت کا قول معتزلہ کا خیال اور
 رائے ہے۔

مفتی صاحب تو دوسروں سے اس قاعدہ کا معنی دریافت کرتے تھے مگر اس عبارت سے کوسمانے رکھ کر
 انہیں سوچنا چاہیے کہ اباحت کس کا مسلک ہے اور اس کے اختلافی ہونے میں تو شاید ہی کوئی کوڑمغز شک
 اور شبہ کرے گا۔ جب اصل ہی متفق علیہ نہیں تو اس پر قیاس کی دیوار رکھنا اور اس پر بدعات کی عمارت

کھڑی کرنا کیسے صحیح ہوگا؟ علاوہ بریں جو علماء اباحت کے قائل ہیں وہ بھی اموال اور نفوس میں فرق کرتے ہیں۔ چنانچہ ملا محبت اللہ صاحب اپنی بے نظیر اور دقیق کتاب میں فرماتے ہیں :

و اما الخلاف المذكور بين اهل السنة ان اصل
الافعال الاباحه كما هو مختار اكثر الحنفية
والشافعية او اصلها الحظر كما ذهب
اليه غيرهم وقال صدق الاسلام الاباحه في
الاموال والحظر في النفس (المستتم الثبوت صلح)

بہر حال اہل سنت و الجماعت کے درمیان جو اختلاف مذکور ہے کہ اصل اشیا اور افعال میں اباحت ہے جیسا کہ اکثر حنفیہ اور شافعیہ کا مختار مسلک ہے، یا اصل ان میں منع ہے جیسا کہ دوسرے علماء کا مسلک ہے۔ امام صدق الاسلام نے یوں تطبیق دی ہے کہ اموال میں اباحت اور نفوس میں حظر اور منع اصل ہے۔

اس عبارت سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اہل سنت و الجماعت کا آپس میں اختلاف محض اباحت اور توقف تک ہی محدود نہیں بلکہ اباحت اور حظر و منع کا اختلاف بھی ہے۔ اگر ایک گروہ اشیا اور افعال کو اصل میں مباح کہتا ہے تو دوسرا ان کو اصل میں ممنوع اور مخطور ٹھہراتا ہے اور امام صدق الاسلام اموال اور نفوس میں فرق کرتے ہوئے اول کو اصل میں مباح اور ثانی کو مخطور اور ممنوع قرار دیتے ہیں۔

و ثانیاً جو حضرات اباحت اصلیہ کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے کلام کے نتیجے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اصول امور تعبدیہ کے لئے نہیں بلکہ امور عادیہ کے لئے ہے۔ بالفاظ دیگر وہ معاملات میں تو اس قاعدہ کو قابل عمل بناتے ہیں لیکن عبادات میں اس پر عمل نہیں کرتے۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر شخص کو نئی نئی عبادات کے ایجاد کرنے کا حق ہوگا اور وہ ایجاد کردہ عبادت میں اسی اصول پر مباح اور درست ٹھہریں گی۔ مثلاً فرض کیجئے کہ کوئی بدعت پسند پانچ نمازوں کے علاوہ ایک چھٹی نماز ایجاد کرنے اور اس کی ہر رکعت میں دو دو رکوع اور چار چار سجدے ایجاد کرے تو کیا اس اباحت اصلیہ کے قانون سے اس نو ایجاد نماز کو بھی جائز کہا جائے گا؟ الغرض اباحت اصلیہ کے قانون کو عبادت میں جاری کرنا سراسر جہالت ہے۔ چنانچہ علامہ ابو اسحاق شاطبی غرناطی (المتوفی ۳۹۰ھ) لکھتے ہیں کہ :

ولا يصح ان يقال فيما فيه تعبد انه مختلف
فيه على قولين هل هو على المنع ام هو على
امور تعبدية کے متعلق یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی اختلاف ہے کہ آیا یہ ممنوع الاصل ہیں یا مباح الاصل۔

الاجابة بل هو امر زائد على المنع لان
التعدييات انما وضع الشارع فلا يقال في
صلوة سادسة مثلاً انها على الاجابة فلم يكلف
وضعها على احد القولين ليتعبد بها لله
لانه باطل باطلاق - (الاعتصام ج اصل)
اور علامہ عبدالرحمن بن احمد بن رجب الحنبلی (المتوفی ۷۹۵ھ) لکھتے ہیں :

وان كان قد زاد في العمل المشرع ما
ليس بمشروع فزيادته مردودا عليه بمعنى -
انها لا تكون قرينة ولا ثياب عليها ولكن
تاتر بيبطل بها العمل من اصله فيكون
مردوداً كمن زاد ركعة عمداً في صلاة
مثلاً وتاتر لا يبطله ولا يرداه من اصله
كمن توضعاً اربعا اربعا -

(جامع العلوم والحكم ص ۲۳)

کے (مگر ایسا شخص ثواب کا اہل نہ ہوگا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس عمل مشروع کا فعل یا ترک کی صورت میں شریعت نے ایک معیار قائم کر
دیا ہے تو اس میں اپنی مرضی اور خواہش سے کوئی کمی یا زیادتی کرنا مردود ہوگا۔ اور اس زیادتی کی وجہ سے
کبھی تو سرے سے سارا عمل ہی مردود ہو جائے گا۔ اور کبھی بایں طور مردود ہوگا کہ اس پر ثواب نہ ملے گا۔
اور وہ قربت اور عبادت نہ ہوگا۔

و ثالثاً حضرت فقہار کرام کا یہ اختلاف کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے یا حظر اور توقف،
تو یہ مردود شرع سے قبل کا معاملہ ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دنیا میں مبعوث ہونے سے قبل

ایک گروہ اشیار و افعال میں اباحت کا قائل ہے اور ایک حرمت و حظر یا توقّف کا (باستثنائے کفر کے کہ وہ ہر زمانہ میں حرام ہی رہا ہے) بالفاظ دیگر یہ اختلاف ہماری شریعت سے پہلے کا ہے نہ کہ شریعت کے اجراء کے بعد کا۔ شریعت نازل ہو چکنے کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اصل اشیا میں اباحت ہے یا حرمت و حظر یا توقّف۔ کیونکہ ہر عبادت اور ہر معاملہ کی شریعت مطہرہ نے حدود اور قیود متعین کر دی ہیں ان میں کمی و بیشی اور پس و پیش کرنا ہرگز صحیح اور درست نہیں ہے۔ لہذا اباحتِ اصلیہ کا قول بھی مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کو مفید نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ عبد العلی محرم العلوم الحنفی (المتوفی ۱۲۲۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

بظہر من تتبع کلامہم ان الخلاف قبل
 علماء کے کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف
 ورود الشرع۔ ورود شرع سے قبل کا ہے۔

نیز وہ اسی مسئلہ کی محققانہ بحث کرتے ہوئے ایک علمی تمہید کے بعد فرماتے ہیں:

فاذا لیس الخلاف الا فی زمان الفتوة
 الذی اندرست فیہ الشرعۃ بتقصیر من
 قبلہم وحاصلہ ان الذین جاؤ بعد اندراس
 الشرعۃ وجہل الاحکام فاما جہلہم هذا
 یكون عذراً فیعامل مع الافعال کلہا معاملة
 المباح اعنی لا یؤخذ بالفعل ولا بالتروک
 کما فی المباح وذهب الیہ اکثر الحنفیة
 والشافعیة الی ان قال وانما هذا الی القول
 بالاباحت الاصلیة بناء علی زمان الفتوة قبل
 شریعتنا یعنی اذلا اباحت حقیقہ بل معنی
 نفی الحرج ولعل المراد من الافعال ما عدا
 الکفر ونحوہ فان حرمتہما فی کل شرع

اس تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اختلاف زمانہ فتورہ کے بارے
 میں ہے جس میں پہلے لوگوں کی کوتاہی کی وجہ سے شریعت
 مٹ چکی تھی اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جو شریعت
 کے مٹ جانے کے بعد آئے اور احکام سے ان کو واقفیت نہ رہی
 تو ان کا جہل تصور ہوگا اور سب افعال کے ساتھ مباح کا
 معاملہ کیا جائے گا یعنی نہ فعل پر ان کا مواخذہ ہوگا اور نہ
 ترک پر، جیسا کہ مباح کا حکم ہے اور یہی اکثر حنفیہ اور شافعیہ
 کا مسلک ہے۔ (پھر آگے فرمایا) اور یہ بات یعنی اباحتِ اصلیہ
 کا قول ہماری شریعت سے قبل زمانہ فتورہ پر مجہول ہے۔
 اور اباحت بھی بایں معنی کہ حرج کوئی نہ ہوگا اور شاید کہ
 مراد افعال سے کفر وغیرہ کے علاوہ ہے۔ کیونکہ کفر وغیرہ کی
 حرمت ہر ایک شریعت میں واضح اور غیر مبہم طور پر بیان

بَيِّنٌ ظَهْرًا تَامًّا - (فوائح السموات ج ۱ ص ۵۰، ۵۱) کی گئی ہے۔

اس عبارت سے یہ معاملہ بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ اکثر حضرات شافعیہ اور حنفیہ کا اباحتِ اصلیہ کے بارے میں جو مختار قول ہے وہ ورودِ شرع سے قبل کے متعلق ہے۔ ورودِ شرع کے بعد وہ اباحتِ اصلیہ کے ہرگز قابل نہیں ہیں۔ اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب البدائع والصنائح میں اور خاص طور پر تلویح و شرح تلویح میں اس کی تصریح کی ہے کہ یہ اختلاف قبل البعثت کا ہے۔ قبل الشرع اور قبل البعثت کے الفاظ خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔ الحاصل: اشیاء میں اباحتِ اصلیہ کا قول حضرات فقہاء کرام کا متفق علیہ قول نہیں بلکہ بقول صاحب درمختار یہ معتزلہ کا مذہب ہے، اہل السنۃ کا نہیں اور اہل السنۃ میں بھی بہت سے علماء کا قول توقف بلکہ حذر بلکہ حرمت کا ہے۔ اور وہ بھی عبادات سے نہیں بلکہ معاملات سے متعلق ہے پھر اباحتِ اصلیہ کا قول ورودِ شرع سے قبل کا ہے بعد کا نہیں۔ لہذا اس سے استدلال کر کے بدعات کی تردیح کرنا جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کہتے ہیں، دینِ اسلام سے اعلیٰ درجہ کی خیانت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک مسلمان کو اس سے بچائے۔ مگر مفتی صاحب اور ان کی پارٹی کو اس سے کیا تعلق؟ ان کا تو اپنا کام بنتا رہے، اسلام بگڑے یا سنورے۔ بقول اکبر الہ آبادی مرحوم سے

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

مَنْ سَنَّ سُنَّةَ حَسَنَةً سَيُرَىٰ بِهَا بِرًا لِّأَبِيهِ لَوْ أَنَّ فَاتِمَةَ كَتَبَتْ لِرَبِّهَا مِثْلَ حَبِّ الْأَبْتَرِ

پراس روایت کو بطور دلیل پیش کیا کرتے ہیں۔ لہذا مناسب ہے کہ اس کو نقل کر کے اس کا جواب بھی دیا جائے

حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ (ترجمہ مولوی عبد السمیع صاحب کا ہے)

مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَعَسَىٰ أَن يَكُونَ لَهَا أَجْرٌ مِّنْ عَمَلِ بَنِي آدَمَ مَا كَسَبَ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أَجْرِهِمْ شَيْئًا

کہ جس نے جاری کیا اسلام میں طریقہ نیک پھر اس کے بعد اس طریقہ حسنہ پر عمل کیا گیا تو لکھا جاوے گا اس شخص کے واسطے اس قدر اجر اور ثواب کہ جتنی سب عمل کرنے والوں کو اس کے بعد ہوگا اور ان لوگوں کے ثواب میں کچھ کاٹ کر اس کو نہ دیں گے (انوار الساطع ص ۷۷)

جواب: اس روایت بدعات کی تردیح اور ان کے جواز پر استدلال کرنا باطل اور مردود ہے۔

اولاً اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہ (دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳) اور حضرت عبداللہ بن عباس (ملاحظہ ہو ہامش مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳) اور حضرت غصیف بن الحارث الثمالی (دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳) کی روایتوں میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من تمسک بسنتی جس نے میری سنت سے تمسک کیا اور مضبوطی سے اس کو پکڑا، اور فرمایا: فتتمسک بسنتہ خیر الخ کہ سنت کے ساتھ تمسک کرنا بہتر ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ امتی کا کام سنت پر چلنا اور اس سے تمسک کرنا ہے، سنت جاری کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ رہا حضرات خلفاء راشدین اور دیگر حضرات صحابہ کرام اور خیر القرون کا معاملہ، تو محل نزاع سے خارج ہے، اور اس کی پوری بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وثانیاً خود اسی روایت میں من سن فی الاسلام الخ کے بجائے یہ الفاظ بھی آئے ہیں ایما داع دعا الی ہدی کہ جس داعی نے ہدایت کی طرف دعوت دی (مسلم ج ۲ ص ۳۲۱ و ابن ماجہ ص ۱۹۱ و مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۶۸) اور اسی روایت کے دوسرے طریق میں ہے:

من احیا سنتہ من سنتی قد اُمیتت بعدی (ابن ماجہ ص ۱۹۱، ترمذی ج ۲ ص ۹۲، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳) کہ جس نے میری کسی ایسی سنت کو زندہ کیا جو میرے بعد مُردہ ہو چکی تھی۔

اور ایک روایت میں یوں آتا ہے:

من احیا سنتہ من سنتی فعمل بہا الناس - الحدیث - (ابن ماجہ ص ۱۹۱) کہ جس نے میری سنتوں میں سے کوئی سنت زندہ کی کہ لوگ اس پر عمل پیرا ہوں۔

اور نیز فرمایا:

من اسہ تن خیراً (ابن ماجہ ص ۱۹۱) کہ جو شخص کسی اچھے راستہ پر چلا۔

اور ایک روایت میں ہے:

من علم علما فله اجر من عمل بہ لا ینقص من اجر العامل (ابن ماجہ ص ۱۹۱) جس نے کوئی علم سیکھ لیا تو اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا عمل کرنے والے کو اور اس کے اجر میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔

ان روایات سے اس محل روایت کی تفصیل اور تشریح ہو جاتی ہے کہ سنت اور طریقہ کا جاری کرنا مراد

نہیں ہے بلکہ اس کی طرف دعوت دینا، اس کی تعلیم دینا، اس کو زندہ کرنا اور خود اس پر عمل کرنا اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی تلقین کرنا مراد ہے۔ اس سے یہ مطلب سمجھنا اور مراد لینا کہ از خود کسی سنت کو جاری کرنا ہے یقیناً غلط ہے اور ان روایات کی صریح خلاف ورزی ہے۔

و ثالثاً اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ جس چیز کا شریعت میں دلالت و اشارہ ثبوت موجود ہو، اس کے اجراء کرنے میں ثواب ہوگا، اور وہ وہی فعل ہوگا جس کا داسیہ اور محرک خیر القرون میں موجود نہ ہو بلکہ بعد کو پیش آیا ہو اور ادلہ اربعہ میں سے کسی دلیل کے تحت وہ داخل ہو۔ چنانچہ اسی حدیث میں حسنہ کی قید موجود ہے اور اہل سنت کے نزدیک کسی امر شرعی میں حسن یا قبح نہیں پایا جاسکتا جب تک کہ شریعت سے اس کا ثبوت نہ ہو۔ اور بدعات کی تو شریعت نے بڑا کاٹ کر رکھ دی ہے، اس سے بھلا ان کا حسن ہونا کہاں سے اور کیسے ثابت ہوگا؟ الغرض اس روایت سے بدعات کے جواز پر استدلال کرنا محض جہالت اور شریعتِ مطہرہ سے خالص بغاوت ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کی ایک اور غلطی | اکثر اہل بدعت ہر قسم کی بدعات کے جواز پر ایک حدیث پیش کیا کرتے ہیں جس کو مفتی احمد یار خان صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

وقال عليه السلام ما رآه المسلمون حسناً
فهو عند الله حسن - (بخاری الحق ص ۳۱۲) اچھی ہے۔

اس روایت کو سامنے رکھ کر وہ جملہ بدعات کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ چونکہ مسلمان ان کو اچھا سمجھتے ہیں، لہذا وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہوں گی، اور اچھے کام پر تو نہ گرفت ہوتی ہے اور نہ گناہ۔

اس روایت کے متعلق چند ضروری ابکات ہیں جن کو سمجھنا نہایت ہی اہم ہے۔

اول بحث یہ ہے کہ اگرچہ بعض حضرات فقہائے کرام نے اس روایت کو مرفوع بیان کیا ہے لیکن

یہ روایت مرفوع نہیں ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعود پر موقوف ہے۔ چنانچہ علامہ جمال الدین الزیلعی الحنفی (المتوفی ۷۶۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

ولم اجده الا موقوفاً علی ابن مسعود۔ میں نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن مسعود پر

(نصب الراية ج ۴ ص ۳۱۱) موقوف ہی پایا ہے۔

اور مشہور محدث، علامہ الامام صلاح الدین ابوسعید العلانی (المتوفی ۳۸۵ھ) فرماتے ہیں :

لم اجد اجدہ مرفوعاً فی شیء من کتب
الحديث اصلاً ولا بسند ضعيف بعد
طول البحث وكثرة الكشف والسؤال وانما
هو قول ابن مسعود موقوف عليه (بحوالہ ج ۱ ص ۲۰۹)

میں نے اس روایت کو باوجود طویل بحث و تمحیص اور زیادہ
کھوج اور سوال کے حدیث کی کسی کتاب میں کسی ضعیف
سند کے ساتھ بھی مرفوع نہیں پایا، بلکہ یہ حضرت عبد اللہ
بن مسعود کا موقوف قول ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابی کا قول خصوصاً حضرت عبد اللہ بن مسعود جیسے بارگاہ نبوت میں معتد
علیہ کا، اپنے مقام پر ایک وزنی دلیل ہے۔ مگر اصول حدیث کے رُوس مرفوع اور موقوف کا جو فرق ہے
وہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ جو حیثیت حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مرفوع حدیث کی
سے وہ یقیناً کسی صحابی کے قول کی نہیں ہے، اگرچہ وہ صحیح بھی ہو۔ حافظ ابن کثیر حضرت عبد اللہ بن مسعود
کے اس موقوف قول کو پیش کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں :

اسناد صحیح - (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸) کہ اس کی سند صحیح ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ المسلمون سے کون مسلمان مراد ہیں؟ اگر الف اور لام اس میں
جنس کے لئے ہو تو لازم یہ آئے گا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امت کے بہتر فرقے سب کے سب ناجی
ہو جائیں کیونکہ ہر ایک فرقہ ازراہ تدین اپنے معمول کو حسن ہی سمجھتا ہے اور یہ اس حدیث کے خلاف ہے جو
ما انا علیہ واصحابی کے الفاظ سے پیش کی جا چکی ہے۔ اور اگر الف اور لام سے استغراق مراد ہے تو اس کا
مطلب یہ ہوگا کہ جس چیز کو تمام مسلمان اچھا سمجھیں وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہوگی، تو اس سے
اجماع امت مراد ہوگی، اور اجماع کے حسن ہونے میں کیا شک ہے؟ لیکن اس سے مبتدعین کو کوئی فائدہ نہ
ہوگا کیونکہ بدعات کا وجود خیر القرون میں برگزینہ تھا۔ لہذا سب مسلمانوں کا ان پر اتفاق و اجماع نہ ہوا۔ اور
اگر الف و لام سے عہد خارجی مراد ہو تو اس سے مسلمانوں کا ایک مخصوص طبقہ مراد ہوگا کہ مسلمانوں کا وہ

لہ علامہ اسول کا یہ مسلک ہے کہ اصل الف و لام میں عہد خارجی ہے (دیکھئے تلوح ص ۱۲۱ و ص ۱۲۱ وغیرہ)

گروہ اور طبقہ جس چیز کو اچھا سمجھے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھی ہوگی اور مسلمانوں کا وہ گروہ اولین درجہ پر بشواتے حدیث ما انا علیہ واصحابی صرف حضرات صحابہ کرامؓ کا گروہ ہی ہو سکتا ہے اور یہی بات صحیح ہے کہ جس چیز کو حضرات صحابہ کرامؓ پسند کریں وہ اچھی ہوگی۔ اگر حضرت عبداللہ بن مسعود کی اس روایت اور ان سے مروی دیگر روایات کو سرسری نظر سے دیکھ لیا جائے تو المسلمون سے حضرات صحابہ کرامؓ کا گروہ ہی متعین ہو جاتا ہے۔

پسنانچہ امام ابو داؤد طیالسی (المتوفی ۲۵۲ھ) نے یہ روایت ان الفاظ سے نقل کی ہے :

ان الله عز وجل نظر في قلوب العباد فاختر
محمدًا فبعثه برسالاته وانخبه بعلمه ثم نظر
في قلوب الناس بعد ذلك فاختر له اصحابه فجعلهم
انصار دينه ووزراء نبينه صلى الله عليه
وسلم فيما رآه المسلمون حسنا فهو عند
الله حسن وما رآه قبيحا فهو عند الله
قبيح - (طیالسی ص ۳۳)

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں پر نظر کی تو حضرت محمد صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے علم کے بموجب رسالت کے لئے چنا اور
انتخاب فرمایا۔ پھر آپ کے بعد لوگوں کے دلوں کو دیکھا تو آپ
کے صحابہ کرامؓ کو انتخاب فرمایا اور ان کو اپنے دین کا مددگار
اور اپنے نبی کا وزیر بنایا۔ سو جس چیز کو وہ مسلمان اچھا سمجھیں
تو وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہوگی اور جس چیز کو
وہ بُرا سمجھیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بُری ہوگی۔

(کم و بیش یہی الفاظ مستد احمد ج ۳ میں بھی مروی ہیں۔ الزیلعی ج ۲ ص ۳۳۱ والدرایہ ص ۳۱۰)
اور امام ابو عبد اللہ الحاکم (المتوفی ۵۰۵ھ) صحیح سند کے ساتھ (جس کی تصحیح پر امام حاکم اور علامہ ذہبی
دونوں متفق ہیں) اس روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں :

ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله
حسن وما رآه المسلمون سيئا فهو عند
الله سيئ وقد رأى الصحابة جميعا ان
يستخلفوا ابا بكر -

جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں تو وہ چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں
بھی اچھی ہی ہوگی اور جس چیز کو مسلمان بُرا سمجھیں تو وہ عند اللہ
بھی بُری ہوگی اور تمام صحابہ کرامؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ
بنایا اور ان کی خلافت کو اچھا سمجھا، لہذا ان کی خلافت

(المستدرک ج ۳ ص ۵۸) عند اللہ بھی اچھی ہی ہوگی۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے نزدیک المسلمون کے لفظ میں حضرات صحابہ کرامؓ ہی کی طرف اشارہ ہے، بلکہ تصریح کرتے ہیں کہ المسلمون سے حضرات صحابہ کرامؓ کا پاک گروہ ہی مراد ہے۔ یہی نہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود المسلمون سے حضرات صحابہ کرامؓ ہی مراد لیتے ہیں بلکہ اُمت کو تاکید کرتے ہیں کہ وہ حضرات صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر چلیں اور ان کی خلاف ورزی نہ کریں۔ کیونکہ ان کی اتباع ہی میں فلاح ہے۔

وعن ابن مسعود قال من كان مستنًا
قليستن بمن قدمات فان الحى لا تؤمن
عليه الفتنة اولئك اصحاب محمد صلى
الله عليه وسلم كانوا افضل هذه الامة
ابرها قلوبا واعماقها علما واولها تكلفا
اختارهم الله لصبة نبيه ولا قامه دينه
فاعرفوا لهم فضاهم واتبعوهم على اثرهم
وتمسكوا بما استطعتم من اخلاقهم
وسيرهم فانهم كانوا على الهدى المستقيم
(رواه زرير مشكوة ج ۱ ص ۱۱۱)

حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ جو شخص سنت پر چلنا چاہتا ہے
تو وہ ان بزرگوں کے قدم پر چلے جو فوت ہو چکے ہیں کیونکہ
زندہ کبھی فتنہ سے مامون نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں جو اس اُمت کے نہایت
افضل لوگ اور نہایت بھلے قلوب والے اور نہایت گہرے
علم والے اور نہایت کم تکلف اور کم بناوٹ والے تھے۔ اللہ
تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی رفاقت اور اپنے دین کے قائم کرنے
کے لئے انتخاب کیا تھا۔ ان کی فضیلتوں کو پہچانو اور ان کے
نقش قدم پر چلو اور جستجو ہو سکے ان کے اخلاق اور سیرت
کو مشعل راہ بناؤ کیونکہ وہ لوگ ہدایت مستقیمہ پر تھے۔

اس روایت سے نہایت صراحت اور وضاحت سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے نزدیک المسلمون کا مصداق صرف اولئك اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے، اور یہی وہ مفہوم ہے جس کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ما انا علیہ واصحابی سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف حضرت عبداللہ بن مسعود نے حضرات صحابہ کرامؓ کی اتباع کی تاکید اور اس کے خلاف ابتداء کی مذمت کی ہے۔

اتبعوا آثارنا ولا تتبدعوا فقد کفیتم۔
ہمارے نقش قدم کی پیروی کرو اور اپنی طرف سے بدعتیں مت

(الاختصاص ۵۲) ایجاد کرو کیونکہ (دین مکمل ہو چکا ہے اور تم کفایت کے گئے ہو اور دوسری طرف سختی سے ان لوگوں کی تردید کی اور ان کو مسی سے نکال دیا جنہوں نے مل کر بلند آواز سے ذکر کرنے اور درود شریف پڑھنے کو پسند کیا تھا (جس کا ذکر باحوالہ آگے آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ) اور ان کے اس فعل کو انہوں نے ہاراًۃ المسلمون حسنا کے تحت حسن اور اچھا نہ سمجھا کیونکہ ان لوگوں کا یہ طریقہ حضرات صحابہ کرامؓ کے طریقہ کے خلاف تھا۔

تیسری بحث یہ ہے کہ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ المسلمون سے حضرات صحابہ کرامؓ کے پاک نفوس مراد ہیں تو اس روایت کا مطلب یہ ہوا کہ جس چیز کو حضرات صحابہ کرامؓ نے اچھا سمجھا تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہوگی اور جس چیز کو حضرات صحابہ کرامؓ نے بُرا اور قبیح سمجھا تو وہ چیز عند اللہ بھی بُری اور قبیح ہی ہوگی۔ اور اہل بدعت حضرات کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ بیشتر بلکہ جملہ وہ بدعات جن پر وہ کاربند ہیں حضرات صحابہ کرامؓ سے ثابت نہیں ہیں۔ اگر وہ چیزیں ان کے نزدیک بھلی اور اچھی ہوتیں تو وہ ہرگز ان سے نہ چھوٹتیں۔ اور اگر وہ ان کے نزدیک بُری اور قبیح نہ ہوتیں تو وہ ضرور ان پر عمل کرتے۔ ان کا علم بھی وسیع اور عمیق تھا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ عشق بھی کامل تھا۔ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت بھی ان میں اعلیٰ درجہ پر تھا لہذا جس چیز کو انہوں نے قبیح سمجھ کر اُس پر عمل نہیں کیا تو یقیناً وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی قبیح اور بُری ہی ہوگی۔ بہر کیف یہ روایت جملہ بدعات کی تردید کی دلیل ہے نہ کہ ان کی تائید اور ان کی ترویج اور اشاعت کی۔ مگر اللہ تعالیٰ جس کو سنت کے سمجھنے کی توفیق دے اور پھر اس پر عمل کی توفیق بخشے۔ یہ راستہ ہے تو کافی دشوار گزار مگر بھرا اللہ تعالیٰ اسے

ہم خوش ہی خوش ہیں عشق سے گوراہِ عشق میں
زنجیر و طوق و دار و رسن جا بجا ملے!

باب چہارم

عبادات کے اندر اپنی طرف سے اوقات اور کیفیات کا تعین کرنا بدعت ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ کوئی چیز اصل ہی میں بُری ہو تو وہ بدعت ہوگی بلکہ وہ اہم طاعات اور عبادات بھی جن کو شریعت نے مطلق چھوڑا ہے اُن میں اپنی طرف سے قیود لگا دینا یا ان کی کیفیت بدل دینا، یا اپنی طرف سے اوقات کے ساتھ متعین کر دینا، یہ بھی شریعت کی اصطلاح میں بدعت ہوگی، اور شریعت اسلامی اس کو پسند نہیں کرے گی۔ حضرت ابو ہریرہؓ (المتوفی ۶۴ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تختصوا لیلۃ الجمعة بقیام من بین الیالی ولا تختصوا یوم الجمعة بصیام من بین الایام الا ان یكون فی صوم یصوم احدکم۔

کہ اپنے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کی رات کو دوسری راتوں سے نماز اور قیام کے لئے خاص نہ کرو اور جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں سے روزہ کے لئے خاص نہ کرو۔ مگر ہاں اگر کوئی شخص روزے رکھتا ہے اور جمعہ کا دن بھی اس میں آجائے، تو

(مسلم ج ۱ - ص ۳۶) الگ بات ہے۔

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی فضیلت نماز جمعہ کی وجہ سے ہے محض اس فضیلت کے سبب جمعہ کی رات کو نماز وغیرہ کے لئے اور دن کو روزہ کے لئے خاص کرنا صحیح نہیں ہے۔

علامہ ابو اسحاق شاطبیؒ بدعات کی تعین اور تردید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

اور انہی بدعات میں سے کیفیات، مخصوصہ اور ہیئات
معینہ کا التزام ہے جیسے کہ ہیئت اجتماع کے ساتھ ایک
آواز پر ذکر کرنا (پھر آگے فرمایا) اور انہی بدعات میں
سے خاص اوقات کے اندر ایسی عبادات معینہ کا
التزام کر لینا بھی ہے جن کے لئے شریعتِ مطہرہ نے
وہ اوقات مقرر نہیں کئے ہیں۔

جب شریعت نے کسی چیز کی ترغیب دی مثلاً ذکر اللہ ہو
اگر ایک قوم اس کا التزام کرے کہ ایک زبان ہو کر ایک آواز
سے وہ ذکر کرتی ہے یا دیگر اوقات کے علاوہ کسی معلوم اور
مخصوص وقت کے اندر وہ ذکر کرتی ہے تو شریعت کی
ترغیب اس معینہ تخصیص اور التزام پر ہرگز دلالت نہیں
کرتی بلکہ وہ اس کے خلاف دلالت کرتی ہے۔

یعنی یہ خصوصیات، وقت یا حال اور ہیئت، اور فعل
مخصوص کیساتھ کسی خاص دلیل کی محتاج ہیں جو علی الخصوص
انکے استنباط پر دلالت کرے اور یہی چیز اقرب الی الصواب ہے۔

کیونکہ کسی چیز کے کسی خاص ہیئت کے ساتھ مستحب ہونے
پر لازم اور لایا ہوا ہے کہ دلیل شرعی موجود ہو۔

پھر آگے رد افض کی عید غدیر کی تردید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

ومنها التزام کیفیات والھیئات المعینة
كالذکر بهیئة الاجتماع علی صوت واحد (الی
ان قال) ومنها التزام العبادات المعینة
فی اوقات معینة لم یوجد لها ذلك التّعیین
فی الشریعة - (الاعتصام ج ۱ ص ۳۲)

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں :

فاذا ندب الشرع مثلاً الی ذکر الله فالتزم
قوم الاجتماع علی لسان واحد وبصوت
واحد او فی وقت معلوم مخصوص عن سائر
الاقوات لم یکر فی ندب الشرع ما یدل علی
هذا التخصیص التزم الیہ ما یدل علی
خلافه - (الاعتصام - ج ۱ - ص ۳۲)

حافظ ابن وقیح العیّ لکھتے ہیں کہ :-

ان هذه الخصوصیات الوقتیة وبالحال
والهیئة والفعل المخصوص، یتحتاج الی دلیل
خاص یقتضی استجابہ بخصمه وهذا اقرب
پھر آگے لکھتے ہیں :-

لان الحكم باستجابہ علی تلك الھیئة
الخاصة یتحتاج دلیلًا شرعیًا علیہ ولا بد

ما حدثته الروافض من عيد ثالث سموة
 عيد الغدير وكذلك الاجتماع واقامة شعارة
 في وقت مخصوص على شئ مخصوص لم يثبت
 شرعا وقريب من ذلك ان تكون العبادة من
 جهة الشرع مرتبة على وجه مخصوص فيريد
 بعض الناس ان يحدث فيها امر اخر لم يرد
 به الشرع زاعما انه يدرجه تحت عموم
 فهذا لا يستقيم لان الغالب على العبادات
 التبعيد وماخذها التوقيف -

شیعوں نے جو تیسری عید جس کو وہ عید غدیر کہتے ہیں ایجاد
 کی ہے۔ اس کے لئے اجتماع اور اس کے بطور شعائر قائم
 کرنے پر جو مخصوص وقت اور خاص ہیئت کے ساتھ کی
 جاتی ہے کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے اور اسی کے قریب
 یہ بات بھی ہے کہ کوئی عبادت شریعت میں کسی خاص طریقہ پر
 ثابت ہو، اور بعض لوگ اس کے اندر کچھ تغیر کر دیں اور خیال
 یہ کریں کہ یہ بھی عموم کے نیچے داخل ہے تو ان کا ایسا خیال درست
 اور صحیح نہ ہوگا کیونکہ عبادات کے اندر تبعیدی طریقہ غالب ہے
 اور اس کا ماخذ (جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

(احکام الاحکام ج ۱ ص ۵۱)

اور حضرت صحابہ کرام سے) اطلاع پائے بغیر حاصل نہیں کیا جاتا۔

صاحب مجالس الابرار ایک خاص ہیئت اور کیفیت کے ساتھ مسجد میں اجتماعی طور پر ذکر کرنے والوں
 کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت ابن مسعود کی ایک روایت کا حوالہ دیتے ہوئے (اس روایت کا ذکر اپنے مقام
 پر ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ) فرماتے ہیں :

هكذا يقال بكل من اتى في العبادات البدنية
 المحضه بصفة لم تكن في زمن الصحابة
 (مجالس الابرار ص ۱۲۳)

ہر اس شخص کے متعلق ایسا ہی کہنا چاہیے (کہ وہ بدعت کا
 ترکیب ہے) جو خالص بدنی عبادات میں کوئی ایسی صفت
 اور ہیئت پیدا کرے جو حضرات صحابہ کرام کے زمانہ میں نہ تھی۔

کیونکہ اس تغیر ہیئت کی وجہ سے دین بدل جائے گا اور اسی کا نام تحریف دین ہے چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ
 صاحب تحریف دین کے اسباب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

ومنهما التشدد وحقيقته اختيار عبادات
 شاقة لم يامر بها الشارع كدوام الصيام
 والقيام والتبتل وترك التزوج وان يلتزم
 اور ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ تشدد اختیار کر لیا جائے
 اور اسکی حقیقت یہ ہے کہ ایسی مشکل عبادات کو اختیار کر لیا جائے
 جن کے متعلق شریعت نے حکم نہیں دیا مثلاً کوئی دوامی طور پر

السنن والآداب كالتزام الواجبات (الی ان قال) فاذا كان هذا المتعمق او المتشدد معلم قوم ورئیسهم فظنوا ان هذا امر الشرع ورضاه وهذا اداء رهبان الیهود والنصری۔ (حجة الشرح اصلاً)

روزہ رکھے اور قیام کرے اور عزت شعیب اختیار کرے اور نکاح کرنا چھوڑ دے اور شلایہ کہ سنتوں اور مستحبات کا ایسا التزام کرے جیسے کہ واجبات کا کیا جاتا ہے (پھر فرمایا) جب کوئی ایسا متعمق یا متشدد کسی قوم کا معلم یا رئیس بن جاتا ہے تو قوم پر خیال کر لیتی ہے کہ اس کا یہ عمل شرع کا حکم اور اس کا پسندیدہ امر ہے اور یہی بیماری تھی یہود اور نصاریٰ کے صوفیوں میں۔

یہی وجہ ہے کہ قانون الہی نے انسانوں کو ان کی اپنی مرضی پر نہیں چھوڑا۔ عبادات و معاملات حتیٰ کہ حکومت اور سلطنت کے احکام میں بھی ان کو پابند کر دیا ہے تاکہ وہ اپنی اہوار و خواہشات کے تحت اللہ تعالیٰ کے دین کا حلیہ نہ بگاڑیں۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں :

فجاءت الشرائع بحملهم على ذلك في جميع احوالهم من عبادة او معاملة حتى في الملك الذي هو طبيعي للاجتماع الانساني فاجرت له على منهاج الدين ليكون الكل محوطا بنظر الشارع۔ (مقدمه ص ۱۱)

شرائع اسلامیہ اسی لئے تو آئی ہیں کہ لوگوں کو تمام حالات میں (خواہ وہ) عبادات ہوں یا معاملات حتیٰ کہ ملکی انتظام جو لوگوں کے اجتماع کا ایک طبعی امر ہے، دین پر ہی قائم رہنے کی تلقین کریں اور ان کو دین کے طریقہ پر محض اسلئے قائم رہنے کی تلقین کی ہے تاکہ ان کے تمام معاملات شارع کی نگرانی میں ہوں۔

مشہور فقیہ ابو حنیفہ ثانی علامہ زین العابدین ابن نجیم المصری الحنفی (المتوفی ۷۹۵ھ) لکھتے ہیں :

لان ذکر الله تعالى او قصد به التخصيص بوقت دون وقت او بشيء دون شيء لم يكن مشروعا حيث لم يرد به الشرع لانه خلاف الشرع۔ (بحر الرائق ج ۲ ص ۱۵۹)

اسلئے کہ ذکر اللہ کی جب کسی ایک ہی وقت کے ساتھ تخصیص کا قصد کر لیا گیا اور دوسرے وقت میں وہ نہ ہو یا کسی شے کے ساتھ ذکر اللہ کو مخصوص کر دیا گیا دوسری چیز کے ساتھ، وہ خاص نہ کیا گیا تو وہ مشروع نہ ہوگا کیونکہ اس کے متعلق شریعت میں کوئی تخصیص نہیں آئی لہذا وہ خلاف شرع ہوگا۔

علامہ موصوف بھی یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ گو اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک بڑی عبادت ہے لیکن جب شریعت نے

اس کو کسی خاص وقت کے ساتھ یا جہر اور انخار یا اجتماع و افراد وغیرہ کسی خاص کیفیت اور ہیئت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا تو اس کو اپنی طرف سے کسی خاص وقت یا کسی خاص کیفیت کے ساتھ متعین کر دینا غیر مشروع ہوگا، بلکہ تحریفِ دین۔ اس لئے کہ شریعت نے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا۔

حضرت مجددِ الف ثانیؒ ارشاد فرماتے ہیں :

”و عمل فقیر نیز برہیں است و بیچ روزے را بر روز دیگر ترجیح نمی دهد تا آنکہ ترجیح آنها از شارع معلوم نکند کالجہ و رمضان و نحوہما“
 اس فقیر کا عمل بھی اسی پر ہے کہ کسی دن کو کسی دن پر ترجیح نہیں دیتا، تا وقتیکہ اُس کی ترجیح شارع سے معلوم نہ کرے۔ جیسا کہ جمعہ اور رمضان وغیرہ کی ترجیح شارع سے معلوم ہو چکی ہے۔ (مکتوبات حصہ چہارم ص ۶)

ان اقتباسات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ جب شریعت نے کسی رات یا دن کو کسی عبادت کے لئے مخصوص نہ کیا ہو، اور جب ذکر اللہ وغیرہ عبادات کو کسی خاص ہیئت اور کیفیت کے ساتھ متعین نہ کیا ہو تو اپنی طرف سے وقت اور کیفیت کا متعین کرنا اور اس تعین کا التزام کرنا بدعت بھی ہے اور غیر مشروع بھی۔

حضرات صحابہ کرامؓ کا ایسی کیفیات اور ہیئت کی تعیین سے متعلق کیا فیصلہ ہے؟
 خوش کن سے خوش کن فلسفہ، دلچسپ سے دلچسپ نظریہ اور خوش آئند سے خوش آئند اقوال اور بہتر سے بہتر اشعار

ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے لیکن جو چیز ہر شخص ہر وقت پیش نہیں کر سکتا، وہ کامل اتباعِ رسول اور عمل ہے۔ انسانی سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل، اُس کے نیک اور معصوم اقوال اور خیالات نہیں، بلکہ اس کے اعمال اور کارنامے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے نشہ دینی سے سرمست ہو کر اپنی جان دے دینا آسان ہے مگر پوری عمر ہر چیز میں، ہر حالت میں اور ہر کیفیت میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع کے پل صراط کو اس طرح طے کرنا کہ کسی بات میں سنتِ محمدی سے قدم ادھر ادھر نہ ہو، سب سے زیادہ مشکل امتحان ہے اس اتباع کے امتحان میں تمام حضرات صحابہ کرامؓ پورے اترے۔ آپؐ کی زندگی کے آئینہ میں حضرات صحابہ کرامؓ نے اپنی زندگیاں سجائیں اور یہ بولتی چلتی، جیتی جاگتی تصویریں مسلمان کی زندگی کی حالت اور ہر کیفیت کا آئینہ

بن جاتی ہیں اور اسی اتباع کے صحیح جذبہ نے حضرات تابعین اور تبع تابعین اور بعد کو آنے والوں کا یہ اثر کم فرض قرار دیا کہ وہ آپ کی ایک ایک بات، ایک ایک ادا اور ایک ایک جنبش کو معلوم کریں اور کھوپوں کو بتائیں تاکہ اپنے اپنے امکان بھر ہر مسلمان اس پر چلنے کی کوشش کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود : حضرت عبداللہ بن مسعود کی ایک روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن کا گزر مسجد میں ذاکرین کی ایک جماعت پر ہوا، جس میں ایک شخص کہتا تھا۔ سو مرتبہ اللہ اکبر پڑھو تو حلقہ یثربی لوگ کنکریوں پر سو مرتبہ بکیر کہتے۔ پھر وہ کہتا۔ سُو بَارَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھو تو وہ سو بار تہلیل پڑھتے۔ پھر وہ کہتا، سُو وَفَعُ صُبْحَانَ اللّٰهِ کہو، تو وہ سنگریزوں پر سو وَفَعُ تَسْبِيح پڑھتے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا۔ تم ان سنگریزوں اور کنکریوں پر کیا پڑھتے تھے۔ وہ کہنے لگے ہم بکیر و تہلیل و تسبیح پڑھتے رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا :

فَقَالَ فَعَدُوا مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ فَاَنَا ضَامِنٌ اِنْ لَا يَضِيعُ مِنْ حَسَنَاتِكُمْ شَيْءٌ وَيُحْكَمُ يَا اُمَّةَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اسْرَعَ هَلِكُكُمْ هُوَ لَاءِ صَحَابَةِ بَيْنَكُمْ مَتَوَافِرُونَ وَهَذَا شَيْبَاهُ لَمْ تَبِلْ وَاَنْبِيَتُهُ لَمْ تَكْسُرْ (الْاِنْ قَالِ ۱۲) وَاَوْ مَفْتَحِي بَابِ ضَلَالَةٍ - (مسند دارمی ص ۳۸ قلت بسید صحیح)

تم ان کنکریوں پر اپنے گناہ شمار کیا کرو۔ میں اس کا ضامن ہوں کہ تمہاری نیکیوں میں سے کچھ بھی ضائع نہ ہوگا۔ تعجب ہے تم پر اسے امت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، کیا یہی جلدی تم ہلاکت میں پڑ گئے ہو۔ ابھی تک حضرات صحابہ کرام تم میں بکثرت موجود ہیں، اور ابھی تک جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کپڑے پڑانے نہیں ہوئے اور ابھی تک آپ کے برتن نہیں ٹوٹے (آگے فرمایا) اندر میں حالات تم بدعت اور گمراہی کا دروازہ کھولتے ہو۔

علامہ قاضی ابراہیم صاحب، حضرت ابن مسعود کی ایک روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں :

انا عبد الله بن مسعود فوالذي لا اله غيره
لقد جنتم ببدعة ظلماء اولقد فقتم على
اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم -
(مجاہد الا برار ص ۱۳)

میں عبداللہ بن مسعود ہوں خدائے وحدہ لا شریک لہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم نے یہ نہایت تاریک اور سیاہ بدعت ایجاد کی ہے، یا کیا تم علم میں جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ سے بڑھ گئے ہو؟

اور شیخ الاسلام ابنِ وقیقہ ان کی ایک روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں :

فقال اذا رأيتموه فاخبروني قال فاخبروا
فانا ابن مسعود متقنا فقال من عرفني
فقد عرفني ومن لم يعرفني فانا عبد الله
ابن مسعود تعلمون انكم لا هدى
من محمد صلى الله عليه وسلم و
اصحابه (الى ان قال) لقد جئتم بسدعة
عظمتي اولقد فضلتهم اصحاب محمد
صلى الله عليه وسلم علما فهذا ابن
مسعود انكر هذا الفعل مع امكان
ادراجه تحت عموم فضيلة الذكو-

فرمایا حضرت عبداللہ بن مسعود نے جب تم اس کو دیکھو تو مجھے
اطلاع دو۔ راوی کہتا ہے کہ ان کو اطلاع دی گئی وہ موقع پر
پہنچے اور وہ سر پر کپڑا اڑھتے ہوئے تھے۔ فرمایا مجھ کو جو جانتا ہے
سو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا تو میں بتا دیتا ہوں کہ میں عبد اللہ
بن مسعود ہوں۔ تم جانتے ہو کہ تم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرام سے زیادہ ہدایت پر ہو (العیاذ
باللہ تعالیٰ) پھر فرمایا۔ تم نے ایک بہت بڑی بدعت ایجاد کی ہے
یا تم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ کرام پر علم فضیلت
حاصل کر چکے ہو؟ حضرت عبداللہ بن مسعود نے مخصوص ہدایت
اور کیفیت کے ساتھ اس فعل کا انکار کیا ہے حالانکہ فضیلت ذکر

(احکام الاحکام ج ۱ ص ۵۲) کے عام دلائل کے تحت، اس کا ادراج ممکن تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا مطلب اس سے صرف یہ تھا کہ اگرچہ بکیر و تہلیل اور بیح و تحمید کی بہت
کچھ فضیلتیں وارد ہوئی ہیں اور وہ محبوب ترین ذکر ہے لیکن اس کا یہ خاص طرز و طریقہ جناب رسول اللہ صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام کا بتایا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ خود تمہارا ایجاد کردہ ہے۔ لہذا یہ بدعت ضلالت بھی
ہے اور گمراہی بھی، بدعت عظمیٰ بھی ہے اور بدعت ظلماء بھی اور بقول امام ابنِ وقیقہ العید اس مخصوص کیفیت کو
حضرت عبداللہ بن مسعود نے فضیلت ذکر کی عام دلیلوں کے نیچے داخل نہیں کیا۔

اور اس روایت کو فریق مخالف بھی تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالسمع صاحب لکھتے ہیں :-
"عبداللہ بن مسعود نے جہر سے ایک جماعت ذکر اللہ کرنے والوں کو دھمکایا اور ان کے فعل کو بدعت قرار دیا
کتب فقہ اور حدیث میں یہ روایت مذکور ہے" (انوار ساطعہ ص ۲۴)۔ اور دوسری جگہ لکھتے ہیں :- "اس
روایت میں لفظ قاص ہے۔ یعنی ایک آدمی قصہ گو رات کے وقت قصہ کہنے بیٹھا تھا، اور درمیان قصہ گوئی

کے لوگوں کو کہتا جاتا تھا کہ ایسا کہو، ایسا کہو۔ یہ خیر عبد اللہ بن مسعود کو پہنچی۔ آپ وہاں تشریف لے گئے اور ان کو دھمکایا کہ تم نے یہ بدعت نکالی ہے۔ واضح ہو کہ یہ انکار کرنا عروض ہیئت جدید کے سبب نہ تھا بلکہ وہ اس کا مجمع کرنا قصہ گوئی کے واسطے یہ خلاف شرع تھا، گو ذکر اللہ بھی کبھی کبھی درمیان میں ہوتا ہو، اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصہ گوئیوں کو جو بے اصل قصہ بیان کرتے تھے، مسجد سے نکال دیا کرتے تھے۔ (انوار ساطعہ، بلفظہ ص ۳۸)۔

مولوی عبدالسمیع صاحب نے اصولی طور پر یہ روایت صحیح تسلیم کر لی ہے۔ ہاں البتہ اسکی تاویل کی ہے کہ یہ مجلس بے اصل قصہ گوئی کی وجہ سے حضرت عبد اللہ بن مسعود کو پسند نہ آئی اور اسلئے انہوں نے اس کو بدعت اور ضلالت کہا۔ اور اس کی دلیل لفظ قاص ہے (ایک قصہ گو) اور ذکر اللہ کی یہ توجیہ کی کہ ذکر سنی طور پر کبھی کبھی ایشائے قصہ گوئی میں ہوتا رہا۔ مگر صاحب انوار ساطعہ کی یہ تاویل نہایت رکیک اور سراسر باطل ہے۔ اولاً اسلئے کہ جس روایت اور روایت کے جن الفاظ سے ان کو دھوکا ہوا ہے وہ یہ ہیں:

قاص یجلس باللیل ویقول للناس قولوا کذا و قولوا کذا۔ (احکام الاحکام ج ۱ ص ۵۲) تم یہ کہو اور تم یہ کہو۔

یہ روایت اور اس کے الفاظ صراحت کے ساتھ اس بات کو آشکار کرتے ہیں کہ وہ قاص لوگوں ہی سے کہلاتا تھا، اور ان کو طریقہ بتلاتا تھا کہ تم یہ کہو، تم یہ کہو۔ اس روایت میں کہیں اشارت بھی اس کا ذکر نہیں کہ وہ بیہودہ اور لایعنی قصہ گوئی کرتا تھا، اور درمیان میں کبھی کبھی لوگوں سے ذکر اللہ بھی کروایا کرتا تھا۔ بلکہ یہ ثابت ہے کہ جو کچھ وہ کہتا جاتا تھا وہی کچھ جملہ اہل مجلس کہتے جاتے تھے۔ وثانیاً ہم نے مسند دارمی کی صحیح روایت سے یہ عرض کر دیا ہے کہ وہ سو سو مرتبہ اللہ اکبر، سو سو مرتبہ لا الہ الا اللہ اور سو سو مرتبہ سبحان اللہ وغیرہ ان کو پڑھواتا تھا، اور وہ اس کے پیچھے پیچھے پڑتے جاتے تھے۔ اور ان کا اس اجتماعی رنگ میں ذکر کرنا ہی حضرت ابن مسعود کو ناگوار گزارا اور اسی کو انہوں نے بدعت ضلالہ اور بدعت عظمیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ صاحب انوار ساطعہ کا یہ کہنا کہ انکار کرنا عروض ہیئت جدید کے سبب نہ تھا ان کی ذاتی اختراع اور ایجاد بندہ ہے جو کسی صورت میں بھی قابل

التفات نہیں ہے۔ مسندِ دارمی کا بعض مضمون مکرر ملاحظہ کر لیا جائے۔

فوقف علیہم فقال ما هذا الذی اراکم
تصنعون قالوا یا ابا عبد الرحمن حصا
نعد به التکبیر والتہلیل والتسبیح
قال فعدوا سیئاتکم۔ (الحديث)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ انکے پاس کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ
یہ کیا معاملہ ہے جو میں تم سے دیکھ رہا ہوں؟ لوگوں نے کہا
اے ابو عبد الرحمن (یہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی کنیت تھی)
ہم ان سنگریزوں پر اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ اور سبحان اللہ
شمار کرتے ہیں۔ فرمایا تو تم ان پر اپنے گناہ شمار کرو۔
(مسند دارمی ص ۳۸)

نوٹ فرمائیے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ صاحبِ انوارِ ساطعہ کے اتباع ہی از رہ انصافیہ فرمائیں کہ حضرت
عبداللہ بن مسعود نے قصہ گوئی کو بدعتِ عظمیٰ سے تعبیر کیا ہے یا سنگریزوں پر تکبیر و تہلیل اور تسبیح پڑھنے کو؟
اور یہ انکارِ عروضِ ہیئتِ جدیدہ کی وجہ سے تھا یا قصہ گوئی کی وجہ سے؟ اور ان لوگوں نے اپنا قصور سنگریزوں
اور کنکریوں پر تکبیر و تہلیل اور تسبیح پڑھنا بیان کیا ہے یا قصہ گوئی سُننا؟ اور حضرت ابن مسعود نے فعدوا
سیئاتکم ارشاد فرما کر تکبیر و تسبیح وغیرہ کے شمار کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نمل کو بدعت
کہا ہے یا اس سے قصہ گوئی کا کنکریوں پر شمار کرنا مراد ہے؟ الغرض صاحبِ انوارِ ساطعہ کی تاویل سرسر
مروو ہے۔ حضرت ابن مسعود کا انکار صرف عروضِ ہیئتِ جدیدہ کی وجہ سے تھا۔ اسی کی طرف شیخ الاسلام
ابن دقیق العید نے اشارہ کیا ہے اور اسی کو قاضی ابراہیم نے بصفة لم تکن فی زمن الصحابة
سے تعبیر کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ حضرت ابن مسعود کا انکار اس مخصوص ہیئت اور خاص کیفیت کے
ساتھ اور متعین صفت کے ساتھ ذکر اللہ پر جمع ہونے کی وجہ سے تھا اور اسی کو انہوں نے بدعتِ ظلماء
اور بدعتِ عظمیٰ اور ضلالت فرمایا ہے۔

وَنَالَتْ لَفْظَ قَاصٍ كَمَعْنَى لَعْنَةٍ عَرَبِيٍّ فِي بَيَانِ كَرْنِ وَالْأَبِيءِ، عَامٍ اس سے کہ اچھی بات بیان
کرے یا بُری۔ ہاں عرف میں قاص قصہ گو کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ اچھے قصے بیان کرے یا بُرے۔
لفظ قاص سے علی التعمین قصہ گو مراد لینا اور قصہ گو سے بے اصل قصہ گو مراد لینا عجیب منطوق ہے۔ صاحبِ انوارِ ساطعہ
قرآن کریم میں يَقْصُّ الْحَقُّ بِأَقْصَمِ الْقَصَصِ أَوْ قَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ وَغَيْرِهِ كِي طرف

دھیان کرتے تو ہرگز ٹھوکر نہ کھاتے۔

حضرت ابن مسعودؓ اور آواز بلند مسجد میں مل کر دُرود شریف پڑھنا | دُرود شریف کا پڑھنا ایک بہت

بڑی عبادت ہے مگر انفرادی طور اور آہستہ۔ چنانچہ مشہور فقیر علامہ محمد بن محمد الخوارزمی المشہور بالبنازی الحنفیؒ (المتوفی ۸۲۷ھ) صاحب بنازیہ جہر بالذکر کا مسئلہ نقل کرتے ہیں :

عن فتاویٰ القاضی انہ حرام لہما صح
عن ابن مسعودؓ انہ اخرج جماعۃ من
المسجد یهللون ویصلون علی النبی
صلی اللہ علیہ وسلم جہراً وقال لہم ما
اراکم الا مبتدعین۔ (شامی ج ۲ ص ۳۵)
(فتاویٰ بنازیہ ج ۳ ص ۳۷ علی ہامش الہندیۃ)

قاضی صاحب کے فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ جہر سے ذکر کرنا
حرام ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صحیح روایت کیساتھ
یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انہوں نے ایک جماعت کو مسجد سے
محض اس لئے نکال دیا تھا کہ وہ بلند آواز سے لا الہ الا اللہ
اور بلند آواز سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر دُرود
شریف پڑھتی تھی اور فرمایا کہ میرے تمہیں بدعتی ہی خیال کرتا ہوں

انقلابِ زمانہ دیکھتے کہ آج جو شخص بلند آواز سے جماعت کے ساتھ مل کر دُرود شریف نہیں پڑھتا،
اہل بدعت اس کو مسجد سے نکال دیتے ہیں۔ مگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بلند آواز کے ساتھ مسجد میں جہر
کے ساتھ دُرود شریف پڑھنے والوں کو مسجد سے نکال دیا اور فرمایا۔ میرے نزدیک تم بدعتی ہو۔ فریقِ مخالف کو
اس صحیح روایت سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

قارئین کرام نے حضرت ابن مسعودؓ کا فیصلہ تو ملاحظہ کر ہی لیا ہے۔ اب، ذرا مولوی محمد عمر صاحب
اچھروی کی بھی سُن لیجئے کہ وہ کیا فرماتے ہیں؛ "فرقہ وہابیہ دیوبندیہ نماز کے بعد بلند آواز سے اجتماعی طور پر
دُرود شریف پڑھنے کو بدعت کہتے ہیں اور پڑھنے والے کو روکتے ہیں۔ اور احناف کی مساجد میں صلوٰۃ فریضہ
کے بعد دُرود شریف کو بلند آواز سے لازمی پڑھا جاتا ہے۔ اب تم اپنے عمل سے فیصلہ کر لو کہ تم وہابی ہو یا حنفی۔ انتہی
(بلفظہ مقیاس خفیت ص ۲۱۹) مولوی محمد عمر صاحب اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اور گریبان میں منہ ڈال کر خوفِ
خدا کو دل میں رکھتے ہوئے اور قبر و آخرت کا نقشہ سامنے رکھ کر یہ فیصلہ خود صادر فرمائیں کہ حضرت ابن مسعودؓ کے
اس فیصلہ کے بموجب وہ بدعتی ہیں یا بدعتی؟ اور بلند آواز سے اجتماعی طور پر دُرود شریف پڑھنے کو ضرور دیوبندی

وغیرہ ہی بدعت کہتے ہیں یا حضرت عبداللہ بن مسعود نے بھی بدعت کہا ہے؛ ہوش میں آکر جواب دیجئے۔
باقی خود کو زبانی طور پر حنفی کہہ دینے سے کوئی حنفی نہیں بن جاتا۔ سچ ہے ع

نہ ہر کہ سر بر اثر شد قلندری وانہ

یہ روایت فریق مخالف کے ہاں بھی صحیح اور مسلم ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالسمیع صاحب لکھتے ہیں "چنانچہ
حموی میں ہے فی فتاویٰ القاضی الجہر بالذکر حرام وقد صح عن ابن مسعود انہ سمع قوما اجتبعوا
فی مسجد یهللون ویصلون علیہ الصلوٰۃ والسلام جہراً فراح الیہم وقال ما عہدوا ذلک
علی عہدہ علیہ الصلوٰۃ والسلام وما اراکم الا مبتدعین فما زال ینذکر ذلک حتی اخرجہم
من المسجد۔ اور روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے ان لوگوں کو فقط احداثِ ہیئت
جدیدہ کیلئے نہیں بلکہ یہ سمجھ کر نکالا تھا کہ یہ ذکرِ جہر کرنا ان کا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہے، اور یہ
ہی ہم کہتے ہیں کہ جو احداثِ مخالف امر شائع کی ہو وہ منع ہے الخ" (بلفظہ انوار ساطعہ ص ۳۸-۳۹)

الغرض علامہ قاضی، امام بزازمی، علامہ شامی اور علامہ حموی سب کے سب بزرگ حضرت ابن مسعود
کی اس روایت کو قدح سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کو صحیح کہتے ہیں اور خود صاحب انوار ساطعہ وقد صح کے الفاظ
سے اس کی تصحیح نقل کرتے ہیں۔ اگر امام سیوطی کو اس کی سند معلوم نہیں ہو سکی، جیسا کہ سباحۃ الفکر ص ۶۸ میں
نقل کیا گیا ہے کہ اس اثر کی سند اور اس کے مخرج کا پتہ ہونا چاہیے تاکہ اس کی صحت اور ضعف کا حال کھلے، تو
اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ اور صاحب روح البیان نے جو اس روایت کو بلاوجہ جھوٹا
اور افترا کہا ہے (تفسیر روح البیان جلد ۲ ص ۲۲۲) تو ان کا قول سرے سے قابل التفات ہی نہیں ہے۔ وہ تو
موضوع اور جعلی حدیثوں کو صحیح، اور صحیح احادیث کو ضعیف کہہ جاتے ہیں۔ پھر حدیث کی تصحیح اور تضعیف
ان کا مقام ہی نہیں ہے۔ یہ مسلم محدثین اور صاحب بصیرت فقہار کا کام ہے۔ صاحب روح البیان تو ایک
صوفی مزاج مفسر ہیں جنہوں نے رطب و یابس سبھی کچھ تفسیر میں جمع کر دیا ہے (دیکھئے اکسیر ص ۸۷) اور انہوں نے
جو یہ کہا ہے کہ یہ احداثِ ہیئتِ جدیدہ کے لئے نہیں، یہ توجیہ بھی صحیح نہیں کیونکہ حضرت ابن مسعود اس کی
دلیل یہ بیان کرتے ہیں :-

ما عهد واذلک علیٰ عہدہ صلی اللہ علیہ کہ یہ طرز و طریقہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ
وسلمہ۔ مبارک میں لوگوں میں معبود نہ تھا۔

ان کا یہ قول نص صریح ہے کہ یہ کیفیت اور احداث بیعت جدیدہ آپ کے زمانہ مبارک میں نہ تھی۔ یہ نہیں
فرمایا کہ اس مخصوص طریقہ سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ خود حضرت ابن مسعود کی پیش کردہ دلیل کو چھوڑ کر ذکر
بالجہر سے منع کی عام روایتوں کو اس کی دلیل بنانا جیسا کہ صاحب انوار ساطعہ ص ۱۳ میں آیت کریمہ،

وَادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً اور حدیث اربعوا علیٰ انفسکم انکم لا تدعون اصم ولا

غائباً کو نقل کر کے لکتے ہیں؛ اس سے بعض صحابہ سمجھ گئے کہ ذکر جہر منع ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعود
نے لوگوں کو منع فرمایا تو یہ توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائل ہے جو کسی طرح سے مسموع نہیں ہے۔ خیر بہر حال صاحب

انوار ساطعہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود مسجد میں بلند آواز کے ساتھ مل کر دُرد شریف
پڑھنے اور ذکر بالجہر کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخالف سمجھتے تھے۔ کاش کہ اہل بدعت اس سے

کچھ عبرت حاصل کرتے۔ باقی امام احمد کی کتاب الزہد کے حوالہ سے حضرت ابو داؤد تابعی کا جو یہ قول نقل کیا

گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ذکر کرنے سے منع کرتے تھے میں

تو جب کبھی حضرت عبداللہ کی مجلس میں جا کر بیٹھا، ان کو ذکر اللہ کرتے ہوئے ہی پایا (تجوید الرحمن)۔ تو یہ

حضرت عبداللہ بن مسعود کی جہر سے ممانعت والی روایت کا ہرگز جواب نہیں ہے۔ کیونکہ سوال یہ نہیں کہ

ذکر اللہ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے کا ذکر قرآن کریم، صحیح احادیث اور اجماع اہل سنت سے

ثابت ہے اور یہ ایک بہت بڑی عبادت اور طاعت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اجتماعی صورت میں، اور

وہ بھی مسجد میں جہر سے ذکر کرنا اور اسی ہیئت کے ساتھ جہر سے دُرد شریف پڑھنا حضرت عبداللہ بن مسعود

سے ثابت ہے یا وہ اس کو منع کرتے اور اس کو بدعت کہتے ہیں؟ آپ نے صحیح روایات سے یہ معلوم کر لیا

کہ وہ ان دونوں کو بدعت اور ان پر عمل کرنے والوں کو بدعتی کہتے ہیں اور ان کا وجود تک مسجد میں گوارا نہیں

کرتے اور فوراً ان کو مسجد سے باہر نکال دیتے ہیں۔ فریق مخالف ازراہ دیانت یہ فرماتے کہ مسجدوں میں اجتماعی

زنگ میں جہر سے ذکر اور دُرد شریف پڑھنے والوں کو منع کرنے سے ہم ہی وہابی ہوتے ہیں یا حضرت عبداللہ بن مسعود

مذہبی اس مبارک فتویٰ سے کچھ حصہ نصیب ہو سکتا ہے۔ جواب غور سے دینا ہوگا۔

من نگویم کہ این مکن آن کن مصلحت ہیں و کار آساں کن

حضرت ابن مسعود کا مقام جناب رسول اللہ ﷺ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اقتاب نبوت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں۔ سے اکتساب نور کرنے کے بعد تمام حضرات صحابہ

کرام نجوم ہدایت تھے۔ مگر بعض کو ایسے ایسے جزوی فضائل اور مناقب حاصل تھے کہ دوسرا کوئی ان میں

ان کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان میں ایک شخصیت حضرت عبداللہ بن مسعود کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم کو ان پر اس درجہ اعتماد تھا کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "جس چیز کو تمہارے لئے ابن مسعود پسند

کرنے میں بھی تمہارے لئے اس چیز کو پسند کرتا ہوں اور اس پر راضی ہوں۔" (مشترک ج ۳ ص ۱۹۳ صحیح)

اور نیز ارشاد فرمایا کہ "جس چیز کو تمہارے لئے عبداللہ بن مسعود پسند نہ کرے میں بھی اس چیز کو تمہارے

لئے پسند نہیں کرتا۔" (الاستیعاب ج ۱ ص ۳۵۹)۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود حضرات خلفاء

راشدین سے بھی کتاب اللہ کے بڑے عالم ہیں۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۲۹۳)

آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ حضرات صحابہ کرام میں درجہ اول کے مفسر جن کو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کا کلمی اعتماد حاصل ہے۔ وہ اس اجتماعی صورت میں ذکر بالجہر کرنے اور مل کر بلند آواز کیساتھ درود

شریف پڑھنے والوں کو بدعتی کہتے ہیں اور اس فعل کو پسند نہیں کرتے۔ جب ان کو یہ فعل پسند نہیں تو سابق

روایت کے پیش نظر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی یہ فعل ہرگز پسند نہیں۔ اب جس کا

جی چاہے ان کی پیروی کرے یا کسی اور کی۔ ع۔ نبی اپنا اپنا امام اپنا اپنا۔

بالکل تنہائی میں یا تعلیم کی خاطر ذکر بالجہر کا معاملہ الگ ہے۔ راقم نے اس کی پوری تفصیل اپنی کتاب

علم الذکر بالجہر میں کر دی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما: حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عمرو بن لؤی

مسجد میں داخل ہوئے:

فاذا عبد اللہ بن عمر جالس الى حجرة تو دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر حضرت عائشہ کے حجرہ کے

عائشۃؓ والناس يصلون الضحیٰ فی
المسجد، فسألناه عن صلواتهم فقال
بدعة۔ (بخاری ج ۲۳۸، مسلم ج ۱ ص ۹۰)

پاس بیٹھے ہیں اور کچھ لوگ مسجد میں چاشت کی نماز پڑھ
ہے ہیں ہم نے حضرت ابن عمرؓ سے ان لوگوں کی نماز کے
بارہ میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ بدعت ہے۔

چاشت کی نماز صحیح اسانیر کے ساتھ متعدد حضرات صحابہ کرامؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم سے روایت کی ہے لیکن چونکہ آپ کے زمانہ مبارک میں اجتماعی ہدیت سے خاص اہتمام اس کے لئے
نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ کیف ما اتفق بہاں جہاں بھی کوئی ہوتا تھا، وہاں ہی وہ نماز چاشت پڑھ لیتا تھا۔
اور یہ نفل نماز ہے اور نفل نماز کو بجائے مسجد کے گھر میں پڑھنے کی زیادہ فضیلت حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ مگر
حضرت ابن عمرؓ نے جب لوگوں کو اس نماز کے لئے مسجدوں میں اجتماع اور خاص اہتمام دیکھا۔ تو ان کے اس
نفل کو انہوں نے بدعت قرار دیا۔ چنانچہ اسی روایت کی شرح میں حضرت امام نوویؒ لکھتے ہیں :

مرادہ ان اطہارہا فی المسجد والاجتماع
لہا ہو بدعة لان اصل صلوة الضحیٰ
بدعة۔ (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۹۰)

حضرت ابن عمرؓ کی مراد یہ ہے کہ چاشت کی نماز کو مسجد میں
ظاہر کر کے پڑھنا اور اس کے لئے اجتماع اور اہتمام کرنا
یہ بدعت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی یہ مراد نہیں کہ اصل سے
چاشت کی نماز ہی بدعت ہے۔

تہجد کی نماز کی بہت بڑی فضیلت حدیثوں میں آئی ہے اور یہ بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جماعت کے ساتھ تہجد کی نماز ادا کی ہے۔ لیکن اگر اس کے لئے بھی ضرورت سے نہ اند
اجتماع کیا گیا تو وہ بھی مکروہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک ایسے فرقہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”نماز تہجد را بجماعت میگذارند از اطراف و
جوانب در آن وقت مردم از برائے نماز تہجد جمع می گردند
و جمعیۃ تمام ادا مینمایند و ایس عمل مکروہ است بکراہت
تکریمی جمعی از فقہا کہ تہجد اسی شرط کراہت اشدہ اند جواز
جماعت نفل را مقید بنا حیح مسجد ساختہ زیادہ از کس

نماز تہجد کو جماعت سے ادا کرتے ہیں اور اطراف و جوانب سے اس
وقت لوگ نماز تہجد کے لئے جمع ہوتے ہیں اور خاص اہتمام سے
اس کو ادا کرتے ہیں اور یہ عمل مکروہ ہے اور کراہت بھی اس
میں تحریمی ہے۔ حضرات فقہا کی ایک جماعت تداعی اور اہتمام
کی شرط کو مکروہ کہتی ہے اور نفل نماز کے باجماعت ادا کرنے کو

رابطہ اتفاق مکروہ گفتہ اند۔

مسجد کے کورنر کے ساتھ مقید کرتی ہے اور تین سے زائد آدمیوں کے اجتماع کو بائفاق مکروہ کہتی ہے۔

(مکتوبات حصہ سوم ص ۱۸۱)

امام ابنِ قتیق العیّد فرماتے ہیں کہ :

الاحترى ان ابن عمر قال في صلاة الفصحى انها بدعة لانه لم يثبت عندها فيها دليل ولم ير

ادراجها تحت عمومات الصلوة تخصيها بالوقت المخصوص وكذلك قال في القنوت

الذي كان يفعله الناس في عصره انه بدعة ولم ير ادراجها تحت عمومات الدعاء وكذلك

روى الترمذی من قول عبد الله بن مغفل لا يثبت في الجهر بالبسملة اياك والحدث و

لم ير ادراجها تحت دليل عام

(الحكام الاحكام ج ۱ ص ۱۵۱)

یہ معلوم ہے کہ نفس نماز، قنوت اور بسم اللہ کی بڑی فضیلت آئی ہے مگر چونکہ مخصوص بہیت اور کیفیت سے اور خاص اوقات کے اندر ان کا ثبوت نہ تھا، اس لئے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن مغفلؓ نے ان کو بجائے عمومات کے تحت درج کرنے کے بدعت کہا اور اس سے بچنے کی تلقین کی۔

علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ :

ان الاصل اذا ثبت في الجملة لا يلزم اثباته

في التفصيل فاذا ثبت مطلق الصلوة لا يصح

منه اثبات الظهر والعصر او الوتر او غيرها

حتى ينس عليه على الخصوص (الاعتصام ص ۱۸۲)

کسی چیز کی اصل جب اجمالی درجہ میں ثابت ہو اس سے یہ تفصیلی

رنگ میں اس کا ثبوت لازم نہیں آتا (مثلاً) جب مطلق نماز ثابت

ہو تو اس سے ظہر و عصر یا وتر وغیرہ کسی خاص نماز کا اثبات

نہیں ہوتا تا وقتیکہ خصوصیت کے ساتھ اس کی تصریح نہ ہو۔

اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: اتباع وحی باید کرد بسیار امرے محمود کہ در حد ذات
فضیلت دار و اما مخصوص مقام وار و نشدہ و درست نیامدہ چنانچہ مصافحہ بعد از نماز و امثال آن۔ (اشعۃ
اللغات)۔ نیز لکھتے ہیں کہ: آنکہ بعضے مردم مصافحہ میکنند بعد از نماز یا بعد از نماز جمعہ چیزے نیست و بدعت
است از جهت تخصیص وقت۔ (اشعۃ اللغات ج ۲ ص ۱۱۱)۔

اگرچہ اپنے مقام پر مصافحہ اور معانقہ سنت ہے مگر چونکہ ہر نماز کے بعد اور اسی طرح نماز جمعہ کے بعد
اس کا ثبوت نہیں، لہذا یہ بدعت ہے۔ معتقد و کتابوں میں اس مصافحہ کی تردید کی گئی ہے۔ مثلاً التوشیح،
للعلامہ طیبی۔ ملقط۔ ایضاح المطالب من حک الطالبین۔ خلاصۃ الفقہ۔ کافی۔ فتاویٰ ابوالہمیم
شاہی۔ ناصری۔ حاشیۃ المصابیح۔ مجالس ابرار۔ مدخل اور فتاویٰ ابن حجر وغیرہ (دیکھئے الجنبہ ص ۱۱۱)۔
علامہ طیبی لکھتے ہیں:

یکرہ المصافحۃ بعد اداء الصلوٰۃ علی کل حال
لانہا من سنن الروافض و ہکذا حکم فی
المعانقہ۔ (انتہی) بحوالہ الجنبہ ص ۱۱۱)۔
نماز سے فارغ ہو چکنے کے بعد مصافحہ کرنا ہر حالت میں
مکروہ ہے کیونکہ یہ رافضیوں کی سنت ہے اور یہی حکم
معانقہ کا ہے۔

باقی امام نووی نے جو کتاب الاذکار میں اس مصافحہ کو لا بائس بہ کہا ہے تو یہ ان کی غلطی ہے چنانچہ
ملا علی القاری اور ابن امیر الحاج نے امام نووی کی شرح و بسط سے تردید کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ
یہ مصافحہ بدعت ہے۔ علامہ شاطبی لکھتے ہیں:

لا دلیل فی الشرع یدل علی تخصیص تلك
الاقوات بھا بل ہی مکروہۃ (الاتصام ج ۲ ص ۱۱۱)۔
شرع میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے ان اوقات کے اندر
مصافحہ کی تخصیص ثابت ہوتی ہو بلکہ یہ مصافحہ مکروہ ہے۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ احکام عامہ سے امور خاصہ کا اثبات ہرگز صحیح نہیں ہے، تا وقتیکہ ان کی
تخصیص کے لئے کوئی الگ اور مستقل خاص دلیل موجود نہ ہو۔ کیونکہ شریعت کی کسی عام دلیل کو اپنی مرضی سے
خاص کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ مطلق کو اس طرح مقید کر دینا اور عموماً کو اس طرح سے خصوص کے
قالب میں ڈھال دینا، یہی احداث فی الدین اور منصب تشریح پر دست اندازی ہے۔ امام غزالی نے

کیا خوب کہا ہے :

فالتقييد في المطلقات التي لم يثبت بدليل
الشرع تقييدها رأياً في التشريع (الاعتصام ج ۱ ص ۲۸۲)
کہ ان مطلقات کو تقييد کرنا کہ جن کی تقييد شریعت سے ثابت
نہیں ہے، شریعت میں اپنی رائے کو دخل دینا ہے۔
دلائل شرعیہ کی موجودگی میں اپنی رائے سے قیاس کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑے
مجرم ہیں خصوصاً جب کہ ان میں اجتہاد اور تفقہ کی صحیح معنوں میں اہلیت ہی موجود نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تَقُولُوا لِمَا نَصَبْنَا لَكُمْ آيَاتٍ لَّا تُحِلُّهَا
هَذَا حَرَامٌ لَّا يَنْفَرُ دَاعِيَا اللّٰهِ الْكٰذِبِ - الآية (پہلا، النحل ۱۵۰)
اور مت کہو اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے کہ یہ حلال
ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر بہتان باندھو۔

حافظ ابن کثیر اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

ويدخل في هذا كل من ابتدع بدعة ليس له فيها
مستند شرعي او حل شيئاً مما حرم الله او حرّم شيئاً
مما اباح الله بمجرد رأيه وتثريبه (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۹)
کہ اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جس نے بلا دلیل شرعی کے کوئی عبت
گھڑی یا محض اپنی رائے اور خواہش سے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی
چیز کو حلال یا حرام کی ہوئی کو حلال کر دیا۔

علامہ آلوسی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے معنی کا حائل جیسا کہ امام عسکری نے صراحت کی
ہے یہ ہے کہ تم اس چیز کو حلال و حرام مت کہو جس کی حلت و حرمت خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق سے ثابت نہ ہو ورنہ
تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہنے والے ہو جاؤ گے۔

لان مدار الحلال والحرمۃ لیس الا حکمۃ سبحانہ (روح المعانی ج ۱ ص ۲۴)
کیونکہ حلت اور حرمت کی مدار صرف اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہے۔

اور یہی حال ہے زمانہ حال کے مبتدعین کا کہ وہ ہر بات کو اپنی نارِ ساعقل سے ثابت کرنے کی
سعی کرتے ہیں۔ وہ نصوص قطعیہ اور احادیث صحیحہ کی باطل تاویلات کر کے خود بھی گمراہ ہوتے اور لوگوں کو
بھی گمراہ کیا اور وہ بدعت کو لے کر اس سے سنت کو مٹانے کے ورپے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

سیلی امور کہ بعدی رجال یطفون السنۃ
میرے بعد کچھ مرد تمہارا امور کے سر پرست بنیں گے۔ وہ

بالبدعة - رواہ ابن ماجہ (جامع العلوم والحکم ص ۲۱۱) بدعت سے سنت کو مٹائیں گے۔

اور یہی اہل بدعت کا وطیرہ ہے کہ وہ اپنی خواہش اور عقل کو ہر مقام پر دخل دیتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے؟ اس میں کیا گناہ اور عیب ہے؟ اس میں کیا خرابی ہے؟ یہ بھی جائز ہے، یہ بھی مستحب ہے اور کارِ ثواب ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس پر انہوں نے مطلقاً غور نہ کیا کہ اگر ایک چیز مطلقاً جائز ہے تو قید لگانے سے شاید وہ جائز نہ ہو۔ دیکھئے قرآن کریم کا پڑھنا کارِ ثواب ہے مگر بحالتِ رکوع و سجود پڑھنا منع ہے (مسلم شریف ج ۱ ص ۱۹۱ وغیرہ)۔ غیر محرم عورت سے نکاح تو جائز ہے مگر اس صورت میں کہ اس کی بہن یا خالہ یا پھوپھی یا بھانجی پہلے نکاح میں موجود نہ ہو۔ اپنی بیوی کے ساتھ جماع تو جائز ہے مگر بقیہ حیض حلال نہیں ہے۔ بکری اور گندم وغیرہ تو حلال ہے مگر بقیہ چوری حرام ہے۔ کہاں تک اسی قاعدہ کو لکھا اور بیان کیا جائے الغرض اہل بدعت کی یہی اصولی غلطی ہے کہ وہ احکامِ عامہ سے امورِ خاصہ ثابت کرنے کی بے جا سعی کرتے ہیں۔

صاحب انوارِ ساطعہ کا ایک مغالطہ | مولوی عبدالسمع صاحب نے زرقانی، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق اور فتح الباری وغیرہ سے یہ نقل کیا ہے کہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر چاشت کی نماز کو بدعتِ حسنہ فرماتے تھے لہذا حضرت ابن عمر کا انکار مانعین کے لئے مفید نہیں۔ پھر آگے لکھتے ہیں:-
 ”پس مدعی بدعت ثابت کرنے والوں کا ثابت اور رد کرنے والوں کا رد ہو گیا“ (بلفظہ انوارِ ساطعہ ص ۲۱۱)۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ صاحب انوارِ ساطعہ نے اصل بات پر غور ہی نہیں کیا، ورنہ وہ برگزیدہ غلطی کا شکار نہ ہوتے۔ حضرت مجاہد کی روایت جو بخاری اور مسلم کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے، اس میں سوال چاشت کی نماز کے بارے میں نہیں ہے کہ آیا وہ بدعت ہے یا سنت۔ بدعتِ حسنہ ہے یا سیئہ؟ وہاں یہ مذکور ہے کہ پوچھنے والوں نے حضرت ابن عمر سے یہ پوچھا ہے کہ یہ جو لوگ مسجد میں اجتماعی شکل میں نماز پڑھتے ہیں، ان کی یہ نماز کیسی ہے؟ اس کے جواب میں حضرت ابن عمر نے یہ فرمایا کہ یہ بدعت ہے اور اس بدعت کو وہ حسنہ سے متقید نہیں کرتے۔ اور مطلق بدعت سے بدعتِ سیئہ ہی مراد ہوتی ہے۔ ہاں نفسِ چاشت کی نماز کو وہ بدعتِ حسنہ فرماتے ہوں تو حجابات ہے۔ الغرض اثبات اور چیز کا ہے اور نفی اور چیز کی ہے۔ صاحب انوارِ ساطعہ کو بھی بالآخر یہ بات کھٹکی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

”اور بعض علماء نے یہ خیال کیا ہے کہ اصل نماز پر ان کا انکار نہ تھا۔ کیونکہ وہ تو ان کے نزدیک بدعتِ حسنہ، افضل و احسن کام تھا، اس پر کس طرح انکار فرماتے۔ بلکہ اگر انہوں نے انکار کیا ہے تو اس بات پر کیا ہے کہ لوگ اس کو نمازِ فرائض کی طرح جمع ہو کر اہتمام سے مسجدوں میں پڑھتے تھے۔ اور یہ بات خلافِ اصل تھی۔ (بلفظہ انوارِ ساطعہ ص ۱۸۱)

یہی ہم کہنا چاہتے ہیں کہ جس عبادت کو شریعتِ مطہرہ نے کسی خاص کیفیت اور مخصوص بہیت کے ساتھ متقیہ نہیں کیا، اور اس کے لئے کسی خاص اہتمام اور اجتماع کی ترغیب نہیں دی تو یقیناً یہ مخصوص طرز و طریقہ بدعت ہوگا۔

حضرت نافع (المتوفی ۱۷۰ھ) روایت کرتے ہیں کہ :

ان رجلا عطس الی جنب ابن عمر فقال
الحمد لله والسلام علی رسول الله فقال ابن عمر
وانا اقول الحمد لله والسلام علی رسول الله
ولیس هكذا علمنا رسول الله صلی الله علیه
وسلم علمنا ان نقول الحمد لله علی کل حال۔
(ترمذی ج ۱ ص ۹۱ قلت وسند لا یصح وشکوۃ ج ۱ ص ۱۸۱)

ایک شخص نے حضرت ابن عمر کے پہلو میں چھینک ماری اور اس
شخص نے خود کہا۔ الحمد لله والسلام علی رسول الله حضرت
ابن عمر نے فرمایا۔ اس کا تو میں بھی قائل ہوں کہ الحمد لله و
السلام علی رسول الله۔ لیکن ہمیں جناب رسول الله صلی الله
تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم نہیں دی۔ ہمیں اس موقع پر اس کی
تعلیم دی ہے کہ ہم الحمد لله علی کل حال کہا کریں۔

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ چھینک مارنے والا الحمد لله کہے۔ مگر اس موقع پر والسلام علی رسول
الله کے الفاظ کی آنحضرت صلی الله تعالیٰ علیہ وسلم نے تعلیم نہیں دی۔ پوچھتے حضرت ابن عمر سے کہ آپ نے
درود و سلام سے کیوں منع کیا اور والسلام علی رسول الله کے الفاظ سے آپ کو کیا تکلیف ہوتی ہے؟ کیا جناب
رسول الله صلی الله تعالیٰ علیہ وسلم پر سلام بھیجنا بھی گناہ ہے؟ بے موقع اور بے محل درود و سلام سے تو وہابی
منع کیا کرتے ہیں، آپ اس زمرہ میں کیسے شامل ہو گئے؟ مگر وہ تو سراپا مطیع رسول تھے۔ صلی الله تعالیٰ
علیہ وسلم اور حمد و سلام کے موقع اور محل کو بخوبی جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس سے منع کیا۔

مولوی عبیدالسمیع صاحب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس روایت کی یوں تاویل کرتے ہیں کہ ”در مختار کی

کتاب الذبائح میں ہے موطنان لا اذکر فیہما عند العطاس وعند الذبح۔ پس السلام علی رسول اللہ کہنا اُس کا مقابل نہیں کے واقع ہوا تھا۔ پھر الحاق امر نہیں عنہ کو کس طرح وہ رضی اللہ عنہ منع نہ فرماتے۔ امورِ منہیہ کو ہم بھی منع کرتے ہیں۔ (بلفظہ۔ انوار ساطعہ ص ۱۵۲)

جواب: قطع نظر اس سے کہ یہ روایت کیسی ہے۔ عرض یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ روایت کا یہ جواب برگز نہیں اور یہ توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائم ہے، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عطاس (چھینک) کے وقت اپنا نام مبارک لینے سے منع کیا ہے اس لئے میں تجھے اس سے روکتا ہوں۔ بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ میں اسلئے تمہیں روکتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس موقع پر ہمیں صرف الحمد للہ کی تعلیم دی ہے اور والسلام علی رسول اللہ چونکہ اس پر زائد ہے اس لئے میں اس کو جائز نہیں سمجھتا۔ یہ حدیث اس امر کی سند اور دلیل ہے کہ جو امر شرع میں ثابت ہوا ہو اس پر زیادہ کرنا منع ہے۔ حضرت ابن عمرؓ موطنان لا اذکر الخ سے استدلال نہیں کرتے جیسا کہ مولوی عبد السمیع صاحب نے غلطی کھائی ہے۔

حضرت سالم بن عبید (المتوفی ۸۵ھ) کے پاس ایک شخص نے چھینک ماری اور:

فقال السلام علیک فقال له سالم وعلیک و
علی اقلک فكان الرجل وحید فی نفسه فقال اما
انی لعاقل الا ما قال النبی صلی اللہ علیہ
وسلم۔ الحدیث

یہ کہا۔ السلام علیکم۔ حضرت سالم نے جواب دیا۔ تم پر اور
تمہاری ماں پر۔ اس جملہ سے وہ شخص ناراض ہو گیا حضرت
سالم نے کہا۔ بہر حال میں نے صرف ہی کچھ کہا ہے جو جناب
نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ (مُحْصَلہ)

(ترمذی ج ۲ ص ۹۵۰ - ابو داؤد ج ۲ ص ۳۲ - مشکوٰۃ ج ۲ ص ۱۵۹ - موارد النظم ص ۱۷۹)

اس روایت کے پیش نظر مولوی عبد السمیع صاحب نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ وہ انکار اسلئے
تھا کہ وظیفہ معینہ شرع کا جو الحمد للہ تھا، اُس نے چھوڑ کر تحیث ملاقات کا وظیفہ اُس کی جگہ قائم کیا تھا یہ

علی خان صاحب بریلوی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ "حدیث ثابت نہیں (بلفظہ ملفوظات حصہ دوم ص ۱۱۸ اور
علامہ سنن اوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں، ولا یصح (القول البدیع ص ۱۶۹) کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

تشریح جدید اور تبدیل دین ہے“ (بلفظہ، انوار ساطعہ ص ۱۵۲)۔ بس ہم بھی اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ جو چیز شریعتِ مطہرہ نے جس جگہ رکھی ہے، اُس کو اُسی جگہ رہنے دو۔ نہ مطلق کو مقید کرو اور نہ مقید کو مطلق۔ نہ عام کو خاص کرو اور نہ خاص کو عام۔ غیر ملکیت کو کیفیت اور ہیئتِ مخصوصہ کی زنجیر میں نہ جکڑو جس کو اجتماعی صورت میں کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، اس کو مجتمع ہو کر نہ کرو اور جس کو باوازا بلند کرنے کا حکم شریعت نے نہیں دیا، اس کو بلند آواز سے ادا نہ کرو۔ اور غیر معین بالوقت کو کسی وقت کے ساتھ خاص نہ کرو۔ کیونکہ یہ تشریح جدید اور تبدیل دین ہے، جس کا نام بالفاظ دیگر بدعت ہے اور اہل السنّت والجماعت کا دامن اس قبیح ترین حرکت سے یقیناً پاک ہے۔

حضرت مجاہد (المتوفی ۱۷۸ھ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے داخل ہوا۔ اذان ہو چکی تھی۔ ایک شخص نے تثنیہ شروع کر دی (ابن ابی شیبہ، مجاہد کے طریق سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مؤذن نے اذان کے بعد الصلوة الصلوة کے الفاظ تثنیہ کی، اور لوگوں کو نماز کی دعوت دی تو حضرت عمرؓ بن الخطاب نے فرمایا۔ تو پاگل ہے، تیری اذان میں جو دعوت تھی، کیا لوگوں کو بلانے کے لئے وہ ناکافی تھی؟) حضرت ابن عمرؓ نے مجاہد سے فرمایا:

اخرج بنا فان هذا بدعة (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۷۱) مجھے یہاں سے لے چل اس لئے کہ یہ بدعت ہے۔

حضرت ابن عمرؓ اس مسجد سے چلے گئے اور نماز تک وہاں ادا نہ کی۔ چنانچہ دوسری روایت میں ہے:

اخرج بنا من عند هذا المبتدع ولم مجھے اس بدعت کے ہاں سے لے چل۔ اور اُس مسجد میں

یصل فیہ (ترمذی ج ۱ ص ۲۱۵) نماز نہ پڑھی۔

حضرت ابن عمرؓ کی آخر عمر میں آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ اس لئے آپ نے اپنے قدم سے یہ فرمایا کہ مجھے یہاں سے لے چلو۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابن عمرؓ نے بدعت اور اہل بدعت سے کیسی نفرت کی کہ انہوں نے ان کی مسجد میں نماز پڑھنی بھی گوارا نہ کی۔ آج کل کا دور ہوتا تو لوگ یہ کہہ دیتے کہ مشتبہ نے کسی کو گالیاں تو نہیں دیں بلکہ وہ نماز جیسی بہترین عبادت کی طرف لوگوں کو بلارہا ہے، اور اللہ الٰہ علی الخیر کفاعلہ یہ آئیرا مستحق ہے، مگر حضرات صحابہ کرامؓ تو رمز شناس رسول تھے، ان کی دور رس نگاہیں بدعات کی

ظاہری چمک میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتی تھیں، وہ ہدایت کے اصل منبع اور سرچشمہ تک رسائی کر لیتی تھیں۔

امام نووی شرح مہذب میں لکھتے ہیں :

روى ان علياً راي مؤذناً يثوب في العشاء فقال اخرجوا هذا المبتدع من المسجد وعن ابن عمر مثله **البحر الرائق** بيان تثويب ^{۲۶۱} علامہ غزالی لکھتے ہیں کہ سلف صالحین نے جن بدعات کا انکار کیا ہے ان میں سے ایک تثویب بھی ہے۔
 کہ حضرت علیؑ نے ایک مؤذن کو عشاء کی نماز کے لیے تثویب کرتے دیکھا اور فرمایا اس بدعتی کو مسجد سے نکال دو، اور حضرت ابن عمرؓ سے بھی ایسی ہی روایت آتی ہے۔
 (الاعتصام ۱۱۴) کتب فقہ میں جس تثویب کا ذکر ہے وہ قاضی وغیرہ مشغول حضرات کو آگاہ کرنے اور توجہ دلانے کے لیے ہے نہ کہ درود شریف پڑھنا اور مؤذن کی طرح بلند آواز سے چلانا۔

حضرت علیؑ : حضرت علیؑ (المتوفی ۳۵ھ) سے ایک روایت ان الفاظ سے مروی ہے۔

ان رجلاً يوم العيد اراد ان يصلي قبل صلوة العيد فنهاه علي فقال الرجل يا امير المؤمنين اني اعلم ان الله تعالى لا يعذب على الصلوة فقال عليؑ واني اعلم ان الله تعالى لا يثيب على فعل حتى يفعل رسول الله صلى الله عليه وسلم او يحدث عليه فتكون صلاتك عبثاً والعبث حرام فلعله تعالى يعذبك به لمخالفتك لرسوله صلى الله عليه وسلم
 (شرح مجمع البحرين - كذا في الجنة ۱۶۵ و نظم البيان ۳۱)

ایک شخص نے عید کے دن نماز عید سے پہلے نفل نماز پڑھنی چاہی تو حضرت علیؑ نے اس کو منع کیا۔ اس نے کہا۔ اے امیر المؤمنین! میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نماز پڑھنے پر سزا دے گا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا اور میں بالیقین جاننا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی فعل پر ثواب نہ دے گا جس تک کہ اس فعل کو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کیا نہ ہو یا اسکی ترغیب نہ دی ہو۔ پس تیری یہ نماز فعل عبث ہوگی اور فعل عبث حرام ہے اور شاید کہ تجھے اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مخالفت کی وجہ سے سزا دے۔

حضرت علیؑ کی یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نماز عید سے قبل یہ نفل نماز ثابت نہیں۔ نہ آپ نے فعلاً ادا کی اور نہ قولاً اس کی ترغیب دی۔ اس لئے یہ فعل عبث ہے اور فعل عبث حرام ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نماز جیسی اہم اور پسندیدہ عبادت پر بھی محض اس لئے سزا دے کہ اس کے پیارے حبیب جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل سے یہ ثابت نہیں اور آپ نے اس کی

ترغیب بھی نہیں دی۔ آج کل کے مفتی اُس وقت ہوتے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ حضرت علیؑ پر کیسے کیسے فتوے لگاتے کہ وہ نماز جیسی عبادت سے منع کرتے ہیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

صاحبِ انوارِ ساطعہ اصولی طور پر اس روایت کو تسلیم کرتے ہیں مگر اپنی عادت کے مطابق اس کی تاویل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: "واضح ہو کہ یہ منع فرمانا فقط اسی باعث سے نہ تھا کہ نماز اس وقت میں آپ سے منقول نہیں ہے اور جب منقول نہیں تو بدعت ٹھہری جیسا کہ فریقِ ثانی مغالطہ میں پڑا ہے۔ بلکہ منع فرمانے حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کی ایک دلیل ہے جس پر علماء حنفیہ کا عمل ہے یعنی صریحاً نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے۔ شرح مجمع میں ہے روى انه عليه السلام قال لا صلوة في العيدين قبل الامام۔ یہی ہمارا دعویٰ ہے کہ احداث اس سے منع ہے جو امر و نہی شائع کے مخالف ہو الخ" (بلفظہ انوارِ ساطعہ ص ۳۹)۔ صاحبِ انوارِ ساطعہ اتنی بات تو صراحت سے تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے نمازِ عید سے قبل ایک شخص کو نفل نماز پڑھنے سے منع کیا تھا۔ لیکن حضرت علیؑ کے منع کرنے کی جو دلیل شرح مجمع سے نقل کرتے ہیں کہ چونکہ یہ نماز آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صریحاً نہی کے خلاف تھی، اس لئے حضرت علیؑ نے اس سے منع کیا۔ یہ غلط ہے اور توجیہ القول بہما لا یرضی بہ قائلہ کا مصداق ہے۔ سوال یہ نہیں کہ عید سے قبل نفل نماز کی ممانعت پر حضرات فقہاء احناف کے پاس کونسی دلیل ہے؟ اور آیا وہ دلیل آپ کا قول ہے یا عدمِ فعل؟ اور وہ اپنے مقام پر کسی صحیح سند سے ثابت ہے یا نہیں؟ اصل سوال یہ ہے کہ خود حضرت علیؑ نے اس شخص کو نمازِ عید سے قبل نفل نماز پڑھنے سے منع کرنے پر کونسی دلیل پیش کی ہے۔ صاحبِ انوارِ ساطعہ نے اس پر مطلقاً غور نہیں فرمایا۔ حضرت علیؑ نے اس منع کی دلیل صرف یہ پیش کی ہے:

وانی اعلم ان الله تعالى لا يثيب على فعل
حسنى يفعلہ رسول الله صلی اللہ علیہ و
اور میں بالیقین جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی فعل پر ثواب
نہ دیکتا جب تک کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو
نہ کیا ہو یا اس کی ترغیب نہ دی ہو۔

حضرت علیؑ کا یہ مان کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ارشاد اس امر کی غیر مبہم اور صاف دلیل

ہے کہ حضرت علیؑ نے اس شخص کو نماز سے اس لئے منع کیا تھا کہ ان کے نزدیک جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عمل سے یہ نماز ثابت نہ تھی اور اس کی ترغیب پر آپ کا کوئی قول بھی موجود نہ تھا۔ صاحب انوارِ اطہر کا وطیرہ ہی عجیب ہے۔ وہ خود قائل کی اپنی پیش کردہ دلیل کو ملاحظہ نہیں فرماتے اور گھر کی دلیل کو چھوڑ کر پٹوس سے دلائل تلاش کرتے ہیں۔ شاید انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گھر کی مرغی وال برابر۔ مگر یہ تو دلائل کا مقام ہے، خورد و نوش کا محل نہیں۔ یہاں غور و فکر اور اس کے ساتھ انصاف درکار ہے۔

ان مسائل میں ہے کچھ ڈرف نگاہی درکار۔ یہ حقائق ہیں تماشائے لب بام نہیں۔
حضرت عبداللہ بن عباسؓ : حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت طاؤس تابعی کو عصر کے بعد نماز پڑھتے دیکھا (اس روایت میں اس کی تصریح ہے کہ یہ نماز صرف دو رکعت تھی) تو انہوں نے ان کو منع کیا حضرت طاؤس نے عصر کے بعد نماز پڑھنے کی نہیں کی روایت کی تاویل پیش کی۔ حضرت عباسؓ نے سخت لہجہ میں ارشاد فرمایا :

ما ادری ايعذب ام يوجر لان الله تعالى يقول وما كان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضى الله ورسوله امرا ان يكون لهم الخيرة - (متحدک لچ ملا قال الحاکم والذہبی علی شرطہا)
 میں نہیں جانتا کہ اس کو اس نماز پر سزا ملے گی یا اجلے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ کسی مؤمن مرد اور مؤمن عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کریں تو وہ اپنے خیال کو اس میں جگہ دیں۔

اس روایت میں حضرت ابن عباسؓ نے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صریح قولی نہیں کی خلاف ورزی پر حضرت طاؤسؓ کو تنبیہ فرمائی ہے۔ لیکن پہلے گزر چکا ہے کہ جیسے آپ کے قول کی مخالفت گناہ ہے اسی طرح آپ کے عدم فعل کی مخالفت میں بھی کوئی ثواب نہیں بلکہ وہ بھی جرم ہی ہے۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے خلاف سنت نماز پڑھنے پر بھی طاؤسؓ کو سزا کا مستوجب گردانا ہے۔

حضرت سعید بن المسیبؓ : اس مضمون کی ایک روایت آتی ہے کہ ایک شخص عصر کی نماز کے بعد اکثر دو رکعتیں پڑھا کرتا تھا۔ اُس نے حضرت سعید بن المسیبؓ سے دریافت کیا کہ :

یا ابا محمد ايعذب بنی اللہ علی الصلوة قال لا لک ابو محمد! کیا مجھے اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے کی وجہ سے سزا دیگا؟

ولكن يعذبك بخلاف السنة - حضرت سعید بن المسیب نے فرمایا کہ نہیں لیکن تجھے خدا تعالیٰ

(مسند دارمی ص ۶۲) سنت کی مخالفت کی وجہ سے ضرور سزا دے گا۔

حضرت سعید بن المسیب بھی یہی کچھ ارشاد فرمانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ نفسِ نماز پر اللہ تعالیٰ کسی کو سزا نہیں دیگا کیونکہ وہ ایک عبادت ہے مگر ایسی نماز پر جس میں سنت کی خلاف ورزی ہو اللہ تعالیٰ ضرور سزا دے دیگا۔

حضرت عثمان بن ابی العاص : حضرت عثمان بن ابی العاص (المتوفی ۳۵ھ) کو کسی ختنہ میں دعوت دی گئی تو انہوں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ جب ان سے اس انکار کی وجہ دریافت کی گئی، تو صاف الفاظ میں یہ جواب ارشاد فرمایا کہ :

انا كنا لاناقي الحتان على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا ندعى له (مسند احمد ج ۲ ص ۲۱۴) ہم لوگ زمانہ رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ختنوں میں نہیں جایا کرتے تھے اور نہ اس کیلئے ہمیں دعوت دی جاتی تھی۔

حضرت عثمان بن ابی العاص بھی اسی قاعدہ سے کام لے رہے ہیں کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ختنوں میں بلائے جانے کا دستور نہ تھا اور نہ لوگوں کو دعوتیں موصول ہوتی تھیں اس لئے میں بھی اس میں شریک ہونے پر آمادہ نہیں ہوں۔ یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ختنوں میں شریک ہونے سے منع کیا ہے اور اس سے نہی فرمائی ہے لہذا میں شریک نہیں ہوتا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت علیؓ اور حضرت عثمان بن ابی العاص وغیرہ جلیل القدر حضرات صحابہ کرام نے نماز جیسی بہترین عبادت اور ذکر جیسی اعلیٰ قربت اور درود شریف جیسی عمدہ طاعت وغیرہ کو مخصوص کیفیت اور خاص ہیئت اور پابندی وقت کے ساتھ ادا کرنے سے محض اس لئے منع کیا کہ اس طرز و طریقہ سے یہ کام جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نہیں کئے اور ان کی ترغیب بھی نہیں دی اور آپ کے عہد مبارک میں ایسا نہیں ہوتا تھا، اس لئے یہ امور بدعت ہیں اور معمولی بدعت بھی نہیں، بدعتِ عظمیٰ اور بدعتِ ظلماء ہیں بلکہ ضلالت بھی ہیں اور گمراہی بھی ہیں اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا۔ خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نزدیک عمل وہی مقبول

ہوگا جو اخلاص اور اتباع سنت کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہو، اگرچہ وہ مقدار میں کم ہی کیوں نہ ہو، اور ایسا عمل بالکل رائیگاں ہوگا جو دیکھنے میں تو پہاڑ جتنا نظر آئے لیکن اس میں اخلاص اور اتباع سنت کی جان اور روح موجود نہ ہو۔ حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر کیا ہی خوب ارشاد فرمایا۔ ایک روایت آتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمنؓ بن ابی بکرؓ کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں کسی بی بی نے کہا۔ اگر عبدالرحمنؓ کے بچہ پیدا ہوا تو ہم (عقیقہ میں) ایک اونٹ ذبح کریں گے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ:

لَا بِلِ السَّنَةِ أَفْضَلَ عَنِ الْغَلَامِ شَاتَانِ
مَكَافِئَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ مِثْلَةُ
(مستدرک ج ۲۳۸ قال الحاكم والذہبی صحیح)
نہیں، بلکہ سنت ہی افضل ہے وہ یہ کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے (عقیقہ میں) ایک بکری ہی کافی ہے۔

اونٹ اور دو بکریوں کی قیمت اور گوشت کا اگر موازنہ کیا جائے تو نمایاں فرق نظر آئے گا مگر حضرت عائشہؓ بکریوں کے بجائے اونٹ پھنس ایسے راضی نہیں کہ انکے نزدیک سنت کے خلاف ہے ایسے اگر اسکی قیمت یا گوشت زیادہ ہے تو پھر بھی اسکی چنداں قدر نہیں ہے سنت ہی افضل ہے اور اسکی پابندی لازم ہے جمہور اونٹ اور گائے کا عقیقہ بھی جائز قرار دیتے ہیں حضرت انسؓ کی مرفوع حدیث الطبرانی فی الصغیر ص ۴۵ میں ہے: يعق عندهم الابل والبقر والغنم۔ (دیکھئے نوح الباری ص ۹۳ و نیل الاوطار ص ۱۲۶)

بدعت کی تردید کے بعض عقلی دلائل | دنیا کی ہر حکومت نے اپنی رعایا کی بہبودی کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں قوانین مرتب کئے ہوتے ہیں اور ان پر ان کا چلنا نہایت ضروری ہوتا ہے اور انکی خلاف ورزی کو کوئی حکومت گوارا نہیں کرتی۔ اگر کوئی شخص مملکت پاکستان میں ہندوستان، برطانیہ اور امریکہ وغیرہ کے نوٹ چلانا چاہے تو یہ ایک جرم ہوگا اور حکومت ایسے شخص پر مقدمہ چلائے گی۔ اگر پاکستانی فوج کا کوئی سپاہی امریکہ وغیرہ کسی غیر ملکی فوج کی وردی اور یونیفارم پہن کر ڈیوٹی پر حاضر ہوتا ہے تو اس کا حشر سب کے سامنے ہے۔ غیر ملکی وردی اور یونیفارم کی تو بات ہی جانے دیجئے، اگر یہی فوجی سپاہی ٹکٹ کلکٹر کی وردی میں حاضری دے تو اس کا انجام بھی مخفی نہیں ہے۔ الغرض جس محکمہ کے لئے جو لباس اور وضع قطع، جو وردی اور یونیفارم حکومت وقت متعین کر کے اس کی پابندی لازم ٹھہرائی

کیا مجال کہ کوئی اس کی مخالفت کر سکے۔ اسی طرح کوئی شخص ریلوے ٹکٹ کی جگہ چوگنی رقم کا ڈاک خانہ کے محکمہ کا منظور شدہ ٹکٹ دے کر کامیاب نہ ہوگا۔ اور دس پیسے کے کارڈ پر بیس روپے کارڈ کے ٹکٹ لگانا بے کار ہوگا۔ پھر کیا غضب ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعین کئے ہوئے طرق عبادات میں اپنی طرف سے تغیر روارکھا جائے اور اس پر گرفت بھی نہ ہو۔ خدائی حکومت نہ ہوتی اندھیرنگری ہوتی (العیاذ باللہ تعالیٰ)۔ دُور نہ جائیے ہمارے روزمرہ کے معمولات میں سے ہے کہ درزی اور موچی کو اپنے لباس اور پاپوش کا ناپ اور نمبر دیتے ہیں۔ اگر ایک گزہ اور ایک انچ بھی ہمارے حساب سے اُوپر نیچے ہو جائے تو ہم وہ لباس اور جوتا درزی اور موچی کے سر پر دنے مارتے ہیں کہ یہ ہمارے پیمانے پر پورے نہیں اُترتے۔ کپڑا بھی وہی ہو جو ہمیں پسند تھا، اور چمڑا بھی وہی ہو، جو ہمیں مرغوب تھا، مگر ہے وہ ہمارے معیار سے کم یا زیادہ، ہم اس کو کبھی لینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وعلیٰ ہذا القیاس، وزن اور پاپ وغیرہ میں کسی طرح کمی و بیشی ہم گوارا نہیں کرتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اعمال کا ایک معیار، ہمارے افعال کا ایک مقیاس اور ہماری زندگی کا ایک نمونہ بتایا ہے، اور وہ اُسوۂ رسول، سیرت رسول اور اتباع رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ہے۔ اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور تبع تابعینؓ اس نمونہ پر صحیح اُترنے والے ہیں۔ اس اسلامی یونیفارم اور اس اتباع سنت کی وردی کے خلاف تمام فیشن، جملہ رسوم اور ہر قسم کی بدعات خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کامل و مکمل آئین اور نظام میں مرود ہیں اور اُن پر عمل پیرا ہونے والا کوئی بھی شخص کسی طرح حقیقی نجات و فلاح کا مستحق نہیں ہے۔

الحاصل نہ تو کوئی حکومت زندگی کے کسی شعبہ میں رعایا کو اپنی خواہش اور مرضی پر چھوڑتی ہے اور نہ ہم اپنے مزدوروں اور اجیروں کو اُن کی رائے پر چھوڑتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ شریعت اسلامی ایسے اعمال اور عبادات ہم سے قبول کرے، جو اُس کے بتلائے اور متعین کئے ہوئے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

سنت اور بدعت کے مقام اور اس کی صحیح پوزیشن کو سمجھنے والے کے لئے یہ چند حروف بھی

کافی ہیں۔ ہاں البتہ زمانے والے کے لئے دفتر کے دفتر بھی بالکل بے کار ہیں۔ سنت کو (جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا قول و عمل ہے) اگر اصلی شکل و صورت میں محفوظ رکھا جائے، تو وہی قیمتی موتی ہے اور اس کی قیمت دنیا و مافیہا کے خزانے بھی پوری نہیں کر سکتے۔

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ

گہر میں آبِ گہر سے سوا کچھ اور نہیں



باب پنجم

کیا بدعات میں کوئی خوبی اور ان پر دلائل بھی پیش کئے جاتے ہیں؟

دنیا میں شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس میں اس کی خرابی کے باوجود اس میں کوئی خوبی نہ ہو۔ شراب اور جوئے جیسی بدترین چیز کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یوں ہے :

فِيهِمَا اَثَمٌ كَبِيرٌ وَ مَنَافِعٌ لِلنَّاسِ ط ان دونوں میں گناہ بڑا ہے اور لوگوں کیلئے ان میں (پٹ - بقرہ - رکوع ۲۴) کچھ منافع بھی ہیں -

یہ ٹھیک ہے کہ ان میں گناہ بہت ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ان میں فی الجملہ منافع کا ذکر بھی کیا ہے لیکن ان قلیل منافع کی وجہ سے ان کو جواز کا درجہ حاصل نہ ہو سکا بلکہ ان کے مضرت اور مفاسد کے پہلو کو غالب قرار دے کر ان کو ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے دیا گیا اور اکبر الکتبات کی مد میں ان کا شمار کیا گیا۔ جب بھی کسی گمراہ فرقہ نے کوئی بد سے بدتر بدعت، دین کے نام پر ایجاد کی ہے تو اُس نے اس میں محاسن اور خوبیوں کا دعویٰ بھی ضرور کیا ہے۔ اور اس کی ترویج اور اشاعت کے لئے خدا اور مذہب کے نام پر، رسول اور اولیاء سے عشق اور محبت کے نام پر کچھ نہ کچھ دلائل بھی تراشے ہیں اور ضرور ایسا پیرایہ اختیار کیا ہے جس سے ایک عام اور سادہ لوح مسلمان خواہ مخواہ مغالطہ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مشرکین عرب نے شرک جیسے بدترین اور قبیح ترین فعل کو جائز اور مستحسن ثابت کرنے کیلئے تقرب الہی کا نام ہی تو لیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ (مشرکوں نے کہا) ہم ان (درمیانی وسائط) کی پوجا نہیں

زُلْفٰی - (پک - زمر - رکوع ۱) کرتے۔ صرف اس لئے کہ یہ ہیں خدا تعالیٰ کے قریب کہتے ہیں

اور دوسرے مقام پر ذکر فرمایا کہ مشرکوں نے یہ کہا :

هُوَ لَآءِ شُفَعَاءٍ تَاعِنَدُ اللّٰهَ (پک - یونس رکوع ۲) یہ ہمارے وسائل اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری سفارش کہتے ہیں

دیکھا آپ نے کہ مشرکین نے شرک کی اثبات کے لئے تقریبِ خداوندی کے خوش کن الفاظ سے تسکینِ قلب کا سامان مہیا کیا، پھر انہی مشرکین نے ملتِ ابراہیمی میں ایک بدترین بدعت ایجاد کی، کہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت وہ بالکل مادرِ زاونگے ہو جاتے تھے حتیٰ کہ عورتیں بھی ایک معمولی سے چھتھرے کے علاوہ (جو شرمگاہ کو ڈھانپنے کے لئے بھی کافی نہ ہوتا تھا) تمام لباس اتار کر یہ کہتے ہوئے طواف کرتی تھیں: الیوم یبد و بعضہ اوکلہ۔ فما بدا منه فلا احلہ (مسلم ج ۲ ص ۲۲۱ و سنن الکبریٰ وغیر) یعنی آج کے دن اگر میرے بدن کا بعض حصہ یا سارا ظاہر ہے تو میں اس ظاہر شدہ حصہ کو کسی کیلئے حلال نہیں کرتی۔ اور اس قبیح فعل کی توجیہ یوں نقل کی گئی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ کپڑے پہن کر ہم روزِ مژہ گناہ کرتے ہیں، پھر انہی کپڑوں میں اللہ تعالیٰ کے پاک گھر کا طواف کیسے کریں؟ نیز ہم کپڑے پہن کر فی الجملہ دنیا دار ہوتے ہیں اور رب العزت کے گھر کا طواف ہم دنیا کی تمام آلائشوں سے پاک ہو کر کیوں نہ کریں؟ مگر آپ نے دیکھا کہ خدا تعالیٰ نے (قرآن کریم میں) اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے اس باطل اور بے ہودہ تصوف کی کیسی خبر لی؟ اور کس طرح ۸۰ھ میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایام حج میں یہ اعلان کروایا، کہ خبر وار آج کے بعد کوئی مشرک یا کوئی برہنہ طواف نہیں کر سکتا۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۰۰ وغیر) صدیوں کی بدعت اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوں ختم کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کیا ہی پتے کی بات ارشاد فرمائی ہے :

اما بعد اوصیک بتقوی اللہ والاقتصاد
فی امرة واتباع سنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ و
سلم وتروک ما احدث المحدثون بعد ما جرت
اما بعد میں تجھے خدا تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کے حکم میں
میانہ روی اختیار کرنے اور اس کے نبی صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم کی سنت کے اتباع کرنے کی وصیت کرتا ہوں

اور یہ وصیت کرتا ہوں کہ اہل بدعت نے جو بدعتیں ایجاد کی ہیں ان کو ترک کرنا، جبکہ سنت اس سے قبل جاری ہے اور سنت کی موجودگی میں بدعت کی ایجاد کی کیا مصیبت ہے؟ سنت کو مضبوطی سے پکڑنا کیونکہ خدا تعالیٰ کے حکم سے سنت حفاظت کا ذریعہ ہے اور جان لے کہ لوگوں نے جو بدعت ایجاد کی ہے اس سے قبل ہی وہ چیز گذر چکی ہے جو اس پر دلیل ہو سکتی تھی یا اس میں عبرت ہو سکتی تھی کیونکہ سنت ان پاک نفوس کی طرف سے آئی ہے جنہوں نے اس کے خلاف خطا، لغزش، حماقت اور تعمق کو بغور دیکھ لیا تھا اور اس کو اختیار نہ کیا۔ تو بھی صرف اس چیز پر راضی رہ جس پر قوم راضی ہو چکی ہے کیونکہ انہوں نے علم پر اطلاع پائی اور دور رس نگاہ سے دیکھ کر بدعت سے اجتناب کیا اور البتہ وہ معاملات کی تہ تک پہنچنے پر قوی تر تھے اور جس حالت پر وہ تھے وہ افضل تر حالت تھی۔ سو اگر ہدایت وہ ہے جس پر تم گامزن ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ان سے فضیلت میں بڑھ گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ارشاد واضح ہے کہ سنت جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرام کا بتلایا ہوا اور متعین کیا ہوا طریقہ ہے۔ سنت کے خلاف جو بدعت تھی اس طریقہ پر بھی ان کی نگاہ اٹھی ہے۔ مگر انہوں نے برگز اس کو اختیار نہیں کیا۔ اور آج جو دلائل اہل بدعت پیش کرتے ہیں بعینہا یہ دلائل اس وقت بھی موجود تھے، مگر نہ تو ان کو ان دلائل سے بدعت کا جواز معلوم ہوا اور ان میں ان کے نزدیک کوئی اسلحہ کو بھانے والی عبرت ہی نظر آئی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج ان دلائل سے بدعت کا جواز اور ثبوت مل سکتا ہے اور اُس وقت نہ مل سکا، لہذا تم اسی چیز کو

بہ سنتہ و کفوا مؤنتہ فصلیک بلزوم
السنتہ فانہا لک باذن اللہ عصمۃ ثم
اعلم انه لم یبتدع الناس بدعة
الا قد مضی قبلہا ما ہو دلیل علیہا
او عبرۃ فیہا فان السنۃ انما سنہا
من قد علم ما فی خلا فہا من الخطا
والزلل والحمق والتعمق فارض
لنفسک ما رضی بہ القوم لانفسہم
فانہم علی علم وقفوا وببصرنا فذ
کفوا ولہم علی کشف الامور کانوا
اقوی وبفضل ما کانوا فیہ اولی
فان کان الہدی ما انتم علیہ لقد
سبقتموہم الیہ۔

(ابوداؤد۔ جلد ۲۔ ص ۲۷۷)

اپنے لئے پسند کر د جس کو وہ پسند کر چکے ہیں۔ وہ بڑی فضیلت کے مالک اور دُور رس نگاہ رکھنے والے تھے اور ہدایتِ مستقیمہ پڑتے۔ پھر اگر آج یہ بدعات جائز اور کارِ ثواب ہیں تو اس کا یہی مطلب نکالے گا کہ ہم علم و تقویٰ میں دیانت اور ہدایت میں اُن سے سبقت لے گئے ہیں کہ یہ عبادات اور طاعات ان کو باوجود عمدہ ہونے کے نہ سوجھیں اور ہیں دستیاب ہو گئیں (العیاذ باللہ تعالیٰ)۔

علامہ شاطبیؒ تحریر فرماتے ہیں :

انك لا تجد مبتدعا ممن ينسب الى الملة الا وهو يستشهد على بدعتہ بدليل شرعی فينزلہ على ما وافق عقله وشهوته۔ (الاعتصام ج ۱ ص ۱۷۱)

تم کسی ایسے مبتدع کو نہ پاؤ گے جو ملت سے وابستگی کا مدعی ہو، مگر یہ کہ وہ اپنی بدعت پر کسی شرعی دلیل سے ضرور استشہاد کرتا اور اس طریق سے وہ اس کو اپنی عقل اور خواہش کے مطابق بنا لیتا ہے۔

اور حضرت مجدد الف ثانیؒ ارقام فرماتے ہیں :

"زیرا کہ ہر مبتدع و ضال عقائدِ فاسدہ خود را بزعم فاسد خود از کتاب و سنت اخذ می کند پس ہر معنی از معانی مفہومہ ازینہا معتبر نہ باشد۔" (مکتوبات حصہ سوم ص ۸ مکتوب ۱۹۲)

کیونکہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے فاسد عقائد کو اپنے فاسد خیال کے مطابق کتاب اور سنت سے اخذ کرتا ہے لیکن ہر معنی معانی مفہومہ میں سے حجت اور معتبر نہیں ہو سکتا۔

ان عبارات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر مبتدع اور گمراہ جو ملتِ اسلام سے وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے اپنے باطل اور فاسد عقائد اور خود تراشیدہ بدعات پر کتاب و سنت سے تسکینِ قلب یا الزامِ محکم کے لئے ضرور دلائل تلاش کرتا ہے اور ان دلائل کو اپنی نارِ ساقِ عقل اور اپنی خواہش کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کا قرآن اور حدیث کا نام لے کر خود فریبی میں مبتلا ہونا اور لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنا کسی طرح صحیح نہیں نہ اس کی سمجھ درست ہے اور نہ قرآن کریم اور حدیث شریف سے اس کی پیش کردہ دلیل ہی صحیح ہے۔ کیونکہ یہی دلائل حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے سامنے بھی تھے مگر ان کو یہ فاسد عقائد اور خود تراشیدہ بدعات

اور رسوم ان سے سمجھ نہ آسکے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج ان سے یہ عقائدِ باطلہ اور بدعتِ فاسدہ ثابت ہوں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے منکرینِ تقدیر کے ایک مغالطہ کو (کہ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جن سے تقدیر کی نفی معلوم ہوتی ہے) دور کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا کہ :

لقد قرؤا منه ما قرأتہ و علموا من
تأویلہ ما جہلتہ و قالوا بعد ذلک
کلہ بکتاب و قدر۔

یعنی حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور سلف صالحین نے
یہ آیتیں بھی پڑھی ہیں جن کو تم پڑھتے ہو لیکن وہ ان کے
مطلب کو سمجھے ہیں اور تم نہیں سمجھے اور انہوں نے یہ

ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۱) سب آیات پڑھنے کے باوجود تقدیر کا اقرار کیا ہے۔

مطلب واضح ہے کہ اگر تمہاری طرف سے پیش کردہ آیات کا وہی مفہوم ہوتا جو تم پیش کرتے ہو تو یہ آیات حضرات صحابہ کرامؓ اور اہل خیر القرون کے سامنے بھی تو تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان آیات سے ان کو یہ مطلب سمجھ نہ آسکا، اور تم اس مطلب کو سمجھ گئے، کیسے باور کر لیا جائے کہ تم حق پر ہو اور وہ باطل پر تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) نے کیا ہی فیصلہ کن بات ارشاد فرمائی ہے :

”و میزان در معرفت حق و باطل فہم صحابہؓ
و تابعینؓ است چنانچہ ایں جماعت از تعلیم
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالنظام قرآن
حالی و مقالی فہمیدہ اند در آن تخطیہ ظاہر
نکردہ واجب القبول است الی ان قال
اگر بر خلاف قرن اول حمل میکند پس در بدعت
او ملاحظہ باید نمود اگر مخالفت اولہ قطعیہ یعنی
نصوص متواترہ و اجماع قطعی است او را

حق اور باطل کے سمجھنے کے لئے میزان اور معیار حضرات
صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کا فہم ہے جو کچھ اس جماعت نے آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم سے حاصل کیا اور متعالی قرآن
کے انضمام کے ساتھ سمجھا ہے جبکہ اس فہم میں خطا ظاہر
نہ کی گئی ہو تو وہ فہم واجب القبول ہے (پھر آگے فرمایا)
اگر قرن اول کے خلاف کسی بدعتی نے کوئی مفہوم لیا
تو اس کی بدعت کو ملاحظہ کرنا ہوگا اگر اس کا متعین کردہ
مفہوم کسی قطعی دلیل مثلاً نصوص متواترہ اور اجماع قطعی

کافر باید شمر د اگر مخالفت اولہ ظنیہ قریبہ
الیقین است مانند اخبار مشہورہ و اجماع
عرفی گمراہ تو ان فہمید وون الکفر۔
کے خلاف ہے تو ایسے بدعتی کو کافر شمار کرنا چاہیے، اور
اگر یہ مخالفت ظنی دلائل کی ہے جو یقین کے قریب ہیں۔
مثلاً اخبار مشہورہ اور اجماع عرفی تو ایسے بدعتی کو گمراہ
(فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۵۶) سمجھنا چاہیے نہ کہ کافر۔

ان عبارات سے چند امور نہایت وضاحت سے ثابت ہوتے ہیں ① یہ کہ کوئی بدعتی اور
گمراہ محض دعویٰ کر کے ہی خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اپنے اس دعویٰ پر دلائل پیش کیا کرتا ہے۔
② دلائل بھی محض عقلی نہیں بلکہ قرآن کریم اور احادیث سے وہ اپنے فرعون پر دلائل لاتا ہے ③ مگر
قرآن کریم اور حدیث سے جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ④ اس لئے کہ یہی قرآن
اور حدیث حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہ سلف صالحین کے سامنے بھی تھے مگر انہوں نے ان
سے یہ مفہوم نہیں سمجھا جو اہل بدعت سمجھے ہیں۔ ⑤ قرآن کریم اور حدیث کا صحیح مفہوم صرف وہی
ہوگا جو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے سمجھا ہے۔ ⑥ اہل بدعت کا پیش کردہ مفہوم اگر دلائل
قطعیہ کے خلاف ہے تو کفر ہوگا، اور ظنی دلائل کے خلاف ہے تو بدعت اور گمراہی ہوگا بلکہ حضرت
شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ جو شخص اس زبان سے ناواقف ہے جس میں قرآن کریم نازل
ہوا تھا اور اسی طرح جو شخص آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور
تابعینؒ کی منقول تفسیر کو نہیں جانتا تو اس کے لئے فن تفسیر میں سرے سے دخل دینا ہی
حرام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

اقول يحرم الخوض في التفسير لمن لا يعرف
اللسان الذي نزل القرآن به والماتور
عن النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه
والتابعين من شرح غريب وسبب نزول
وناسخ ومنسوخ۔
میں کہتا ہوں کہ جو شخص اس زبان سے ناواقف ہو جس
میں قرآن کریم نازل ہوا ہے اور اسی طرح جو شخص غریب
لفظ اور نشان نزول اور ناسخ و منسوخ سے بے خبر ہو،
جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ
اور تابعینؒ سے منقول ہے تو ایسے شخص کے لئے تفسیر میں

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۷۱) دخل دینا ہی حرام ہے۔

اور اہل بدعت کی اپنی بدعت کی تائید میں ہر تفسیر نہ صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ سے منقول و ماثور ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے بالکل خلاف ہوتی ہے اور لطف یہ کہ وہ بھی محض خود تراشیدہ اور خود ساختہ، اور ایسے ہی لوگوں کی خود تراشیدہ تفسیر نے اُمتِ مرحومہ کا شیرازہ بکیر کرنا نہیں گمراہ کر دیا ہے۔ سچ ہے ع

اس چنیں ارکانِ دولت ملک را ویراں کنند

اور اگر کوئی تفسیر ماثور اور منقول بھی وہ پیش کرتے ہیں تو اس کی بنیاد بھی جعلی موضوع معلول شاذ اور منکر و ضعیف وغیرہ روایات اور آثار پر قائم کی جاتی ہے اور صحیح تفسیر سے عمدًا اغماض کیا جاتا ہے اور کوئی روایت سند کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہے تو اس کا معنی غلط لیا جاتا ہے اور یہی کچھ وہ قرآن کریم سے کرتے ہیں کہ اپنے باطل عقائد اور آراء کو اس میں دخل دیتے ہیں پچنانچہ امام سیوطیؒ (المتوفی ۸۹۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

جیسے اہل بدعت کے مختلف گروہوں نے باطل اعتقادات قائم کر لئے اور قرآن کریم سے اپنی باطل آراء پر استدلال کر کے اپنی مرضی پر اس کو ڈھال لیا حالانکہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ میں ان کا کوئی بھی پیش رو نہیں نہ رائے میں اور نہ تفسیر میں۔

مثل طوائف من اهل البدع اعتقدوا مذاهب باطلۃ و عمدوا الی القرآن فتاولوا علی رأیہم و لیس لہم سلف من الصحابۃ و التابعین لا فی رأیہم ولا فی تفسیرہم۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ :

حاصل کلام یہ ہے کہ جس نے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین کے مذاہب اور ان کی تفسیر سے اعراض کیا، اور اس کے خلاف کو اختیار کیا تو وہ شخص خطاکار بلکہ مبتدع ہوگا کیونکہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ

وفی الجملة من عدل عن مذاهب الصحابۃ و التابعین و تفسیرہم الی ما یخالف ذلک کان مخطئا فی ذلک بل مبتدعا لانہم کانوا اعلم بتفسیرہ و معانیہ کما انہم اعلم

بالحق الذی بعث اللہ بہ رسولہ۔

(تفسیر اتقان جلد دوم ص ۱۷۸ طبع مصر)

قرآن کریم کی تفسیر اہد اس کے معانی کو زیادہ جانتے

تھے جیسا کہ وہ اُس حق کو زیادہ جانتے تھے جو اللہ

تعالیٰ نے رسولِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے

ذریعہ بھیجا تھا۔

اور یہی علامت ہے غلط مذہب کی کہ اس کی بنیاد غلط روایت اور بے بنیاد روایت پر رکھی

جاتی ہے۔ اگر اہل بدعت حضرات صرف اسی اصول کو اچھی طرح سمجھ لیں تو ان کو جملہ محدثات اور بدعت

پر وہ از کار و لائل پیش کرنے سے یقیناً دستگیری حاصل ہو جائے۔

من انچہ شرطِ بلاغ است با تو میگویم

تو خواہ ازین سخنم پند گیر خواہ ملال



باب ششم

جب کسی چیز کے سنت اور بدعت ہونے میں اشتباہ واقع ہو
تو کیا کرنا چاہیے؟

سابقہ پیش کردہ دلائل سے بحمد اللہ تعالیٰ سنت اور بدعت کی حقیقت اور اس کا حکم واضح سے
واضح تر ہو گیا ہے۔ لیکن اگر بالفرض کسی کوڑ مغز اور گم فہم کو اشتباہ باقی رہے یا عوام الناس جو اس
قسم کے مسائل میں فریقین کے دلائل کا موازنہ کر کے صحیح رائے قائم کرنے سے قاصر ہوں تو ان کے لئے صحیح
راہ عمل صرف یہی ہے کہ وہ ایسے مشکوک اور مشتبہ کام کے پاس ہی نہ جائیں، اور اگر کسی چیز کے بدعت اور
سنت یا مستحب اور مباح ہونے میں شبہ ہو تو اس سے بچنا ہی ان کے لئے صحیح راہ عمل ہے، اور بالاتفاق
علماء ان کے لئے یہی طریقہ صحیح رہنمائی کے لئے بالکل کافی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوصہبہ بن معبذ (المتوفی
سہ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

والاثم ما حاك في نفسك و تردد گناہ وہ ہے جو تیرے نفس میں کھٹکے اور تیرے دل میں
في الصدر و ان افتاك الناس۔ تردد واقع ہو، اگرچہ لوگ (اور نام کے مفتی) تجھے

(رواہ احمد والدارمی مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۲) فتویٰ بھی دے دیں۔

اور حضرت علی بن السعدی (المتوفی سہ) فرماتے ہیں کہ:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ بندہ

لا يبلغ العبد ان يكون من المتقين حتى
يدع ماله باس به حذر الهما به باس۔

پر ہیزگاروں کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتا تا وقتیکہ وہ چیزیں
بے چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ وہ ذریعہ

(رواہ الترمذی وابن ماجہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۲) بلتی ہیں ایسی چیزوں کا جن میں حرج ہے۔

حضرت معاذ بن جبل کو جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو

ارشاد فرمایا:

لا تقضین ولا تفصلن الا بما تعلمون وان
اشکل علیک امر فقف حتی تبینہ او
تکتب الیّ فیہ۔ (ابن ماجہ ص ۱)

کہ تم بغیر علم کے کوئی حکم اور فیصلہ سرگرم صادر نہ کرنا اور اگر تم
پر کسی چیز میں اشکال گذرے تو توقف کرنا حتیٰ کہ تم اس
کو اچھی طرح روشن پا لو اور یا میری طرف خط لکھنا۔

حضرت نعمان بن بشیر (المتوفی ۶۲ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحلال بئین و الحرام بئین و بینہما مشتبہات
لا یعلیٰ ہا کثیر من الناس فمن اتقى الشبهات
استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع فی الشبهات
وقع فی الحرام كالراعى حول الحمى یوشک
ان یرقع فیہ۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۳، ابن ماجہ ص ۲۹۶)

کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی۔ ان دونوں کے درمیان
کچھ چیزیں مشتبہ ہیں ان کو بہت سے لوگ نہیں جانتے
سو جو شخص ان مشتبہات سے بچا تو اُس نے اپنا دین اور
عزت بچالی اور جو مشتبہات میں جا پڑا تو (گویا) وہ حرام
میں جا پڑا جیسے چراگاہ کے ارد گرد جانوروں کو چرانے والا

قریب ہے کہ چراگاہ میں جا پڑے۔

ان روایات سے آفتابِ نیم روز کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن امور میں اشتباہ
واقع ہو، ان میں اپنے دین اور عزت کو صرف اسی صورت میں محفوظ رکھنا جاسکتا ہے کہ ایسے کاموں
میں انسان دخل ہی نہ دے اور ان پر عمل پیرا ہو کہ ہرگز اپنی ابدی زندگی کو برباد نہ کرے اور خلیقِ خدا
کو گمراہ ہونے سے بچائے۔ خصوصاً ایسے کام جو کفر اور شرک و بدعت کا ذریعہ بنتے ہوں اور یہ معاملہ صرف
یہیں بس نہیں ہو جاتا بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تردد اور اشتباہ والے کاموں
سے بچنے کا صریح حکم ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت حسن بن علی (المتوفی ۴۵ھ) روایت کرتے ہیں،

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

يقول دع ما يريك الى مالا يريك فان

الخير طمانية وان الشر ريبة -

وہ چیز چھوڑ دے جو تجھے تردد اور اشتباہ میں ڈالے

اور ایسی چیز اختیار کر جو تیرے لئے باعثِ تردد نہ ہو

(مستدرک ج ۲ ص ۱۱۱ - قال الحاكم والذہبی صحیح) کیونکہ خیر باعثِ اطمینان اور شر باعثِ شک ہے۔

یہ صریح اور صحیح حدیث بھی اس امر کو روشن کر دیتی ہے کہ جس چیز میں تردد اور اشتباہ ہو، تو

ایسی چیز کو چھوڑنا ہی ضروری ہے کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی روشن سنتیں زندگی کے

بر شعبہ میں ہمارے پاس موجود ہیں جن میں کسی قسم کا ادنیٰ سے ادنیٰ شک اور شبہ بھی نہیں ہے اور وہی

روشن سنتیں طمانیتِ قلب کا کافی سامان مہیا کر دیتی ہیں اور ان کی خلاف ورزی شک اور شبہ کے

تاریک گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ احادیث میں اس کی تصریح آتی ہے کہ (کان النبی صلی اللہ علیہ

وسلم یحب التیامن) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (سر نہ لگانے، کپڑا پہننے، وضو کرنے میں چپے کہ

ہر کام میں) داہنے پہلو اور جانب کو ترجیح دیتے تھے۔ معزز حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ :

قال لا يجعل احدكم للشيطان شيئا من

صلاته يري ان حق عليه ان لا ينصرف

الا عن يمينه لقد رايت رسول الله صلی

الله عليه وسلم كثيرا ينصرف عن يساره -

(متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۷۸)

اس حدیث کی تفسیر اور تشریح میں مشہور محقق علامہ محمد طاہر الحنفی (المتوفی ۱۲۸۶ھ) فرماتے ہیں :

نيه من اصرة على امر مندوب وجعل

عزرا ولم يعجل بالرخصة فقد اصاب منه

الشيطان من الاضلال فكيف من اهتت

على بدعا او منكر - (مجمع البحار ج ۱ ص ۱۱۱)

کہ جس کسی نے کسی مندوب اور مستحب چیز پر اصرار کیا اور اس کو

عزیمت بنا لیا اور رخصت پر عمل نہ کیا تو گویا اس کو شیطان

نے گمراہی کے راستہ پر ڈال دیا۔ کیا حال ہوگا اس شخص کلبو

کسی بدعت اور بری چیز پر اصرار کرتا ہے۔

اور یہی الفاظ علامہ طیبی (الحنفی المتوفی ۱۳۱۲ھ) شرح مشکوٰۃ میں اور حضرت ملا علی قاری نے مراتب ۲۵۲ میں تحریر فرمائے ہیں جو اس امر کی واضح ترین دلیل ہے کہ بدعت اور منکر پر اصرار کرنا تو کجباری، اگر کوئی شخص امرِ مندوب اور مستحب پر یا زحمت پر بھی اصرار کرے گا تو وہ بھی شیطان کا پیروکار ہوگا اور اُس کے اس فعل میں شیطان کا حصہ ہوگا۔ علامہ برکلی الحنفی (المتوفی ۹۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

ثم اعلم ان فعل البدعة اشد ضورا
من ترك السنة بدليل ان الفقهاء قالوا
اذا تردد الحكم في شيء بين كونه
سنة وبدعة فتركه لازم۔ (طریقہ مجریہ ص)

تم جان لو کہ بدعت کا کام کرنا ترک سنت سے زیادہ
مضر ہے۔ دلیل یہ ہے کہ حضرات فقہاء کرام نے فرمایا
ہے کہ ٹھپ کوئی حکم سنت اور بدعت کے درمیان دائر
ہو تو اس کا ترک کرنا ہی ضروری ہوگا۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ :

وما تردد بين البدعة والسنة يتروك۔
(عالمگیری ج ۱ ص ۱۹۷)

جو چیز سنت اور بدعت کے درمیان دائر ہو وہ چھوڑی
جائے گی

اور علامہ شامی لکھتے ہیں کہ :

اذا تردد الحكم بين سنة وبدعة كان ترك
السنة راجحا على فعل البدعة (شامی ج ۱ ص ۱۲۹)

جب حکم سنت اور بدعت کے درمیان دائر ہو تو سنت
کا ترک کرنا فعل بدعت پر مقدم ہوگا۔

قاضی ابراہیم صاحب الحنفی فرماتے ہیں :

”جس کام کے بدعت اور سنت ہونے میں شبہ ہو اس کو چھوڑنے کیونکہ بدعت کا چھوڑنا

ضروری ہے اور سنت کا ادا کرنا ضروری نہیں۔“ (نفائس الازہار ترجمہ مجالس الابرار ص ۱۲۹)

اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں :

”وہرچہ دران شبہ بود توقف دران لازم۔“ (مکتوبات حضرت شیخ عبدعاشیہ

انخبار الانخبار ص ۱۲۹)

بلکہ علامہ ابن نجیم الحنفی لکھتے ہیں کہ :

ویلزم ان ما تردد بین بدعة و واجب جو چیز بدعت اور واجب اصطلاحی کے درمیان اصطلاحی فائدہ یترک کالسنة۔
 دائرہ ہو تو لازم ہے کہ اس کو سنت کی طرح ترک
 (مکرراتی - ج ۲ ص ۱۶۵) کر دیا جائے۔

یہ عبارات اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ جب کوئی چیز ایسی ہو کہ اس میں سنت کے پہلو کے ادا کرنے سے بدعت لازم آتی ہو تو سنت کے پہلو سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کو مطلقاً ترک کرنا ضروری ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے ساتھ بدعت کا پہلو بھی تو شامل ہے۔ سنت تو خیر پھر سنت ہے اگر کوئی چیز بدعت اور حضرات فقہاء کرام کے اصطلاحی واجب کے درمیان بھی دائرہ ہو تو اس کو بھی ترک کرنا لازم اور ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے فی الجملہ بدعت کی تردیح اور اشاعت کا اندیشہ ہے۔ اور بدعت اتنی قبیح ترین چیز ہے کہ شریعت مطہرہ اس کے وجود نامسعود تک کو گوارا نہیں کرتی، چہ جائیکہ اس کی نشر و اشاعت، کے ذرائع اور وسائل بہم پہنچائے۔ یہی وجہ ہے کہ بدعت کو ختم کرنے کے لئے مستحب، سنت اور حتیٰ کہ واجب تک کی قربانی بھی گوارا کر لی جائے گی مگر بدعت کو ہرگز ہرگز فروغ نہ دیا جائے گا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص دانستیاناً دانستہ بدعت میں آلودہ ہونا چاہے تو اس کی مرضی۔ ہمارے لئے سنت کافی ہے اور ہمیں ان محذورات اور مزخرفات میں الجھنے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا ہے، **وَاللّٰهُ دَرُّهُ**

و خیر امور الدین ما کان سنّة

و شرّ الامور المحدثات البدائع

قارئین! اگر آپ کو صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ سے لگاؤ اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عشق اور محبت ہے تو اس کا واحد طریق صرف یہ ہے کہ سنت کی اتباع کریں اور حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کے نقش قدم پر چلیں۔ وہی عقائد و اعمال اختیار کریں جو انہوں نے اختیار کئے اور ان تمام عقائد اور اعمال سے احتراز کریں جن سے انہوں نے احتراز کیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے قول (جو درحقیقت مرفوع حدیث میں ہے) کے مطابق مسجدوں میں

بھی اجتماع ہو اور ایمان سے بھی محرومی ہو۔

قال يأتي على الناس زمان يجتمعون في
المساجد ليس فيهم مؤمن۔

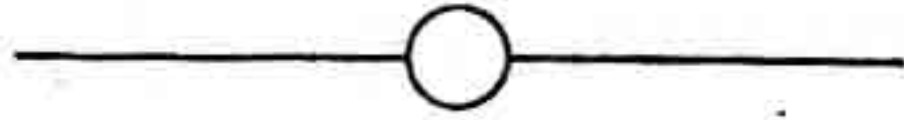
حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک ایسا وقت
آئے گا کہ وہ مسجدوں میں اکٹھے تو ہوں گے لیکن ان

(مسندک ج ۲ ص ۳۷۳، قال الحاكم والذہبی صحیح) میں ایک بھی مؤمن نہ ہوگا۔

یہ وہی حضرت ابن عمرؓ ہیں جنہوں نے تشویب جیسی بدعت کی وجہ سے ایک مسجد ہی ترک کر
دی تھی۔ الغرض اخلاص اور اتباع سنت کے ساتھ معمولی عبادت بھی مفید ہے اور شرک اور بدعت
کو دل میں جگہ دینے سے بڑی سے بڑی عبادت بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں منظور نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ
ہمیں اخلاص عمل اور اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے۔ صرف اسی کی بارگاہ سے سب کچھ مل سکتا ہے۔

اُسی سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر

یہی وہ در ہے کہ دولت نہیں سوال کے بعد



باب ہفتم

اس باب میں فرداً فرداً ان تمام بدعات پر بحث ہوگی، جن پر فریقِ مخالف عمل پیرا ہے اور جن کو وہ بزعم خود شعارِ خفیت قرار دیتا ہے

محل میلاد

اس میں شک و شبہ کی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ عشق و عقیدت اور محبت عین ایمان ہے۔ اور آپ کی ولادت سے لے کر وفات تک زندگی کے ہر شعبہ کے صحیح حالات و واقعات اور آپ کے اقوال و افعال کو پیش کرنا باعثِ نزولِ رحمتِ ایزدی ہے۔ اور ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ آپ کی زندگی کے حالات کو معلوم کرے اور ان کو مشعلِ راہ بنائے۔ سال کے ہر مہینہ میں اور مہینہ کے ہر ہفتہ میں اور ہفتہ کے ہر دن میں اور دن کے ہر گھنٹہ اور منٹ میں کوئی وقت ایسا نہیں جس میں آپ کی زندگی کے حالات بیان کرنے اور سننے ممنوع ہوں۔ یہ بات محلِ نزاع نہیں ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ربیع الاول کی بارہویں تاریخ کو مقرر کر کے اس میں میلاد منانا، محفل اور مجلس منعقد کرنا، جلوس نکالنا یا اسی دن کو مخصوص کر کے فقرا اور مساکین کو کھانا کھلانا، وغیرہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام اور اہل خیر القرون سے ثابت ہے؟ اگر ثابت ہے تو کسی مسلمان کو اس میں پس و پیش کرنے کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے کیونکہ جو کچھ انہوں نے فعلاً یا ترکاً کیا، وہی دین ہے اور اس کی مخالفت بے دینی ہے۔ تیس سال بعد از نبوت قوم میں زندہ ہے

اور پچتریس سال خلافتِ راشدہ کے گزرے ہیں اور پھر ایک سو دس ہجری تک حضرات صحابہ کرام کا دور رہا ہے۔ کم و بیش دو سو بیس برس تک اتباعِ تابعین کا زمانہ تھا، عشق ان میں کامل تھا، محبت ان میں زیادہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا احترام اور تعظیم ان سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے؟ اگر فریقِ مخالف ہمت کر کے ان سے یہ ثابت کر دے تو چشمِ مارو شن دلِ ماشاد، کسی مسلمان کو اس سے سرِ مؤختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر فریقِ مخالف خیر القرون سے اس کا ثبوت نہ پیش کر سکے اور تا قیامت نہیں کر سکے گا، تو سوال یہ ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے یہ مبارک کام اور کارِ ثواب اُس وقت کیوں نہ ہوا؟ اور آج یہ کیسے کارِ ثواب اور مبارک ہو گیا ہے؟ بس صرف اسی ایک نقطہ پر نگاہ جما کر دو ٹوک فیصلہ کرنا چاہیے۔ وہ تمام فوائد و برکات اور منافع اُس وقت بھی تھے، جن کو آج اہل بدعت حضرات بیان کرتے ہیں، اور خان صاحب بریلوی، مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی، مولوی عبدالستیع صاحب، مولوی محمد صالح صاحب، مفتی احمد یار خان صاحب اور مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے اس کے اثبات پر جو دُور ازکار، بے فائدہ اور لالچ و لائل پیش کر کے صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے ہیں۔ اُن کو صرف اور صرف اس مرکزی نقطہ پر نگاہ جمانی چاہیے تھی کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اور اہل خیر القرون نے کہا اور کیا وہی دین ہے اور بس۔

بمصطفیٰ برسوں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہ یاد رہے کہ محفلِ میلاد و مجلسِ میلاد اور چیز ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نفس

ذکرِ ولادت باسعادت اور شے ہے۔ اول بدعت ہے اور ثانی مندوب و مستحب ہے۔ چنانچہ حضرت

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ) تحریر فرماتے ہیں:

”نفسِ ذکرِ ولادت مندوب ہے اور اس میں گراہت قیود کے سبب سے آئی ہے (فتاویٰ رشیدیہ

ج ۱ ص ۱۰۰)۔ نیز لکھتے ہیں: نفسِ ذکرِ ولادت فخرِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مندوب ہے مگر بسبب

انضمام ان قیود کے یہ مجلس ممنوع ہو گئی۔“ (ج ۱ ص ۱۰۰)۔

اگر کسی عالی فہم کو نفسِ ذکرِ ولادت اور عقدِ مجلس اور محفلِ میلاد کا فرق سمجھ نہ آئے تو اس کا ہمارے پاس کیا علاج ہے؟

آنکھیں اگر ہیں بند تو پھر دن بھی رات ہے اس میں بھلا قصور کیا ہے آفتاب کا
مجلسِ میلاد کی تاریخ پوری چھ صدیاں گزر چکی تھیں کہ اس بدعت کا کہیں مسلمانوں میں رواج نہ تھا۔ یہ نہ تو کسی صحابی کو سوجھی نہ تابعی کو نہ کسی محدث کو اور نہ فقیہ کو، نہ کسی بزرگ کو اور نہ کسی ولی کو۔ یہ بدعت اگر سوجھی تو ایک مسرف بادشاہ کو اور اس کے ایک رفیق دنیا پرست مولوی کو۔ یہ بدعت ۶۰۴ھ میں موصل کے شہر میں مظفر الدین کوکری بن اربل (المتوفی ۶۳۳ھ) کے حکم سے ایجاد ہوئی جو ایک مسرف اور دین سے بے پروا بادشاہ تھا (دیکھئے ابن خلکان وغیرہ) اور امام احمد بن محمد مصری مالکی (المتوفی ۵۰۰ھ) لکھتے ہیں کہ :

کان ملکا مسرفا یا ہو علماء زمانہ ان
 یعملوا باستنباطہم واجتہادہم وان
 لا یتبعوا۔ لمدھب غیرہم حتی مالت الیہ
 جماعۃ من العلماء وطائفۃ من الفضلاء
 ویحتفل لمولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم
 فی الرّبیع الاول وهو اول من احدث من
 الملوک هذا العمل۔ (القول المعتمد فی عمل المولد ص)

وہ ایک مسرف بادشاہ تھا۔ علماء زمانہ سے کہا کرتا تھا کہ وہ اپنے استنباط اور اجتہاد پر عمل کریں اور غیر کے مذہب کی پیروی نہ کریں۔ حتیٰ کہ (دنیا پرست) علماء اور فضلاء کی ایک جماعت اس کی طرف مائل ہو گئی اور وہ ربیع الاول میں میلاد منعقد کیا کرتا تھا۔ بادشاہوں میں وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ بدعت گھڑی ہے۔

اور یہ مسرف بادشاہ بیت المال اور رعایا کی لاکھوں کی رقم اس بدعت اور جشن پر صرف کر دیتا تھا اور اس طرح اس نے رعیت کے قلوب کو اپنی طرف مائل کرنے کا ایک دھونگ رچا رکھا تھا اور بیدریغ ملک اور قوم کی رقم کو اس طرح برباد کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ علامہ ذہبی (المتوفی ۷۴۸ھ) نقل کرتے ہیں کہ :

کان ینذق کل سنة علی مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم نحو ثلاث مائة الف۔
 وہ ہر سال میلاد (جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر تقریباً تین لاکھ روپیہ خرچ کیا کرتا تھا۔

اور جس دُنیا پرست مولوی نے اس جشن کے ولدا وہ بادشاہ کے لئے محفل میلاد کے جواز پر مواد کٹھا کر دیا تھا، اُس کا نام عمر بن وحیہ ابوالخطاب (المتوفی ۳۱۸ھ) تھا، جس کو اس کتاب کے صلے میں صلحِ اربل اور مسرف بادشاہ نے ایک ہزار پونڈ انعام دیا تھا (دول الاسلام ص ۱۸۱)۔ اب ذرا اس مولوی کی تعریف بھی ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ حضرت کیسے تھے؟ حافظ ابن حجر عسقلانی نقل کرتے ہیں کہ:

کثیر الوقیفہ فی الاثمہ و فی السلف من العلماء
خبیث اللسان احمق شدید البکر قلیل النظر
فی امور الدین متھاونا۔ (لسان المیزان ج ۲ ص ۲۹۶)
وہ ائمہ دین اور سلف کی شان میں بہت ہی گستاخی کیا
کتا تھا۔ گندی زبان کا مالک تھا۔ بڑا احمق اور متکبر تھا۔
دین کے کاموں میں بڑا بے پروا اور سُست تھا۔
نیز حافظ موصوف نقل کرتے ہیں کہ:

قال ابن النجار رأیت الناس مجتمعین
علی کذبہ وضعفہ (لسان المیزان ج ۲ ص ۲۹۵)
علامہ ابن تجار فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو اس کے
جھوٹ اور ضعف پر متفق پایا۔

حضرات! آپ نے دیکھا کہ مجلس میلاد کو رائج کرنے والا ایک فریب خوردہ اور مسرف بادشاہ تھا۔ جو علماء کو بجائے سلف صالحین کے مذہب کی اتباع کرنے کے اپنے قیاس اور اجتہاد سے کام لینے کا حکم دیا کرتا تھا۔ اور رعایا کی سادگی اور مذہبی شوق سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اُس نے اپنی ملکی سیاست کو محفوظ کیا اور حظِ نفس کے لئے راستہ ہموار کیا، اور جواز میلاد پر کتاب لکھنے والا وہ دُنیا پرست مولوی اُس کو بل گیا جس کی گندی اور ناپاک زبان سے سلف صالحین بھی نہ چھوٹے اور وہ احمق اور متکبر ہونے کے ساتھ دین کے معاملات میں بھی بہت بے پروا اور سُست تھا۔ اور اس چالاک بادشاہ اور ہوشیار مولوی کے ساتھ وہ بے چارے پیر اور صوفی بھی شامل ہو گئے جو دین کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے اور جو سادہ ہونے کی وجہ سے برچھلکے اور پوست کو مغز سمجھ لیتے ہیں۔ پھر جب بادشاہ اور ماہر نفسیات مولوی اور سادہ قسم کے صوفیاء اس کام کو دین کا کام بتا کر عوام سے اپیل کریں تو عوام بے چارے اس میں کیوں نہ پھنسیں۔
حضرت عبداللہ بن مبارک (المتوفی ۳۱۸ھ) نے کیا خوب فرمایا ہے:

و هل افسد الدین الا الملوك و احبار سوء و دهبانها

اب جس کی مرعی ہے کہ وہ خیر القرون کی اتباع کرتا ہے یا نفس پرست بادشاہ اور زر پرست لوی کی؟ ہم تو خیر القرون کی اقتدار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسی کی توفیق دے۔ اور اس محفل میلاد کی ہر زمانہ کے اہل حق اور ہر طبقہ کے علماء نے پرزور تردید کی ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ حنبلی نے (اپنے فتاویٰ جلد ۱ ص ۱۱۱) اور امام نصیر الدین شافعی نے (دیکھئے رشاد الاخیار ص ۱) اور حضرت مجدد الف ثانی الخفی نے (مکتوبات حصہ ۱ ص ۱۱۱) اور علامہ ابن امیر الحاج مالکی نے پوری صراحت اور وضاحت سے اس کی تردید کی ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ:

لوگوں کی ان بدعتوں اور نو ایجاد باتوں میں سے جن کو وہ بڑھی عبادت سمجھتے ہیں اور جن کے کرنے کو شعائر اسلام کا اظہار کہتے ہیں، ایک مجلس میلاد بھی ہے جس کو وہ ماہ ربیع الاول میں کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سی بدعات اور محرمات پر مشتمل ہے (آخر میں فرماتے ہیں) اور اس مجلس میلاد پر یہ مفسد اس صورت میں مرتب ہوتے ہیں جبکہ اس میں سماع ہو سو اگر مجلس میلاد سماع سے پاک ہو اور صرف بنیت میلاد کھانا تیار کر لیا ہو اور بھائیوں اور دوستوں کو اس کے لئے بلایا جائے اور تمام مذکورہ بالا مفسدات سے محفوظ ہو، تب بھی وہ صرف بنیت (مجلس میلاد) کی وجہ سے بدعت ہے اور دین کے اندر ایک جدید امر کا اضافہ کرتا ہے، جو سلف صالحین کے عمل میں نہ تھا حالانکہ اسلاف کے نقش قدم پر چلنا اور ان کی پیروی کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

ومن جملة ما احدثوه من البدع مع اعتقادهم ان ذلك من اكبر العبادات و اظهار الشعائر ما يفعلونه في الشهر الربيع الاول من المولد وقد احتوى ذلك على بدع ومحرمات الى ان قال وهذه المفسدات متروكة على فعل المولد اذا عمل بالسمع فان خلا منه وعمل طعاما فقط ونوى به المولد ودعا اليه الاخوان وسلم من غيره ما تقدم ذكره فهو بدعة بنفس نيتها فذات لان ذلك زيادة في الدين وليس من عمل السلف الماضين واتباع السلف اولي۔
(محل ابن الحاج مطبوعه مصر ج ۱ ص ۱۱۱)

اور علامہ عبدالرحمن مغربی نے اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں کہ:

بہ تحقیق میلاد کا کرنا بدعت ہے۔ نہ تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ

ان عمل المولد بدعة لم يقل به ولم يفعله

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والخلفاء
 علیہ وسلم نے اور آپ کے حضرات خلفاء راشدین اور ائمہ
 والائمة - (کذا فی الشریعۃ اللبیبہ)

اور علامہ احمد بن محمد مصری مالکی لکھتے ہیں کہ:

قد اتفق علماء المذاهب الاربعۃ بدم
 چاروں مذہب کے علماء اس عمل میلاد کی مذمت پر
 هذا العمل - (القول المتعمد)
 متفق ہیں۔

قارئین کرام! آپ ان ٹھوس حوالوں سے اس مسئلہ کی تہ تک توجہ فرمائیے، ان کے ہوں گے کہ خیر القرون
 میں یہ عمل نہ تھا بلکہ چھٹی صدی کے بعد یہ ایجاد ہوا تھا، اور اس کے موجدین کا حال بھی معلوم ہو چکا ہے
 کہ بادشاہ وقت اس کا سرپرست تھا اور بحسب "الناس علیٰ دین ملوکہم" عوام کا اس سے متاثر ہونا
 برگزیدہ از قیاس نہ تھا۔ عوام تو کیا بلکہ بعض خواص بھی اس کے عالمگیر پروپیگنڈا سے متاثر ہوئے بغیر
 نہ رہ سکے اور ان مسلمانوں کے اس عمل کے جواز کے لئے شرعی دلائل کی تلاش اور جستجو شروع کر دی گئی اور
 دور دراز کے قیاسات سے کام لے کر اس گاڑھی کو چلانے کی کوشش کی گئی اور امام جلال الدین سیوطی
 مصری (المتوفی ۹۱۱ھ) جیسے وسیع النظر عالم کو بھی یہ کہنا پڑا کہ:

لیس فیہ نص ولکن فیہ قیاس - اس کے جواز پر نص تو کوئی نہیں البتہ قیاس ہے۔
 (حسن المقصد فی عمل المولد)

اور اس کا صاف لفظوں میں اقرار کر لیا کہ قرآن کریم، حدیث شریفہ، اور اجماع سے کوئی نص اس میلاد
 کے جواز پر موجود نہیں ہے، ہاں البتہ قیاس ہے۔ اور قیاس جو پیش کیا وہ بھی فاسد، اور یہ بات بھی
 نظر انداز کر دی گئی کہ جس چیز کا سبب اور محرک خیر القرون میں موجود تھا، اس میں قیاس اور اجتہاد
 کرنے کی گنجائش ہی کہاں سے پیدا ہو گئی؟ اور مولوی عبدالسمیع صاحب (دعویہ) جب آئے تو انہوں
 نے اپنے دل کی تسکین اور اپنے حواریوں کی تشفی کے لئے تہتر ناموں کی فہرست بھی دے دی کہ یہ یہ حضرات
 عمل مولد کو مستحسن سمجھتے تھے (انوار ساطعہ ص ۲۴۸) مگر اس پر غور نہ کیا کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین کا
 نام بھی ان میں ہے یا نہیں؟ حضرات ائمہ مجتہدین اور مستند محدثین کا ذکر بھی ہے یا نہیں؟ پھر اس پر

بھی غور نہ کیا کہ ان میں اکثریت صوفیاء کرام کی ہے، جن کا عمل بقول حضرت مجدد الف ثانی حجت نہیں۔ عمل صوفیہ در حل و حرمت سند نیست۔ اور جو بعض محقق عالم ہیں، وہ خود قیاسِ فاسد کی غلطی کا شکار ہیں، اور بعض وہ بھی ہیں جو اس تاریخ میں فقط فقرا کو کھانا کھلاتے تھے اور بعض نفسِ ذکر و لاد کے استجاب کے قائل ہیں اور بعض صرف دل میں خوشی کے اظہار کے قائل ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (المتوفی ۱۳۱۷ھ) سے بھی محفل میلاد کے اثبات کا حوالہ دیا ہے کہ وہ اپنے رسالہ "ہفت مسئلہ ص ۸" میں اس کو جائز اور باعثِ برکت کہتے ہیں (محصلاً ج ۱ ص ۲۲)۔ مگر مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ رسالہ "ہفت مسائل حضرت حاجی صاحب کے قلم کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۳ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ نفسِ مضمون حاجی صاحب کا ہے اور عبارت حضرت تھانوی کی ہے۔ (دیکھئے ہامش فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۸) اور حضرت تھانوی اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اس کے جواز کے قائل تھے، پھر رجوع کر لیا تھا۔ اور حضرت حاجی صاحب کے اپنے الفاظ میں کہ نفسِ ذکر مندوب اور قیود بدعت ہیں (ہامش مذکور ص ۱۸) پھر وہ مفاسد بھی ان کے وقت اور ان کے ذہن میں نہ تھے جو لوگوں میں مروج تھے۔ (دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۸) پھر حاجی صاحب کسی شرعی دلیل کا نام نہیں ہے۔ لہذا حاجی صاحب کا ذکر کرنا سوالاتِ شرعیہ میں بے جا ہے (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۹) یہ یاد رہے کہ میلاد کا جلوس انگریز کے زمانہ میں ایک خاص مصلحت کے تحت پٹی ضلع لاہور سے دو شخصوں نے ایجاد کیا تھا۔ مولوی عبدالمجید صاحب جو فوت ہو چکے ہیں اور جناب حاجی عنایت اللہ صاحب جو تادمِ تحریر لاہور میں بقیہ حیات ہیں۔ بلکہ وہ اس جلوس کے تنہا بانی ہونے کے مدعی ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی انوکھی دلیل | وہ لکھتے ہیں کہ حرمین شریفین میں بھی نہایت اہتمام سے یہ مجلسِ پاک منعقد کی جاتی ہے۔ جس ملک میں بھی جاؤ مسلمانوں میں یہ عمل پاؤ گے۔ اولیاء اللہ و علماء اُمت نے اس کے بڑے بڑے فائدے اور برکات بیان فرمائی ہیں (الی ان قال) لہذا محفلِ میلاد پاک مستحب ہے (ج ۱ ص ۲۲) اور ص ۲۲ میں لکھتے ہیں کہ "استجاب کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ

مسلمان اس کو اچھا جانیں۔ (بلفظہ)

الجواب : یہی حریم الشریفین بھی تھے اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعین اور تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین جیسے اولیاء اللہ اور علماء امت بھی تھے، اُن کو یہ فائدے اور برکات کیوں نہ سمجھ آسکے؟ اور وہ اس مروجہ مجلسِ پاک کے منافع سے کیوں محروم رہے، پھر چھ صدیوں تک جس ملک کے مسلمانوں کو دیکھا، اُن میں یہ عمل نہ پایا گیا۔ نہ معلوم وہ اس کی برکات سے کیوں بہرہ ور نہ ہو سکے؟ بلاشک حریم الشریفین کی نصوص سے بڑھی فضیلت اور رتبہ ثابت ہے۔ لیکن شرعی دلائل صرف چار ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگر حریم الشریفین میں اچھے کام ہوں تو نورِ علیؑ نور، ورنہ ہرگز حجت نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت ملا علی نقاریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

فی الحرمین الشریفین من شیوع الظلم و
کثرة الجهل وقلة العلم وظهور المنکرات و
فسوح البدع و اکل الحرام والشبهات
حریم شریفین میں ظلم شایع ہے، جہالت کثیر ہے
علم کم ہے، منکرات کا ظہور ہے، بدعات رائج
ہیں۔ حرام کھایا جاتا ہے، دینی شبہات بھی بکثرت
(مرقات ج ۳ - ص ۲۷۱) ہیں۔

مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابلِ رشک ہے کہ استجاب کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ مسلمان اس کو اچھا جانیں۔ بدعات کی نشرو اشاعت کے لئے کیا چور دروازہ تلاش کیا گیا ہے، اور یہ ببول گئے کہ استجاب تو اونچی چیز ہے، اباحت بھی حکم شرعی ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے بغیر اس کا ثبوت بھی نہیں ہو سکتا، جس کی پوری تفصیل با دلائل گزر چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

الندب حکم شرعی لا بد له من دلیل (رد المحتار) استجاب شرعی حکم ہے، اس کے لئے دلیل درکار ہے۔
مفتی صاحب تو یوں ہی گلو خلاصی کرنا چاہتے ہیں مگر کون اس طرح ان کو چھوڑتا ہے ع
کَلْبِ مانیز زبانه و بیانیہ دارد

میلاد میں قیام کرنا کسی بزرگ کے لئے جو بنفس نفیس آئے، بعض حالات میں بشرطیکہ افراط و

لفریط نہ ہو، قیام درست ہے اور اس پر حضرت امام نوویؒ وغیرہ نے قوموا الی سیدکم کی حدیث سے استدلال کیا ہے (شرح مسلم ج ۲ ص ۹۵)

بعض دوسرے حضرات اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذ زخمی تھے اور آپ نے اُن کو گدھے سے اتارنے کے لئے یہ فرمایا تھا۔ چنانچہ مسند احمد کی روایت میں ہے: قوموا الی سیدکم فانزلوه من الھمار۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے قوموا الی سیدکم فرمایا ہے لیسیدکم نہیں فرمایا۔ مگر دیکھتا یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا عمل اس موقع پر کیا تھا، اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس موقع پر کس عمل کو پسند اور کس کو مکروہ سمجھتے تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ:

لم یکن شخص احب الیہم من رسول اللہ
حضرات صحابہ کرام کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ
صلی اللہ علیہ وسلم وکانوا اذا راؤہ لم
وسلم کی ذات گرامی سے بڑھ کر اور کوئی محبوب نہ تھا لیکن
یقوموا لہما یعلنوں من کراھیتہ لذلک۔
جب وہ آپ کو دیکھتے تھے تو قیام نہ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ
ارواہ الترمذی ج ۲ ص ۲۰۱ وقال بذالحدیث حسن صحیح۔
جانتے تھے کہ آپ اس قیام کے عمل کو مکروہ سمجھتے تھے۔

ومشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۰۱ و مسند احمد ج ۲ ص ۱۵۱ و ادب المفرد ص ۱۳۸

اس صحیح حدیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے لئے قیام کو پسند نہ کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ باوجودیکہ ان کو آپ سے انتہائی محبت تھی، قیام نہ کرتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ جس چیز کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی پسند نہ کرتے ہوں اور کمال محبت کے باوجود حضرات صحابہ کرامؓ بھی اس پر عمل نہ کرتے ہوں (جبکہ بنفس نفس آپ موجود بھی تھے اور حضرات صحابہ کرامؓ کو نظر بھی آتے تھے) تو پھر آج جبکہ آپ کا کسی مجلس میلاد میں، آنا کسی شرعی دلیل سے ثابت ہی نہیں (دیکھئے راقم الحروف کی کتاب تبرید التواظر) اور نہ کسی کو نظر آتے ہیں تو پھر کس طرح قیام کو جائز اور مستحب قرار دیا جاتا ہے، بلکہ واجب اور فرض کہا جاتا ہے اور قیام نہ کرنے والے کی تکفیر کی جاتی ہے۔

مولوی عبدالستیع صاحب محمد بن یحییٰ مفتی حنابلہ سے اپنی تائید میں نقل کرتے ہیں کہ:-

حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰؑ و ہر چیز کہ برآں ترغیب صاحب شرع و تعیین وقت نیا شد آن فعل عبث است و مخالف سنت سید الانام و مخالفت سنت حرام است پس ہرگز روانیاشد و اگر دلش خواہد مخفی خیرات کند در ہر روز یکہ باشد تا نمود نشود۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۹ ص ۹)۔
ایک عقل مند اور صاحب انصاف کو یہ دلائل پس ہیں۔ نہ ماننے والے کے لئے کوئی دلیل سو مند نہیں ہے۔

عکس کرنا

بندگان دین سے حسن عقیدت اور محبت الحب فی اللہ کے موافق افضل ترین اعمال میں داخل ہے، ان کے نقش قدم پر چلنا اور ان کی صحیح معنی میں پیروی کرنا باعث سعادت ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لئے شرعی قواعد کے تحت ایصالِ ثواب کرنا اور ان کے رفع درجات کے لئے دعا کرنا، ایک پسندیدہ عمل ہے۔ اگر کسی بزرگ کی قبر قریب ہو تو اُس پر حاضر ہو کر دعا کرنا اور سنت کے مطابق سلام کہنا، سب درست اور جائز ہے۔ ہاں البتہ دُور دراز کی مسافت طے کر کے زیارتِ قبور کے لئے جانا، اہل سنت میں مختلف فیہ امر ہے اور منع کرنے والے حضرات حدیث لا تشد الرحال الا الی ثلاثہ مساجد (الحدیث) سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ طُور سے واپس آئے، تو اس حدیث کے راوی حضرت بصرہ بن ابی بصرہ الغفاریؓ (المتوفی ۳۵ھ) نے اسی حدیث سے طُور کا سفر اختیار کرنے کی ضمانت ثابت کی اور فرمایا۔ اے ابو ہریرہؓ! اگر میں آپ سے آپ کے طُور پر جانے سے پہلے ملاقات کر لیتا تو اس حدیث کے تحت میں آپ کو ہرگز وہاں نہ جانے دیتا۔ (نسائی ج ۱ ص ۱۱۱) حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حق میرے نزدیک یہ ہے کہ قبر اور اولیاء اللہ میں سے کسی ولی کی عبادت کا محل اور طُور سب کے سب اس نہی میں برابر ہیں (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۹۲) بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ جو شخص اجمیر میں حضرت خواجہ چشتیؒ کی قبر پر یا حضرت سالار مسعود غازیؒ کی قبر یا ان کی مانند کسی اور قبر پر اس لئے گیا کہ وہاں کوئی حاجت

طلب کرے تو اُس نے ایسا گناہ کیا کہ جو قتل اور زنا سے بھی بدترین گناہ ہے (تفہیمات الہیہ ص ۲۵) لیکن قبروں کی زیارت کے لئے دن مقرر کرنا اور معین دن میں اجتماع کرنا ہرگز شریعت سے ثابت نہیں ہے اور خصوصاً سال کے بعد جو دن مقرر کیا جاتا ہے جس کو عرس کہتے ہیں، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

لا تجعلوا قبوری عیداً (سنائی مشکوٰۃ ج ۸ ص ۸۶) تم میری قبر کو عید نہ بناؤ۔

شرح حدیث نے اس کے متعدد معانی اور مطالب بیان کئے ہیں۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ :-

لا تجتمعوا للزیارة اجتماعکم للعید۔ تم زیارت کے لئے ایسے نہ جمع ہو جیسے کہ تم عید کیلئے مجتمع ہوتے ہو۔

اور یہی اجتماع عرس میں ہوتا ہے جس سے آپ نے منع کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے :-

المراد الحث علی كثرة الزیارة ای کہ اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو کثرت زیارة پر آمادہ نہ تجعلوا کالعید الذی لا یاتی فی السنّة الا مرة۔ (ذکرہ فی المرات، ہامش مشکوٰۃ ج ۸ ص ۸۶) میں صرف ایک ہی مرتبہ آتی ہے۔

اور عرس بھی مقرر طور پر سال میں صرف ایک ہی دفعہ کیا جاتا ہے، اور ایسا کرنا اس حدیث کے خلاف ہے جب آپ کی قبر پر عرس کرنا اور میلہ لگانا درست نہ ہوا تو کسی اور کی قبر پر کیسے صحیح اور درست ہوگا؟

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں :

لا تجعلوا زیارة قبوری عیداً اقول هذا میں کہتا ہوں کہ آپ نے جو یہ فرمایا کہ میری قبر کی زیارت اشارۃ الی سدّ مدخل التحریف کما فعل الیہود والنصارى بقبور انبیاءہم وجعلوها عیداً وموسماً بمنزلة الحج۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبروں کو حج کی طرح عید اور موسم بنا دیا تھا۔

توجیہ حج کے لئے ایام کی تخصیص اور خاص اہتمام کیا جاتا ہے بعینہ اسی طرح یہود اور نصاریٰ

نے قبور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کیا اور ماشار اللہ تعالیٰ نام کے مسلمانوں نے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبروں کے علاوہ حضرات اولیاء کرام کی قبروں (بلکہ مصنوعی قبروں) سے بھی وہ کچھ کیا ہے کہ یہود اور نصاریٰ بھی شرمناک ہیں۔ نیز تحریر فرماتے ہیں کہ:

ومن اعظم البدع ما اخترعوا فی امر القبور
بڑھی بدعتوں میں سے یہ ہے کہ لوگوں نے قبور کے پاس میں
واتخذواھا عیاداً (تفہیمات الہینج ۲ ص ۶۷) بہت کچھ اختراع کیا ہے اور قبروں کو میلہ گاہ بنا لیا ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں :

سوال : برائے زیارتِ قبور روز معین نمودن یا روز عرس ایساں کہ معین است رفتن

ورست است یا نہ ؟

جواب : "برائے زیارتِ قبور روز معین نمودن بدعت است و اصل زیارت جائز و تعیین وقت و رست نبود و اس بدعت ازاں قبیل است کہ اصلش جائز است و خصوصیت وقت بدعت مانند مصافحہ بعد العصر کہ در ملک توران وغیرہ رائج است و روز عرس برائے یاد دہانیدن وقت و عبارے میت اگر باشد مضائقہ ندارد لیکن التزام اں نیز بدعت است از ہماں قبیل کہ گزشتہ۔ (فتاویٰ غزینی ج ۱ ص ۸۹) جناب قاضی ثناء اللہ صاحب الحنفی لکھتے ہیں :

لا یجوز ما یفعلہ الجہال بقبور الاولیاء
و الشہداء من السجود و الطواف حولہا
و اتخاذاں السرج و المساجد الیہا و من
الاجتماع بعد الحول کالاعیاد و یسہونہ
عُرساً۔ (تفسیر منظر ہی ج ۲ ص ۶۵)
کہ جاہل لوگ حضرات اولیاء و شہداء کے مزارات کے
ساتھ جو معاملات کرتے ہیں وہ سب کے سب ناجائز ہیں
یعنی ان کو سجدہ کرنا اور ان کے گرد طواف کرنا اور ان پر
چراغاں کرنا اور ان کی طرف سجدے کرنا اور ہر سال میلوں
کی طرح ان پر جمع ہونا جس کا نام عرس ہے۔

اور ارشاد الطالبین ص ۲۱ میں لکھتے ہیں :

"قبور اولیاء بلند کردن و گنبد برآں ساختن و عرس و امثال اں و چراغاں کردن ہمہ بدعت است
بعض ازارہا رام است و بعض مکروہ ہنمیر خدا بر شمع افروزان نزد قبر و سجدہ کنندگان را لعنت گنتہ۔"

اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب لکھتے ہیں کہ :

مقرر ساختن روزِ عرس جائز نیست (مسائل العین ص ۳۸) عرس کا دن مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ عرس کی تاریخ مقرر ہونے سے لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی ہوتی ہے اور لوگ جمع ہو کر قرآن خوانی، کلمہ طیبہ، درود پاک وغیرہ پڑھتے ہیں، بہت سی برکات جمع ہو جاتی ہیں (جبار الحق ص ۳۱)۔ تو یہ صرف سرے سے قابل التفات ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ایشیائی علی متقی الحنفی لکھتے ہیں :

الاجتماع لقراءة القرآن علی البیت
بالتخصیص فی المقبرة او المسجد
او البیت بدعة مذمومة (رسالہ رد بدعات)
بدعت مذمومہ ہے۔

جب یہ اجتماع ہی بدعت مذمومہ ہے تو لوگوں کے قرآن خوانی کے لئے جمع ہونے کا کیا معنی؟ رہا مولوی عبدالسمیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا ان روایات سے استدلال کرنا، جن میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سال کے بعد شہدار کی قبروں پر السلام علیکم الخ کے الفاظ سے دُعا کیا کرتے تھے اور اسی طرح آپ کے بعد حضرات خلفاء راشدین بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے، تو ان سے ان کا استدلال خاں ہے۔ اولاً اس لیے کہ یہ روایتیں کتب حدیث کے اس طبقہ کی ہیں جن میں بجز باسناد اور صحیح احادیث کے جن پر امت کا تعامل ہے اکثر احادیث کو محدثین ہرگز قبول نہیں کرتے۔ نہ عقیدہ میں اور نہ عمل میں۔ (دیکھئے بحوالہ نافعہ ص ۱ اور حجتہ اللہ) وثانیاً ان روایتوں میں اجتماع کا کہیں ذکر نہیں اور نہ قرآن خوانی اور مجلس و عظ منعقد کرنے کا کہیں ذکر ہے۔ الغرض کوئی صحیح نقلی یا عقلی دلیل عرس کے جواز پر ہرگز دلالت نہیں کرتی۔

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں : فتاویٰ رشیدیہ جلد اول کتاب الحظر والاباحتہ ص ۱۵۹ میں ہے۔ زیارت بزرگان کے لئے سفر کر کے جانا علماء اہل سنت میں مختلف ہے۔ بعض درست کہتے ہیں، اور بعض ناجائز، دونوں اہل سنت کے علماء ہیں۔ مسئلہ مختلف ہے اس میں تکرار درست نہیں۔ اور فیصلہ بھی ہم مقلدوں سے محال ہے۔ رشید احمد عفی عنہ۔ اب کسی دیوبندی کو حق نہیں کہ سفر عرس سے کسی کو منع

کرے، کیونکہ مولوی رشید احمد صاحب تکرار سے منع فرماتے ہیں اور اس کا فیصلہ نہیں فرما سکتے (جاء الحق ص ۳۱۵)
حضرت مولانا گنگوہیؒ کی اس عبارت سے سفر عرس کے جواز پر استدلال کرنا مفتی احمد یار خان
صاحب کی محض خوش فہمی ہے۔ مولانا گنگوہیؒ نے خود یہ مسئلہ یوں حل کیا ہے۔

الجواب : قبور بزرگان کی زیارت کو سفر کر کے جانا مختلف فیہ ہے۔ بعض علماء درست لکھتے
ہیں اور بعض منع کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ مختلف ہے، اس میں نزاع تکرار نہیں چاہیے مگر ہاں عرس کے دن
زیارت کو جانا حرام ہے فقط۔ (فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم ص ۲۹)

اب فرمائیے کہ کسی دیوبندی کو سفر عرس سے منع کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

اور پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور قاضی ثناء اللہ صاحب کی عبارتیں نقل کی جا چکی
ہیں کہ زیارت قبور کے لئے دن مقرر کرنا اور عرس کرنا بدعت ہے اور قاضی صاحب نے بعض ازاں حرام
و بعض مکروہ لکھا ہے۔ یہ اور اس قسم کی دیگر عبارتیں حضرت مولانا گنگوہیؒ کا ماننا ہے۔ مولوی احمد رضا
خان صاحب بریلوی کے پیران پر حضرت شاہ حمزہ صاحب مارہروی (المتوفی ۱۱۶۵ھ) نے یہ وصیت کی
تھی کہ فاتحہ برسی بالکل نہ کریں کہ حکم اسی طرح سے ہے (انوار العارفين ص ۴۶۹)۔ لیجئے اب اس منع میں
بریلویوں کا پیر بھی شریک ہو گیا۔

ذکر بالجہر

اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک عمدہ ترین عبادت ہے اور دعا کرنا بھی ایک اعلیٰ ترین نیکی اور قربت ہے۔ مگر
اسی طریقہ سے جس سے شریعت حقہ نے راہنمائی کی ہے۔ جس موقع پر جہر کے ساتھ ذکر کرنے کا حکم ہے مثلاً
عرفہ کی فجر سے لے کر آخر ایام تشریق تک، اور حج کے دنوں میں تلبیہ وغیرہ) تو وہاں جہر کرنا سنت ہے۔
اور جہاں جہر کا حکم نہیں دیا وہاں آہستہ ذکر کرنا بہتر ہوگا۔ اور اسی صورت میں شریعت کی مراد پوری
ہوگی۔ اور یہی حکم ہے دعا کا۔ اگرچہ حضرات صاحبین (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) نے اور ان کے علاوہ
بعض مقامات میں امام ابن حزمؒ اور اکثر صوفیاء کرامؒ نے اکثر مقامات پر جہر سے ذکر کرنے کو صرف پسند

کیا ہے لیکن نہ کرنے والوں کو نہ تو ملامت کی اور نہ وہابی کہا۔ مگر دلائل پر نگاہ ڈالنے سے یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ذکر اور دعا آہستہ طریقہ سے بہتر ہے اور یہی حضرت امام ابو حنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسدک ہے۔ جب حضرات آئمہ اربعہ کا ایک مسئلہ پر اتفاق ہو جائے تو یہی امید رکھنی چاہیے کہ حق ان کے ساتھ ہے اور پھر آج اگر صرف ذکر بالجہر کو پسند ہی کیا جاتا اور دوسرے پہلو کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا، تب بھی ایک بات ہوتی۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ آج ذکر بالجہر نہ کرنے والے کو وہابی وغیرہ کہہ کر اُسے ملامت کی جاتی اور محل طعن بنایا جاتا ہے، اور آج مسلمان اور اہل سنت ہونے کی یہ علامت قرار دی جا رہی ہے، کہ اگر ذکر بالجہر کرنا ہو تو سستی ورنہ وہابی۔ اس لئے اس مسئلہ پر غور کی ضرورت ہے۔ مختصر طریق پر دلائل عرض ہیں۔ غور فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَ اذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَ خِيفَةً وَ دُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ (الایہ۔ پ، اعراف ۲۴)

اور ڈرتے ہوئے اور جہر سے کم آواز میں۔

اور فرمایا کہ:

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَ خِيفَةً اِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٥٠﴾ (پ۔ اعراف، رکوع ۷)

پکارو اپنے رب کو عاجزی کرتے ہوئے اور چپکے، بیشک وہ محبت نہیں کرتا حد سے بڑھنے والوں کے ساتھ۔

اس آیت کریمہ میں ذکر اور دعا کرنے کے لئے دو قیدیں لگائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ذکر اور دعا نہایت اخلاص، عاجزی اور انکساری کے ساتھ ہو، اور دوسری یہ کہ آہستہ اور چپکے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تجاوز کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات صحابہ کرام نے ایک موقع پر بلند آواز سے ذکر کیا تو آپ نے ان کو منع کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ:

لے حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں والمنتادان الامام والہاموم یخفیان الذکر الا ان احتیج الی التعلیم۔ (فتح الباری ج ۲ ص ۱۵۶) کہ مختار بات صرف یہی ہے کہ امام اور مقتدی دونوں ذکر آہستہ کریں۔ ہاں مگر جب تعلیم کی ضرورت محسوس ہو تو الگ بات ہے۔

اَيُّهَا النَّاسُ ارْجِعُوا عَلَيَّ اِنْفُسَكُمْ اِنكُمْ لَيْسْتُمْ تَدْعُونَ
اصْوَمَ وَلَا غَائِبًا وَاِنْكُمْ تَدْعُونَ سَمِيْعًا قَرِيْبًا وَاِنْكُمْ
هُوَ مَعَكُمْ۔ (بخاری ج ۲ ص ۶۰۵ و مسلم ج ۳ ص ۳۶۶ واللفظ)

اے لوگو! اپنی جان پر نرمی کرو، تم اس ذات کو نہیں پکار
رہے جو بہری اور غائب ہو۔ تم تو سمیع اور قریب ذات
کو پکارتے ہو اور وہ تمہارے ساتھ ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر سے روکتے ہوئے آہستہ ذکر کرنے کو
پسند کیا ہے۔ چنانچہ امام نووی لکھتے ہیں:

ففيه الندب الى خفض الصوت بالذكر اذا
لم تدع حاجة الى رفعه۔ (شرح مسلم ج ۳ ص ۳۶۶)

کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آہستہ ذکر
کرنا بہتر ہے جبکہ کوئی داعیہ رفع صوت کا پیش نہ آئے۔
حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ امام ابن حزم ظاہری (المتوفی ۵۰۴ھ) وغیرہ نے نمازوں کے بعد بلند آواز
سے ذکر کرنے کو مستحب کہا ہے لیکن:

وقال ابن بطال المذاهب الاربعه على
عدم استحبابه (البایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۰۷،
مشہ فی ہامش بخاری ج ۱ ص ۱۰۷)

محدث ابن بطال فرماتے ہیں کہ چاروں مذاہب اس
پر متفق ہیں کہ جہر سے ذکر کرنا مستحب نہیں ہے۔

امام ابن حزم وغیرہ کا استدلال اس روایت سے ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ
یہ فرماتے ہیں:

ان رفع الصوت بالذكر حين ينصرف
الناس من المكتوبة كان على عهد
النبي صلى الله عليه وسلم۔ (مسلم ج ۱ ص ۱۰۷)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں
نماز سے فارغ ہونے کے بعد لوگ بلند آواز سے ذکر
کرتے تھے۔

حضرت امام نووی اس حدیث کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں کہ:

ونقل ابن بطال واخرون ان اصحاب
المذاهب المتبوعه وغيرهم متفقون على
عدم استحباب رفع الصوت بالذكر والتكبير

امام ابن بطال وغیرہ علمائے یہ بات نقل کی ہے کہ وہ ائمہ
مذاہب جن کی (اکثر) لوگ اتباع کرتے ہیں (یعنی ائمہ اربعہ)
اور اسی طرح دیگر ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ بلند آواز سے

و حمل الشافعی هذا الحدیث علی اللہ
جہر وقتا سیرا حتی یعلمہم صفة الذکر
لا انہم جہروا دائما۔

ذکر کرنا اور تکبیر کہنا مستحب نہیں ہے اور حضرت ابن عباسؓ
کی اس روایت کا مطلب امام شافعیؒ نے یہ بیان کیا ہے
کہ کچھ عرصہ تک لوگوں کو تعلیم دینے کی غرض سے ذکر بالجہر
ہوتا رہا، نہ یہ کہ انہوں نے اس پر دوام کیا۔

(شرح مسلم ج ۱ ص ۲۱۷)

اور یہی بات قرین قیاس و انصاف ہے۔ ورنہ ضرور ذکر بالجہر پر حضرات صحابہؓ کو امام کا عمل ہوتا اور حضرت
ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی ہرگز ذکر بالجہر اور بلند آواز سے درود شریف پڑھنے والوں کو یہ فرماتے ہوئے
مسجد سے نہ نکال دیتے کہ تم نے صحابہؓ کی موجودگی میں تاریک بدعت ایجاد کی ہے؛ جس طرح جہر سے برائے
تعلیم بسم اللہ پڑھنا آپ سے ثابت ہے لیکن اس پر دوام کرنا بدعت ہے جیسا کہ حضرت ابن منقلؓ سے نقل
ہو چکا ہے، اسی طرح ذکر بالجہر کا مسئلہ ہے۔ علامہ علی حنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا بی حنیفة ان رفع الصوت بالذکر
بدعة مخالف للامرفی: قوله تعالیٰ
ادعوا ربکم الایة (کبیری ص ۵۶۶)

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بلند آواز کے ساتھ
ذکر کرنا بدعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے
خلاف ہے کہ تم اپنے رب کو عاجزی سے اور چپکے سے پکارو۔

اس عبارت سے بصرحت یہ معلوم ہوا کہ بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا امام عظیم صاحب کے نزدیک
اللہ تعالیٰ کے مذکور ارشاد کے مخالف بھی ہے اور بدعت بھی ہے۔ فریق مخالف کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ
وہ ذکر بالجہر نہ کرنے والوں کو وہابی کہتا ہے اور ذکر بالجہر کو اہل سنت کی علامت قرار دیتا ہے
لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ۔

حضرت ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ:

وقد نص بعض علمائنا بان رفع الصوت فی
المسجد ولو بالذکر حرام (مرقات علی مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۷۷)

ہمارے بعض علماء نے صرحت سے یہ حکم بیان کیا ہے کہ مسجد
میں آواز بلند کرنا اگرچہ ذکر کے ساتھ ہو، حرام ہے۔
آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ حضرت امام عظیمؒ ذکر بالجہر کو بدعت فرماتے ہیں اور حضرت ملا علی قاریؒ اس
کا حرام ہونا نقل کرتے ہیں مگر مفتی احمد یار خان صاحب کہتے ہیں کہ "مخالفین اس کو حرام کہتے ہیں، اور

طرح طرح کے حیلوں سے اس کو روکنا چاہتے ہیں۔ ایک حیلہ یہ ہے کہ ذکر بالجہر بدعت ہے، اصول حنفیہ کے خلاف ہے الخ (جبار الحق ص ۳۲۹)۔ انصاف سے فرمائیں کہ یہ حرام اور بدعت کس نے کہا ہے؟ کیا امام اعظم اور ملا علی قاری بھی آپ کے مخالفین کی فہرست میں شامل ہیں؟ اور کیا وہ بھی طرح طرح کے حیلوں سے اس کو منع کرنے والوں میں ہیں؟ خوب ہوش میں آکر جواب دینا، بیٹنوا توجروا۔

امام نووی لکھتے ہیں کہ:

اما الدعاء فيسربه بلا خلاف (شرح مسلم ج ۳) اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ دعا آہستہ کرنی چاہیے۔
 امام سراج الدین الحنفی اور ملا علی قاری لکھتے ہیں:
 يُستحب في الدعاء الانخفاء ورفع الصوت بالدعاء کہ مستحب یہ ہے کہ دعا آہستہ کی جائے اور بلند آواز سے بدعتہ (مناوی سرچرہ ص ۱۰۰) و موضوعات کبریٰ ص ۱۰۰۔ دعا کرنا بدعت ہے۔

یہ تمام عبارات اپنے مفہوم میں بالکل نص صریح اور واضح ہیں اور یہی پہلو بہتر اور شرح شریعت کے قریب تر ہے۔ رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا بحوالہ شامی یہ نقل کنا کہ "متقدمین اور متاخرین نے اس پر اتفاق کیا کہ مسجدوں میں جماعتوں کا بلند آواز سے ذکر کرنا مستحب ہے، مگر یہ کہ ان کے جہتے کسی سونے والے یا نمازی یا قاری کو پریشانی ہو"۔ (جبار الحق ص ۳۳۲) تو یہ ہرگز قابل التفات نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ جب قرآن کریم اور حدیث شریف میں آہستہ ذکر کرنے کا حکم ہے تو اس کے خلاف کسی کا عمل کس طرح حجت ہو سکتا ہے؟ وثانیاً حضرات ائمہ اربعہ جہتے سے ذکر کرنے کو غیر مستحب کہتے ہیں اور حضرت امام ابو حنیفہؒ اس کو بدعت کہتے ہیں۔ نیز تصریح کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مخالف ہے۔ جب حضرات ائمہ اربعہ کا ذکر بالجہر کے خلاف اتفاق ہے تو ذکر بالجہر کے جواز پر اتفاق کیسے ہوا؟ اور کیا حضرات ائمہ اربعہ متقدمین میں نہ تھے؟ وثالثاً علماء متاخرین بھی ذکر بالجہر کے مستحب ہونے پر ہرگز متفق نہیں ہیں۔ ہر مسلک کے علماء نے اس کی تردید کی ہے۔ حتیٰ کہ حضرات صوفیاء کرام بھی اس پر متفق نہیں ہیں دیکھئے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ اسی طرح دیگر علماء اور فقہاء و محدثین کی کتابیں بغور ملاحظہ کیجئے۔ محض اتفاق کے خوش کن لفظ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ باقی مفتی احمد یار خان

صاحب کار سالہ دلائل الاذکار ص ۹۱ مصنفہ شیخ محمد صاحب تھانوی کے حوالہ سے یہ نقل کرنا کہ "حضور علیہ السلام نماز کے بعد صحابہ کرام کے ساتھ تسبیح و تہلیل بلند آواز سے پڑھتے تھے" (جاء الحق ص ۱۳۱) تو یہ دلیل بھی چنداں وزنی نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ جب تک اصول حدیث کے مطابق اس کا صحیح ہونا ثابت نہ ہو جائے اس سے استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ و ثانیاً اگر یہ حدیث صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس کا مطلب بھی وہی ہوگا جو حضرت ابن عباس کی حدیث کا حضرت امام شافعی نے پیش کیا ہے کہ کسی وقت تعلیم کے لئے آپ نے ایسا کیا تھا، بعد کو چھوڑ دیا، دوام اس پر ہرگز نہ ہوا تھا۔ اگر دوام ہوتا تو حضرات ائمہ اربعہ کبھی ذکر بالجہر کو غیر مستحب نہ کہتے۔ یہ ایک ایسی بین حقیقت ہے جس کا ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ذکر بالجہر اور آہستہ ذکر کی بہالا مزید علیہ بحث راقم کی مستقل کتاب حکم الذکر بالجہر اور اخفار الذکر میں بلاخط فرمائیں۔ یہاں گنجائش نہیں ہے کہ اسکے مبسوط حوالے عرض کیے جاسکیں۔ واللہ الموفق۔

مراتِ حضرات اولیاء کرام کو نچتہ کرنا اور ان پر گنبد بنانا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح احادیث سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ حتی المقدور قبور کی توہین نہ کی جائے یعنی قبور پر بیٹھنا، ان کو روندنا، وہاں پیشاب و پاخانہ کے لئے جانا اور قبور کی شکل و صورت کو بگاڑنا وغیرہ سب امور شریعت میں ممنوع ہیں۔ قبر مسلمان کی عالم برزخ میں ایک رہائش گاہ ہے، اس کا احترام کرنا ضروری ہے اور اس کی توہین ہرگز درست نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ قبروں کو نچتہ بنانا یا ان پر گنبد وغیرہ بنانا بھی کیا اس احترام میں داخل ہے؟ تو اس کا جواب ایک مسلمان اور منیب کے لئے بالکل آسان ہے اور وہ صرف یہ ہے کہ قبور پر گنبد وغیرہ بنانے میں احترام نہیں اور نہ بنانے میں ہرگز توہین نہیں ہے کیونکہ اگر قبروں کو نچتہ بنانے اور ان پر گنبد وغیرہ تعمیر کرنے میں احترام ہوتا اور اس میں کوئی بھی شرعی فائدہ اور دینی مصلحت ہوتی تو سرورِ دو جہاں رحمتہ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہرگز اس سے منع نہ کرتے۔ اگر آج مولوی احمد رضا خان اور مولوی عبدالستیم صاحب اور مولوی محمد عمر اور

مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کو اس میں دینی مصلحتیں اور شرعی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور جن کی بنا پر وہ یہ سب کچھ جائز کہتے اور اس کو کارِ ثواب اور کم از کم مستحب سمجھتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو کیوں اس سے منع کیا اور ان دینی فوائد اور مصالح سے کیوں امت کو محروم رکھا؟ غرضیکہ یہ تمام تر فوائد اور مصالح خود تراشیدہ اور ایجاد بندہ ہونے کی وجہ سے مردود اور باطل ہیں اور ان کا مقام صرف یہ ہے کہ عذر اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ :

قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبر وان ینبئ علیہ وان یقعد علیہ۔ (مسلم ۳۱۲/۱ و مشکوٰۃ ۱۳۸/۱ و ترمذی ۱۲۵/۱)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبر کو نچتر بنانے اور اس پر عمارت بنانے اور اس پر بیٹھے سے منع کیا ہے۔

جب سردار دو جہاں امام الانبیاء سید الرسل اور خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے تو کون ماں کا لالہ ہے جو آپ کی منع کی ہوئی چیز میں کوئی مصلحت اور فائدہ ثابت کر سکے۔ منہ کے ساتھ بات بنانے اور قلم خواہش کے ساتھ کچھ لکھ دینے کا نام ثبوت نہیں ہوتا۔ حضرت امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

والبناء علیہ فان کان فی ملک البانی فمکروہ وان کان فی مقبرة مسبلہ فحرام نص علیہ الشافعی والاصحاب قال الشافعی فی الامم و رأیت الاثمة بمسکة یا مرون بھدم ما ینبئ ویؤید الھدم قوله ولا قبراً مشرفاً الا سویتہ۔

قبر پر عمارت بنانا اگر (وہ جگہ) عمارت بنانے والے کی ملک میں ہے تو مکروہ ہے اور اگر عام مقبرہ میں ہے تو حرام ہے۔ حضرت امام شافعیؒ اور دیگر اصحاب نے صریحاً سے اس کو بیان کیا ہے اور امام شافعیؒ نے کتاب الامم میں تحریر فرمایا ہے کہ میں نے مکہ مکرمہ میں اماموں کو قبر پر عمارت کو ڈھانے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا ہے، اور

(شرح مسلم ج ۱ ص ۳۱۲)

ولا قبراً مشرفاً والی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب سے پوچھئے کہ حضرت امام شافعیؒ نے جو مکہ مکرمہ میں حضرات ائمہ کو قبروں پر عمارت ڈھانے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا تھا، یہ کون امام تھے؟ اور کیا یہ نجدیوں اور وہابیوں کے امام تھے جو مکہ مکرمہ جیسی پاک سرزمین پر اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں اور حضرات اولیاء کرام کی قبروں کی حضرت امام شافعیؒ کے زمانہ میں یوں توہین کرتے تھے؟ مفتی احمد یار خان صاحب تو یوں لب کشائی کرتے ہیں: **نوٹ ضروری:** اس حدیث کو اڑبنا کہ نجدی وہابیوں نے صحابہ کرام اور اہل بیت کے مزارات کو گرا کر زمین کے ہموار کر دیا۔ (بلفظہ جا۔ الحق ص ۲۷۹)

حضرت امام محمدؐ (المتوفی ۱۸۹ھ) فرماتے ہیں کہ:

ولانری ان یزاد علی ما خرج منه و
نکرو ان یجصص او یطین الی ان قال
ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی
عن تربیع القبور و تجصیصھا قال
محمد بہ نأخذ وهو قول ابی حنیفہ۔
(کتاب الآثار امام محمد ص ۹۶-۹۷)

ہم اس کو صحیح نہیں سمجھتے کہ جو مٹی قبر سے نکلی ہے اس سے زیادہ اس پر ڈالی جائے۔ اور ہم مکروہ سمجھتے ہیں کہ قبر پختہ بنائی جائے یا اس پر لپاکی کی جائے (آگے فرمایا) اس لئے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبر کو مربع بنانے سے اور اس کو پختہ بنانے سے منع کیا ہے۔ یہی ہمارا مذہب ہے، اور یہی حضرت امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔

حضرات کیا کسی مسلمان کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح اور صریح حدیث کو رد کر دے؟ اور کیا کسی حنفی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حضرت امام ابو حنیفہ کا قول اور ان کا فتویٰ جس کی بنیاد صحیح حدیث پر ہو ترک دے اور پھر لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے حنفی کا حنفی بنا رہے۔ یاد رہے کہ یہ قول حضرت امام ابو حنیفہؒ کا ان کے بلا واسطہ شاگرد حضرت امام محمدؒ نقل کرتے ہیں اور اپنا مذہب بھی یہی بتاتے ہیں۔ مفتی احمد یار خان صاحب کی خیانت یا جہالت ملاحظہ کیجئے، کہ وہ امام شعرانیؒ (المتوفی ۳۹۹ھ) کے حوالہ سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ قبروں پر گچ کرنا اور گنبد بنانا اور قبروں کو پختہ کرنا جائز ہے، اور پھر آگے اس قلعہ کو فتح کرتے ہوئے مفتی احمد یار خان

صاحب یوں ارقام فرماتے ہیں: اب تورجسٹری ہو گئی کہ خود امام مذہب امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا فرمان مل گیا کہ قبر پر قببہ وغیرہ بنانا جائز ہے (بلفظہ جبار الحق ص ۲۷)۔ سبحان اللہ تعالیٰ! دسویں صدی کے ایک صوفی کی بے سند نقل اور بے سروپا روایت سے (جو نقل مذہب میں سینکڑوں غلطیاں کر جاتے ہیں) حضرت امام ابوحنیفہ کے مذہب میں قبوں کے جواز پر رجسٹری ہو گئی اور حضرت امام محمد کی نقل سے جو امام صاحب بلا واسطہ شاگرد اور نقل مذہب میں بڑے محتاط اور معتبر ہیں۔ ان کے قول اور فتویٰ سے قبوں کے عدم جواز پر رجسٹری نہ ہوئی؟ ع

اسی کار از تو آید و مرواں چنین کنند

صریح حدیث اور حضرت امام صاحب کے قول کے بعد ضرورت تو نہیں، مگر تکمیل فائدہ کیلئے حضرات فقہاء احناف کی چند عبارتیں اور ملاحظہ کر لیجئے تاکہ اصلی حقیقت بالکل بے نقاب ہو جائے۔
علامہ علی الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

و یکرہ تجصیص القبر و تطینہ و بہ
قالت الائمة الثلاثة الی ان قال وعن
ابی حنیفہ انه یکرہ ان یبنی علیہ بناء
من بیت او قبۃ او نحو ذلك لهما من
من الحدیث انفا۔ (کبیری ط ۵۹۹)
قبر کو نچتہ بنانا اور اس کی لپائی کرنا مکروہ ہے اور یہی
تینوں اماموں کا قول ہے (پھر آگے فرمایا) اور امام ابوحنیفہؒ
سے روایت ہے کہ قبر پر مکان یا قببہ یا اس کی مانند کوئی
اور عمارت بنانا مکروہ ہے۔ اور یہ مذکور حدیث اس
کی دلیل ہے۔

امام سراج الدین اودمی الحنفی (المتوفی فی حدود ۳۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

و یکرہ البناء علی القبور (فتاویٰ سراجیہ ص ۲۷) قبر پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔

امام قاضی خان الحنفی (المتوفی ۷۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا یخصص القبر لماروی عن النبی صلی اللہ
علیہ وسلم انه فی عن التخصیص والتفضیض
وعن البناء فوق القبر (قاضی خان ص ۹۲)
قبر کو نچتہ نہ بنایا جائے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم نے قبر کے نچتہ بنانے اور چاندی کے پانی سے جڑاؤ
کرنے اور قبر پر عمارت بنانے سے منع کیا ہے۔

حافظ ابن ہمام الخنقی (المتوفی ۸۶۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

ان النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن تربع
القبور وتخصيصها (فتح القدير ج ۲ ص ۱۷۱)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبروں کے مربع (چورس)
بنانے اور ان کو پختہ بنانے سے منع کیا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے :

ويسمى القبر قدرا الشبر ولا يربع ولا يخصص
ويكوه ان يبني على القبر۔

قبر کو اونٹ کے کوبان کی طرح بنانا چاہیے اور وہ بھی صرف
ایک بالشت۔ اور قبر کو مربع نہ بنایا جائے اور نہ اس کو پختہ
کیا جائے۔ اور قبر پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔

(عالمگیری مصری ج ۱ ص ۱۷۱)

علامہ ابن عابدین الخنقی لکھتے ہیں کہ :

اما البناء فلم ار من اختار جوازه۔

مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے عمارت بنانے کے جواز
کو پسند کیا ہو۔

(شامی ج ۱ ص ۱۷۱)

نوٹ : مطلق مکروہ حضرت امام اعظم اور دیگر سلف صالحین کی اصطلاح میں مکروہ تحریمی

پر اطلاق ہوتا ہے چنانچہ علامہ ابوالمکارم الخنقی (المتوفی ۸۶۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

المكروه التحريم عند الامام (ابوالمكارم ج ۳ ص ۱۵۹) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مکروہ سے مراد حرام ہے۔

اور نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں :

حافظ ابن القیم در اعلام الموقعین تصریح کرده
است بآنکہ استعمال کراہت در محاورہ سلف در
تحریم بود۔ (الدلیل الطالب ص ۱۵۲)

کہ حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں تصریح کی ہے
کہ حضرات سلف کے محاورہ میں کراہت کا اطلاق و
استعمال تحریم پر ہوتا تھا۔

حضرت ملا علی نقاری حدیث من ابتدع بدعة ضلالة کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں کہ :

وهي ما انكره ائمة المسلمين كالبناء
على القبور وتخصيصها۔ (مرقات ج ۱ ص ۲۲۷)

بدعت ضلالت وہ ہے جس کا ائمہ مسلمین نے انکار کیا
ہو جیسے قبروں پر عمارت بنانا اور ان کو پختہ کرنا۔

لہ تصریح حاشیہ تلویح ص ۲۷ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ دونوں سے نقل کیا گیا ہے کہ مکروہ سے کراہت تحریمہ مراد ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ائمہ مسلمین نے قبر پر عمارت بنانے اور ان کو پختہ کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے اور اس کو بدعتِ ضلالہ کہتے ہوئے انکار کیا ہے۔

قاضی ثناء اللہ صاحب الحنفی (المتوفی ۱۲۲۵ھ) لکھتے ہیں :

آنچہ بر قبور اولیاء عمارت ہائے رفیع بنا میکنند وہ جو کچھ کہ حضرات اولیاء کرام کی قبروں پر کیا جاتا ہے
و چراغاں روشن می کنند و ازین قبیل ہرچہ میکنند کہ اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں اور چراغ روشن کرتے
حرام است۔ (ملا بد منہ ص ۹۵) اور اس قسم کی جو چیز بھی کرتے ہیں، حرام ہے۔

ایک منصف مزاج اور حق کے متلاشی کے لئے یہ وزنی اور ٹھوس دلائل بالکل کافی ہیں البتہ معاند اور سرکش کے لئے دلائل کا اتنا بھی ناکافی ہے۔ مولوی عبد التَّمِیح صاحب، اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ نے شیخ عبدالغنی نابلسی، صاحب روح البیان اور امام خصکفی اور طحطاوی وغیرہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ مشائخ، علماء اور سادات کی قبروں پر عمارت اور گنبد بنانا جائز ہے، اور اس کو کم از کم مستحب اور ہوا مختار کہا ہے تو یہ سراسر باطل اور مردود ہے۔ اس کا مختصر اور پورا جواب صرف اتنا ہی کافی ہے کہ نہ تو یہ حضرات معصوم ہیں اور نہ مجتہد۔ پھر جناب نبی معصوم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور امام مجتہد کے صریح ارشاد کے مقابلہ میں ان کی بات کون سنتا ہے؟ رہا مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا یہ ارشاد کہ حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت محمد بن الحنفیہؓ سے قبروں پر خیمے لگانے کا ثبوت ہے اور اس پر روایتیں نقل کی ہیں تو اولاً اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بے اصل اور بے سند روایتیں ہیں ہرگز قابل قبول نہیں ہیں۔ و ثانیاً اگر یہ سند صحیح بھی ہوں تب بھی جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح اور صریح حدیث کے مقابلہ میں ان کی کوئی پوزیشن ہی نہیں ہے۔

اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب نے جو یہ نقل کیا ہے کہ امام زین العابدینؓ کی بیوی نے اپنے خاوند کی قبر پر خیمہ لگایا تھا، اس میں بھی مفتی صاحب نے خیانت کی ہے۔ اگر پوری روایت نقل کر دیتے تو خود بخود معاملہ حل ہو جاتا۔ اس روایت میں اس کی تصریح ہے کہ مکالمہ کے طور پر صدائے غیبی (ہاتھ) نے اس فعل کی ناپسندیدگی کا صاف اعلان کر دیا تھا (مشکوٰۃ ص ۱۵۲)۔ باقی حضرت عثمانؓ بن مظعون

کی قبر کے سربانے بطور علامت کے ایک پتھر رکھنے سے قبر پر عمارت اور قبۃ بنانے پر استدلال کرنا، یہ صرف مفتی صاحب اور ان کے ہم مشرب رفقاء کا ہی کام ہے، آخر مفتی جو ہوئے۔

الغرض قبورِ حضراتِ اولیاءِ کرام پر عمارت اور گنبد بنانے پر کوئی صحیح روایت اور عقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے خلاف دلائل اور براہین کا انبار موجود ہے۔ و فیہا کفایۃ لمن لہ ہدایۃ۔

قبوں کو گرانے کا حکم | حضرت امام شافعی کے حوالہ سے یہ نقل کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے مگر مگرہ میں حضراتِ ائمہ کرام کو قبور پر قبوں کو مسمار کرنے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور ولا قبوا مشرفا کی حدیث سے ان کا استدلال تھا۔ اب وہ حدیث سن لیجئے۔ نیرت ابوالہیاج الاسدی (المتوفی

۳۰۰) جو فوجی افسر تھے، وہ فرماتے ہیں کہ:

قال لی علیؑ الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تدع تمثالا الا طہستہ ولا قبوا مشرفا الا سویتہ ۱ مسلم ۳۱۲ مشکوٰۃ ص ۱۴۸ و ترمذی ص ۱۲۵

مجھے حضرت علیؑ نے فرمایا کہ کیا تجھے میں اس کام کیلئے نہ بھیجوں جس کے لئے مجھے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھیجا تھا وہ یہ کہ کوئی فوٹو اور مجسمہ مٹائے بغیر نہ چھوڑنا، اور کوئی اونچی قبر نہ چھوڑنا مگر یہ کہ اس کو برابر کر دینا۔

برابر کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قبروں کو زمین کی سطح کے ساتھ ہموار کر دیا جائے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ان قبروں کے ساتھ برابر کر دیا جائے جو شریعت کے منشا کے مطابق ہیں۔ چنانچہ علاء الدین المارونسی الحنفی (المتوفی ۷۴۵ھ) لکھتے ہیں کہ:

الا سویتہ ای سویتہ بالقبور المعتادۃ۔ (الجوہر النقی علی البقی ج ۲ ص ۳۱)

برابر کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ان کو ان قبروں کے ساتھ برابر کر دیا جائے جن کا شریعت کی عادت سے ثبوت ہو چکا ہے۔

حضرت امام بیہقی نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر (رفع قبورہ من الارض نحواً من شبر۔ سنن الکبریٰ ج ۳ ص ۱۴) زمین سے ایک بالشت کے قریب اونچی تھی۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ:

ان السنۃ ان القبور لا یرفع علی الارض رفوعاً سنت یرہ کہ قبر زمین سے زیادہ اونچی نہ ہو۔ بلکہ

کثیراً — بل یوفع نحو شبور۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۳۱۳) صرف ایک بالشت کے اندازہ کی اونچی ہو۔

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اونچی قبروں کو گرانے کا حکم فرمایا تھا اور ابوالسادات (حضرت علی) کو اس کام کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ پھر حضرت علیؓ نے اپنی خلافت میں یہ کام اپنے ایک فوجی افسر سے لیا جس سے صاف طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مذموم عمارتیں شریعت کی روح کے سراسر خلاف ہیں، اور ان کے وجود کو شریعت کو ارا نہیں کہتی اور یہ ممانعت شرعی حکم کے تحت تھی، نہ جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحب نے لکھا ہے کہ یہ حکم زہد اور تقویٰ کے تحت تھا (جاہ الحق ص ۲۷۸)۔ اگر بالفرض یہ حکم زہد اور تقویٰ کے تحت تھا تو تمہیں یہ زہد اور تقویٰ کیوں راس نہیں آتا؟ علامہ ابن حجر مکی شافعی (المتوفی ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ :-

تجب المبادرة الی ہدمها وهدم القباب ان اونچی قبروں کو اور ان قبروں پر جو قبے اور گنبد بنائے
التي علیها۔ (کتاب الزواجر ص ۱۶۳) گئے ہیں ان کو گرا دینا واجب ہے۔

اور حضرت ملا علی قاری نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ:

و یجب الہدم وان کان مسجداً (مرقاۃ ج ۲ ص ۳۷۲) گرا نا واجب ہے، اگرچہ مسجد ہی کیوں نہ ہو۔
یعنی اگرچہ کسی چالاک اور ہوشیار نے قبروں کے پاس مسجد کا نام دے کر قبے اور گنبد تعمیر کئے ہوں تو ان کو بھی گرا نا واجب ہے کیونکہ مسجد ضرار بھی آخر مسجد کے نام سے تعمیر کی گئی تھی۔ مگر قرآن پڑھنے والے اس کے حشر سے آگاہ ہیں۔ علامہ سید محمود آلوسی الحنفی (المتوفی ۱۲۷۵ھ) لکھتے ہیں کہ:

ثم اجماعاً فان اعظم المحرمات واسباب الشرك الصلوة عندھا واتخاذھا مساجد او بناءھا
علیہ وتجب المبادرة الی ہدمها وهدم القباب التي علی القبور اذھی اضر من
مسجد الضرر لانهما استست علی معصیة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتجب
انالة کل قنديل او سلاح علی قبر لا یجوز
اس پر اجماع ہے کہ حرام ترین اور اسباب شرک کی چیزوں میں سے قبروں کے پاس نماز پڑھنا ہے یا ان پر مسجدیں بنانا یا عمارتیں تعمیر کرنا ہے، واجب ہے کہ اونچی قبروں کو اور جو ان پر قبے ہیں ان کو گرا دیا جائے کیونکہ یہ مسجد ضرار سے بھی زیادہ نقصان دہ ہیں بایں وجہ کہ یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نافرمانی میں تعمیر کئے گئے ہیں۔ آپ نے اونچی قبروں کو ٹھکانے کا حکم دیا ہے اور واجب ہے کہ

وقفہ و نذرۃ - (روح المعانی ج ۱۵ ص ۲۱۹) قبروں پر جو بھی قندیل یا چراغ ہو، اس کو دور کر دیا جائے اور اس کا وقف کرنا اور بندر بھی ناجائز ہے۔

حافظ ابن القیم حنبلی (المتوفی ۷۵۰ھ) لکھتے ہیں کہ :

لا يجوز ابقائها ويجب هدمها (زاد المعاد ج ۲ ص ۲۸) ان کا چھوڑنا جائز نہیں ہے اور ان کا گرانا واجب ہے۔ اور اسی کے قریب الفاظ شیخ الحنابلہ حافظ ابن تیمیہ کے ہیں (ملاحظہ ہو تلخیص کتاب الاستقاناہ ص ۲۷۸)۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ کیا حنفی اور کیا شافعی اور کیا حنبلی سب اونچی قبروں اور ان پر تعمیر شدہ قبروں کو گرانے کا حکم دیتے اور اس کو واجب کہتے ہیں۔

نوٹ : اکثر اہل بدعت حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم کی رفیع شان میں بہت ہی گستاخی کیا کرتے ہیں مگر حضرت ملا علی نقاری الحنفی ان کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں :

کانا من اکابر اهل السنة والجماعة ومن اولیاء هذه الامة - (جمع الوسائل ج ۲ ص ۲۰۸ طبع مصر) کے اکابر میں اور اس امت کے اولیاء میں تھے۔

اور حافظ ابن القیم کی تعریف کرتے کرتے امام جلال الدین سیوطی (المتوفی ۹۱۱ھ) پھولے نہیں سماتے۔ (بغیۃ الوعاة)

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے تحت حضرت علیؑ نے اونچی قبروں کو گرایا اور پھر گرا دینے کا حکم صادر فرمایا ہے اور حضرات علماء کرام اور خصوصاً ملا علی نقاری الحنفی اور سید محمود آلوسی الحنفی وغیرہ نے قبروں پر قبوں اور گنبدوں کے گرانے کو واجب کہا ہے۔ مگر مفتی احمد یار خان صاحب کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”اگر ان کی قبریں پختہ بن گئی ہوں تو ان کو گرانا حرام ہے“۔ (جبار الحق ص ۲۶۹ بلفظہ)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت علیؑ نے ایک حرام کام کیا اور گرایا، اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حرام کام کا حکم دیا (العیاذ باللہ تعالیٰ)

اور کیا اسی حرام کا فتویٰ حضرات فقہاء کرام نے دیا ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ) حضرت مولانا رشید احمد

صاحب گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ) نے کیا خوب اور انصاف کی بات ارشاد فرمائی ہے :

سوال : قبور کا پختہ بنانا اور ان پر عمارات و قببہ و روشنی و فرش فروش وغیرہ جو کچھ کہ لوگ کرتے ہیں الخ۔ الجواب : ہر گاہ کہ احادیث میں ممانعت ان امور کی وارد ہے پھر کسی کے فعل سے وہ جائز نہیں ہو سکتے۔ اور اعتبار قرآن و حدیث و اقوال مجتہدین کا ہے، نہ افعال مخالفین شرع کا۔ اگر عرب اور حریمین میں امور غیر مشروع خلاف کتاب و سنت رائج ہو گئے تو جواز ان کا نہیں ہو سکتا۔ اور جو وہاں ان بدعات کو کوئی منع نہ کر سکے تو یہ حجت جواز کی نہیں ہو سکتی، اس پر سکوت کی کوئی وجہ نہیں، کتاب و سنت سے روکنا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم، رشید احمد عفی عنہ۔ (فتاویٰ رشیدیہ جلد اول ضلہ)

فرق مخالف کا اعتراض مفتی احمد یار خان صاحب نے اس حدیث کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث کہ قبروں کو مٹا دو اور گرا دو، مشرکین کی قبروں کے متعلق ہے اور اس کی دلیل وہ حدیث پیش کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مشرکوں کی قبروں کو اکھاڑنے کا حکم دیا، اور لکھتے ہیں کہ شیخ ابن حجر مکی، فتح الباری جلد ۲ ضلہ ۲ میں تحریر فرماتے ہیں (عربی عبارت کا ترجمہ خود مفتی صاحب کی زبانی یہ ہے) کیا جاہلیت کے مشرکین کی قبریں اکھیڑ دی جائیں (باب) فرماتے ہیں یعنی ماسوا انبیاء اور ان کے متبعین کے، کیونکہ ان کی قبریں ڈھانے میں ان کی اہانت ہے (جام الاحق ضلہ ۲۸) دوسرے اس لئے کہ اس میں قبر کے ساتھ فوٹو کا کیوں ذکر ہے، مسلمان کی قبر پر فوٹو کہاں ہوتا ہے؟ معلوم ہوا کہ کفار کی قبریں مراد ہیں کیونکہ ان کی قبروں پر میت کا فوٹو بھی ہوتا ہے۔ تیسرے اس لئے کہ فرماتے ہیں کہ اونچی قبر کو زمین کے برابر کر دو اور مسلمان کی قبر کے لئے سنت ہے کہ زمین سے ایک ہاتھ اونچی رہے (بلفظہ جام الاحق ضلہ ۲۸)

الجواب : یہ سب باتیں مفتی احمد یار خان صاحب کی جہالت اور علم سے بے خبری کا نتیجہ ہیں اولاً اس لئے کہ فتح الباری کا مصنف وہ ابن حجر مکی کو قرار دیتے ہیں، حالانکہ فتح الباری حافظ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف ہے جو ابن حجر مکی سے اقدم بھی ہیں اور اعلم بھی ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس پودہ میں صدیوں میں ایسے لوگ مشقی بن گئے ہیں جن کو فتح الباری جیسی کتاب کے مولف کا صحیح علم

نہیں ہے۔ حیرت ہے ایسے مفتی پر۔ وثانیاً مفتی صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ نبش قبور الگ چیز ہے جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مشرکین کی قبروں کو اکھاڑنے کا حکم دیا تھا۔ اور مفتی صاحب کے قول کے مطابق شیخ ابن حجر مکی نے فتح الباری میں اس کی شرح کی ہے۔ اور سو یہ قبور اور چیز ہے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وثالثاً مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابلِ داد ہے کہ قبر کے ساتھ فوٹو کا ذکر ہے اور مسلمان کی قبر پر فوٹو کہاں؟ سبحان اللہ تعالیٰ! گویا مفتی صاحب نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ فوٹو اور قبر ایک ساتھ ہوں، حالانکہ قبروں کو ڈھانے کا حکم الگ ہے اور تصویروں کو مٹانے کا حکم جدا ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں ان کو مٹانا چاہیے۔ چنانچہ نسائی شریف ج ۱ ص ۲۲ میں اسی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں ولا صورة فی بیت، کسی گھر میں کوئی تصویر نہ چھوڑنا۔ مفتی صاحب ہی فرمائیں کیا آج کل مسلمانوں کے گھروں میں بھی فوٹو اور تصویریں ہوتی ہیں یا نہیں؟ وریباً یہ بھی مفتی صاحب نے خوب کہی کہ اونچی قبر کو زمین کے برابر کر دو۔ حالانکہ ہم علامہ مارویتی کے حوالے سے نقل کر چکے ہیں کہ زمین کے ساتھ برابر کرنا مراد نہیں ہے بلکہ معتاد قبروں کے ساتھ برابر کرنا مراد ہے۔ وخامساً مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابلِ داد ہے کہ قبر زمین سے ایک ہاتھ اونچی رہے۔ نہ معلوم یہ کس حدیث کا ترجمہ ہے کہ قبر زمین سے ایک ہاتھ اونچی ہو۔ یہ بدایونی تحقیق بھی بہت ہی نرالی ہے۔ پہلے سنن البخاری اور عالمگیری کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ قبر صرف ایک شبر (بالشت) کے قریب اونچی ہونی چاہیے۔ غنیۃ الطالبین ص ۲۴ رکن الدین ص ۲۸، فتاویٰ رضویہ ص ۱۴ اور ملفوظات حشر ص ۳۲ میں بھی قبر کی اونچائی ایک بالشت لکھی ہے۔ وسادساً یجبے ہم ایک صحیح روایت عرض کرتے ہیں جس سے مفتی احمد یار خان اور اسی طرح ان حضرات کی بخوبی تردید ہو جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی مذکورہ حدیث مشرکوں کی قبروں سے متعلق ہے چنانچہ مشہور و معروف تابعی حضرت ثمامہ بن شنی (المتوفی ۸۰ھ) روایت کرتے ہیں کہ:

قال کنا مع فضالة بن عبید بارض الروم
برودس فتویٰ صاحب لنا فامر فضالة
بقبره فسوی ثم قال سمعت رسول
الله صلی اللہ علیہ وسلم یامر بتسویتها۔
ہم حضرت فضالہ بن عبید (المتوفی ۵۳ھ) کے ساتھ روم
کی سرزمین رودس کے مقام پر تھے کہ ہمارا ایک ساتھی فوت
ہو گیا۔ حضرت فضالہ نے ان کی قبر کو (عام قبروں کے ساتھ)
برابر کرنے کا حکم دیا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ میں نے جناب

(مسلم ج ۱ ص ۳۱۲ و نسائی ج ۱ ص ۲۲۱ و ابوداؤد ج ۲) نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اپنے قبروں کو برابر کرنے کا حکم دیا ہے۔ (مش)

یہی روایت اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ امام بیہقی نے یوں نقل کی ہے :

عن ثمامہ بن شفیق قال خرجنا غزاة
 زمن معاویة فی الی هذه الدروب وعلینا
 فضالة بن عبید فتوفی ابن عم لی
 یقال له نافع بن عبد قال فقام فضالة
 فی حفرة فلما دفناه قال تحفوا عنه
 التراب فان رسول الله صلی الله علیه
 وسلو کان یامرنا بتسویة القبور۔

ثمامہ بن شفیق کہتے ہیں کہ ہم حضرت امیر معاویہ کے عہد حکومت میں ان پہاڑی قلعوں میں جہاد کرنے کی غرض سے نکلے۔ ہم پر حضرت فضالہ بن عبید سالار مقرر تھے۔ میرا چچا زاد بھائی جس کا نام نافع بن عبد تھا وہ فوت ہو گیا۔ حضرت فضالہ ان کی قبر میں کھڑے ہوئے۔ جب ہم ان کو دفن کر چکے تو حضرت فضالہ نے فرمایا۔ قبر پر سے مٹی تھوڑی اور ہلکی کرو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں

قبروں کو برابر کرنے کا حکم دیا ہے۔ (سنن الکبریٰ ج ۳ ص ۴۱۱)

یہ صحیح روایت اس بات کی روشن اور واضح دلیل ہے کہ تسویۃ قبور کا حکم مشرکوں کی قبروں کے ساتھ خاص نہ تھا اور نہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی اور فوج کے سپہ سالار ایک مسلمان کی قبر کے تسویہ کا حکم ہرگز نہ دیتے اور اس پر دلیل یہ نہ پیش کرتے کہ میں نے خود اپنے کانوں سے یہ مسئلہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ حضرت صحابہ کرام کا دور تھا اور حضرت امیر معاویہ (المتوفی سنہ ۳۵ھ) کی حکومت تھی۔ کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ حضرت فضالہ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں، تسویۃ قبور کا حکم تو مشرکوں کی قبروں کے متعلق ہے۔

الغرض حضرت صحابہ کرام سے بلا تکبر یہ امر ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک بھی یہ حکم عام تھا۔ مشرکوں کی قبروں سے اس کی تخصیص کی ہرگز کوئی وجہ ان کے نزدیک نہ تھی۔

باقی عام قبوں کو اور قبروں پر عمارت کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر قیاس کرنا درست نہیں ہے اس لئے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو :

فقال ناس يدفن عند المنبر وقال اخرون
يدفن بالبقيع فجاء ابو بكر الصديق
فقال سمعت رسول الله صلى الله عليه
وسلم يقول ما دفن نبى قط الا في مكانه
الذى توفى فيه فحفر له فيه -

بعض لوگوں نے کہا کہ آپ کو منبر کے پاس دفن کیا جائے اور
بعض دوسروں نے کہا کہ آپ کو جنت البقیع کے قبرستان میں
دفن کیا جائے۔ اتنے میں حضرت ابو بکرؓ تشریف لائے اور انہوں
نے فرمایا کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
سے سنا ہے کہ نبی صرف اسی جگہ میں دفن کیا جاتا جس میں ان کی
وفات ہوتی ہے، سو اسی جگہ آپ کی قبر کھودی گئی۔

(سوطا امام مالک ص ۸ و شمائل ترمذی ص ۲۸)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں ہوئی تھی، لہذا اس
حدیث کے رُوسے آپ کو وہاں ہی دفن کیا گیا۔ باقی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بالبقیع وہاں دفن
ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ اگر وہ اُس جگہ سے باہر کہیں دفن ہوتے تو ہرگز ان کی قبروں پر حضرات صحابہ
کرامؓ عمارت تعمیر نہ کرتے۔ جیسے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور دیگر ہزاروں کی تعداد میں حضرات صحابہ کرامؓ
تھے مگر کسی کی قبر پر نہ تو گنبد بنائے گئے اور نہ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ کئی صدیوں کے بعد ترکوں نے اپنے
شاہانہ ٹھاٹھ یا ٹھکے کے پیش نظر متعدد قبروں پر گنبد تعمیر کئے۔ مگر ان کا یہ فعل شرعاً کوئی حجت نہیں ہے۔
کیونکہ پہلے صحیح اور صریح روایت گذر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے
جو کام آپ نے منع کیا ہو وہ کسی کے کرنے سے جائز نہیں ہو جاتا۔ الغرض یوں نہیں ہوا کہ آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر مبارک پہلے ہو اور اس پر عمارت بعد کو تعمیر کی گئی ہو۔ بلکہ چونکہ آپ
کی وفات ہی اس حجرہ میں ہوئی تھی اس لئے اس سابق حدیث کے پیش نظر آپ کو وہاں ہی دفن کیا
گیا۔ پھر حسب تحقیق شاہ عبدالرحمن صاحب محدث دہلوی وغیرہ ایک خاص المناک واقعہ پیش آیا جس
کے تحت ۱۵۵۰ھ میں سلطان تورالدین شہید محمود بن زنگی نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر
مبارک کے اردگرد نہایت گہری دیوار میں سیسہ اور رانگ گلا کر اس کو بھر دیا اور مضبوط دیوار قائم
کی۔ (دیکھئے جذب القلوب الی دیار المحبوب ص ۸۶) اور پھر ۱۶۱۵ھ میں سلطان قلاؤن صالحی نے یہ
گنبد سبز جو اب تک موجود ہے، بنوایا۔ مفتی احمد یار خان صاحب کو اس کا اقرار ہے (دیکھئے جوار الحق ص ۲۴)

نوٹ ضروری : قبروں پر قبوں اور گنبدوں کا گمانا صحیح احادیث اور اقوال حضرات فقہاء کرام سے ثابت ہے۔ مگر یہ بات اچھی طرح ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کام سلطان اسلام اور اسلامی حکومت کا ہے۔ انفرادی طور پر افراد کا یہ کام نہیں ہے۔ اس لئے عوام کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی ہرگز گنجائش نہیں ہے۔

قبروں پر چراغ روشن کرنا

قبور پر چراغ و قندیل اور موم بتی وغیرہ جلانے کی شریعت اسلامی میں کوئی اصل نہیں ہے اور شریعت حقہ اس قبیح حرکت سے نہایت ہی سخت بیزار ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ :

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائرات القبور والمتخذین علیہا المساجد والسج (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۰۵، موارد النظماء ج ۲، نسائی ج ۲ ص ۲۲۲، طیالسی ص ۳۵۵، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۰۵)۔
آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر اور ان پر چراغ روشن کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔

اور اسی مضمون کی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ (ملاحظہ ہو، موارد النظماء ج ۲ ص ۱۰۵)۔

اور ظاہر ہے کہ جس کام پر سردارِ دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو، وہ کسی وقت اور کسی حیثیت سے جائز اور مستحب نہیں ہو سکتا، اور نہ اس کے اندر کوئی فائدہ اور خوبی ہو سکتی ہے، اور نہ ضرورت اور غیر ضرورت کے مصنوعی پیوند اس میں لگ سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مفتی احمد یار خان صاحب یا کوئی اور بدعت پسند اس میں خاندان ساز فوائد اور منافع بتانا شروع کر دے۔ یہ صرف ان کے منہ کی بات ہے، اور جن علماء سے انہوں نے جواز اور استحباب نقل کیا ہے وہ نہ تو معصوم ہیں اور نہ مجتہد۔ پھر نہ معلوم جس کام پر آقائے نامدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو

وہ ان کے کہنے سے کیسے مستحب اور جائز و کارِ ثواب ہو سکتا ہے؟ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ولی اور غیر ولی، عالم اور جاہل کی قبر کا کوئی فرق نہیں کیا۔ جس سے صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ ہر ایک قبر پر چراغ روشن کرنا باعثِ لعنت ہے۔ پھر یہ کہنا کہ علی کے معنی اُوپر کے ہیں، لہذا قبر کے اُوپر چراغ جلانا درست نہیں اور اگر آس پاس ہو تو جائز ہے، یہ بھی نرسی جہالت ہے۔ علی کے معنی میں یہ دونوں مفہوم داخل ہیں۔ اَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْبَةٍ كَمَا

معنی کیا مفتی احمد یار خان صاحب یہ کریں گے کہ حضرت عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام اُس بستی میں لوگوں کے مکانوں کی چھتوں پر چڑھتے ہوئے گزرے تھے؛ حدیث معراج میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

فمررت علی موسیٰ۔ (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۲۸) میرا گزر حضرت موسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر ہوا۔

الغرض لفظ علی اردگرد اور آس پاس کو بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ۔ اور آپ نہ کھڑے ہوں کسی منافق کی قبر پر۔

کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ منافق کی قبر کے اُوپر چڑھ کر نہ کھڑے ہوں، مگر دعا کے لئے اردگرد اور آس پاس کھڑے ہو جائیں۔ ایک روایت یوں آتی ہے کہ ایک بی بی کی ایامِ زچگی میں وفات ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے:

فقام علیہا للصلوٰۃ (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۰۱) اس پر کھڑے ہو کر جنازہ کی نماز پڑھائی۔

مفتی صاحب اس کا کیا مطلب لیتے ہیں، یہ ان کی صواب دید پر موقوف ہے۔ غرضیکہ اگر چراغ قبر کے اُوپر جلایا جائے، تب بھی ناجائز ہے، اور اگر آس پاس روشن کیا جائے تب بھی باعثِ لعنت ہے۔ بلکہ دوسری صورت لوگوں میں زیادہ رائج تھی اور اب بھی ہے۔ کیونکہ یہ کسی نے گوارا نہیں کیا کہ کسی بزرگ کی قبر کے تعویذ پر چراغ جلایا جائے۔ لوگ تو بزعم خود حضراتِ اولیاءِ کرام کی عزت کے لئے چراغاں کرتے ہیں، اور یہ صورت ان کے خیال میں سراسر توہین کی ہے، پھر بھلا وہ اس کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں؛ اس لئے قرین قیاس یہی بات ہے کہ قبر کے اردگرد چراغ جلانا زیادہ مذموم ہے۔

رہا مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ اس صورت میں تو حقیقت اور مجاز کا اجتماع لازم ہوگا اور یہ منع ہے۔
(جاء الحق ص ۱۹) نویہ ان کی بے خبری کا نتیجہ ہے کیونکہ اس صورت میں جمع بین الحقیقۃ والمجاز نہیں ہے
جو ناجائز ہے، بلکہ یہ عموم مجاز ہے جو جائز ہے۔ اصول فقہ کی کتاب میں ملاحظہ کیجئے۔

جلیل القدر صحابی حضرت عمرو بن العاص (المتوفی ۳۷ھ) فاتح مصر نے یہ وصیت کی تھی کہ:
فاذا انا مت فلا تصحبني نائحة ولا
نار۔ (مسلم ج ۱ ص ۷۷)
جب میری وفات ہو جائے تو نہ میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے
والی عورت جائے اور نہ میرے ساتھ آگ ہو۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ (المتوفی ۳۷ھ) نے بھی یہ وصیت کی تھی کہ:

ولا تتبعونی بنار (موطا امام مالک ص ۷۷)
میرے ساتھ آگ نہ لے جانا۔

حضرت امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ:

واما اتباع المیت بالنار فمكروه للحديث
ثم قيل سبب الكراهة كونه من شعاع
الجاهلية وقال ابن حبيب المالكي كره
تفاءلا بالنار۔
میت کے ساتھ آگ لے جانا حدیث کی رو سے مکروہ ہے۔
یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کراہت شعاع جاہلیت ہونے کی وجہ
سے ہے اور امام ابن حبیب مالکیؒ کہتے ہیں کہ آگ بد فالی
اور بد شگون کی وجہ سے مکروہ ہے (کہ کہیں اس کا تعلق

(شرح مسلم ج ۱ ص ۷۷) آگ سے ہی نہ ہو جائے۔

غور کیجئے کہ حضرات ہمایہ کرامؓ وفات کے وقت کس طرح وصیت کرتے ہیں کہ وفات کے بعد
آگ ہمارے قریب نہ آنے دیتا۔ مگر غضب ہے کہ آج قبروں پر خوب ٹپکا کر چراغ روشن کئے جاتے ہیں
اور یہ منطبق پیش کی جاتی ہے کہ اس میں حضرات اولیاء کرامؓ کی عظمت ہے، راستہ پر چلنے والوں کیلئے سہولت
ہے۔ قرآن کریم پڑھنے والوں کے لئے آسانی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر حضرات اولیاء کرامؓ کی تعظیم و توقیر آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کی خلاف ورزی سے ہوتی ہے اور اگر ان کی محبت لعنت کا کام کرنے
سے ہوتی ہے تو ہم بہانگ و ہل کہتے ہیں کہ یہ تعظیم مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کے ساتھیوں کو ہی نصیب
ہو۔ ہمارے نزدیک خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے آگے

تسلیم خم کرنے سے ہی حضرات اولیاء کرام اور بزرگان دین کی تعظیم ہوتی ہے عذر
قیاس کن زگلستان من بہار مرا

حافظ ابن القیثم لکھتے ہیں کہ :

فہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اتخاذ
القبور مسلجاً وایقاد السرج علیہا (زاد المعاد ج ۱ ص ۱۴۳)

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ :

وایقاد النار علی القبور فمن رسوم الجاہلیۃ
قبورں پر آگ جلانا جاہلیت کی رسم ہے۔
(عالمگیری ج ۱ ص ۱۴۸)

اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبعوض ترین
وہ شخص ہے جو اسلام میں جاہلیت کی رسمیں تلاش کرے۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۷۰ عن البخاری)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی کا حوالہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح قاضی ثناء اللہ صاحب کا
یہ حوالہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر چراغ افروزاں نزد قبر و سجدہ کنندگان لعنت
گفتہ " (ارشاد الطالبین ص ۲۲)۔ اور مفتی احمد یار خان صاحب بھی اس کو نقل کرتے ہیں اور نیز لکھتے ہیں
کہ شاہ عبدالعزیز صاحب بھی قبروں پر چراغ روشن کرنے کو بدعتِ شنیعہ کہتے ہیں (بجاری الحق ص ۲۸۸-۲۸۹)۔

اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب لکھتے ہیں :

واما از تکاب محرمات از روشن کردن چراغہا و
ملبوس سائتن قبور و سرود ہا و نوانختن معازف
بدعاتِ شنیعہ اند و حضور چہنیں مجالس ممنوع۔
یعنی حرام چیزوں کا ارتکاب کرنا مثلاً قبروں پر چراغ جلانا
اور ان پر چادریں چڑھانا اور سرود اور گانے بجانے کے
آلات استعمال کرنا بدعاتِ شنیعہ میں سے ہے اور ایسی

(فتاویٰ شاہ رفیع الدین ص ۱۴۱) مجالس میں حاضر ہونا ممنوع ہے۔

حضرات آپ نے ملاحظہ کیا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے لے کر اس وقت کے علماء حق
تک قبروں پر چراغ روشن کرنے کو باعثِ لعنتِ حرام، مکروہ، بدعت اور بدعتِ شنیعہ سے تعبیر کرتے ہیں پھر

بھلا اس مذموم فعل میں بھلائی اور خوبی آئے تو کہاں سے آئے؟ مگر پتہ مرنے کے بعد چلے گا۔

بوقت صبح شود ہچو روزِ معلومت کہ با کہ باختہ عشق و رشپ دیکور

مفتی احمد یار خان صاحب کی ججمنٹ | مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ "حضرت شاہ عبدالعزیز

صاحب وقاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ بے شک بزرگ ہستیاں ہیں لیکن یہ حضرات مجتہد نہیں تاکہ کراہت تحریمی و حرمت فقط ان کے قول سے ثابت ہو، اس کے لئے مستقل دلیل شرعی کی ضرورت ہے۔" (بلفظہ جارالحق ص ۲۹۴)۔ مفتی صاحب کی یہ بات قابل صد تحسین ہے کہ انہوں نے ایک حق بات تو زبان سے نکالی ہے اور اس کا کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے کہ دلیل شرعی کے مقابلہ میں بزرگ سے بزرگ ہستیاں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہی تو ہمارا اور اہل بدعت کا اصولی جھگڑا ہے کہ ہم قرآن کریم اور حدیث شریف اور حضرات صحابہ کرام اور اجماع امت جیسی شرعی دلیل کے مقابلہ میں کسی بھی بزرگ ہستی کی بات کو حجت نہیں تسلیم کرتے، اور اہل بدعت نے انہی بعض بزرگ ہستیوں کی لغزشوں کو چن چن کر دین بنا رکھا ہے۔ اور شرعی دلیل کی طرف مطلقاً دھیان ہی نہیں کرتے۔ کاش کہ وہ انصاف اور دیانت کے ساتھ اس اصول پر کاربند ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

مگر اس عبارت میں چند وجوہ سے بحث ہے۔ اولاً کیا جن حضرات سے مفتی صاحب اور ان کے ہم نوا بزرگ استدلال و احتجاج کیا کرتے ہیں وہ سب کے سب مجتہد ہیں؟ اگر ہیں تو چشم مارو شن دل ماشاد! اگر نہیں تو اس وقت یہ قاعدہ کہاں جاتا ہے؟ و ثانیاً مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ جس کام پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے کیا اس میں بھی کراہت تحریمی اور حرمت ہوتی ہے یا نہیں؟ ان دونوں حضرات کا یہ فتویٰ اپنا ذاتی نہیں، یہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث سابق سے ماخوذ ہے۔ اور قاضی ثناء اللہ صاحب باقاعدہ اپنی عبارت میں اس حدیث کا حوالہ دے رہے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چراغ جلانے والوں پر لعنت کی ہے اور حضرت شاہ صاحب لفظ مہرمات میں اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بلاشک اگر یہ فتویٰ اور قول

ان کا اپنی طرف سے ہونا تو دلیل شرعی کے مقابلہ میں حجت نہ ہوتا۔ مگر یہاں تو ان کا فتویٰ دلیل شرعی پر مبنی ہے، پھر یہ کیسے رد ہوا؟ وثالثاً مفتی صاحب کی یہ تحقیق اور تقسیم بھی قابلِ داد ہے کہ کراہت تحریمی اور حرمت تو بزرگ ہستیوں کے قول سے ثابت نہیں ہو سکتی مگر استحباب اور جواز ان کے قول سے ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا استحباب ایک شرعی حکم نہیں ہے؟ پہلے باحوالہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ استحباب و نُدب بھی ایک شرعی حکم ہے، اور اس پر بھی دلیل درکار ہے۔ اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ کسی مباح کی اباحت بھی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔

نوٹ: اگر کسی مجبوری کی وجہ سے کسی میت کو رات کے وقت دفن کرنے کی اہت آئے اور روشنی کی ضرورت پیش آئے تو کتب حدیث میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت موجود ہے۔ یہ چیز محلِ نزاع سے بالکل خارج ہے۔

قبروں پر چادریں ڈالنا اور پھول وغیرہ چڑھانا

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعین اور خیر القرون سے اس کا ہرگز کوئی ثبوت نہیں کہ حضرات اولیاء کرامؓ کی قبروں پر چادریں ڈالی گئی ہوں یا ان پر پھول وغیرہ چڑھائے گئے ہوں۔ حضرات اولیاء کرامؓ کی قبریں بھی ہوتی تھیں، پھول اور چادریں بھی ہوتی تھیں، اور ڈالنے والے بھی ہوتے تھے، اور ان میں عشق و محبت کا اعلیٰ جذبہ بھی تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے نہ تو پھول چڑھائے اور نہ چادریں ڈالیں، اور آج یہ کام جائز ہو گئے اور کارِ ثواب بھی، اور اہل سنت کی علامت بھی قرار پائی اور شعار بھی۔ باقی مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ اہل بدعت نے حضرت ابن عباسؓ کی جس روایت سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دو قبروں پر کھجور کی ٹہنیاں گاڑ دی تھیں۔ ایک شخص پیشاب کی چھینٹوں سے اجتناب نہیں کیا کرتا تھا (اور اس صورت میں ناپاک بدن اور کپڑوں سے جو نماز پڑھی گئی وہ کالعدم رہی تو اصل عذاب ترکِ صلوٰۃ پر ہوا۔ نووی ج ۱ ص ۱۲۱)۔ اور دوسرا چغلی کیا کرتا تھا۔

اور آپ نے فرمایا کہ جب تک یہ ٹہنیاں تر رہیں گی، شاید ان سے سزا میں تخفیف ہو جائے (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۱۱۱)۔ تو اس سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔

اولاً اس لئے کہ تخفیفِ عذاب کا سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت تھی۔ ٹہنیاں تو صرف اس کی علامت اور نشانی مقرر ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

انی مورت بقبرین یعدبان قاجبیت
بشفاعتی ان یوقہ ذلک عنہما دام
العصنان رطیین۔ (مسلم ج ۲ ص ۲۱۸)

کہ میں دو قبروں کے پاس سے گزرا۔ ان میں دونوں مردوں کو عذاب ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی شفاعت کے ذریعہ یہ پسند کیا کہ جب تک یہ ٹہنیاں تر رہیں ان دونوں سے عذاب کی کمی ہو۔

اگرچہ اپنی جگہ قرآن کریم تیسیحات اور ٹہنیاں (سبز و خشک) بھی تخفیفِ عذاب کا سبب ہیں مگر اس واقعہ میں تخفیفِ عذاب کا اصل سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت تھی۔ ٹہنیاں تو صرف اس کی علامت قرار دی گئی تھی مفتی احمد یار خان صاحب کی یہ غلطی ہے کہ انھوں نے لکھا ہے کہ ”عذابِ قبر کی کمی سبزے کی تسبیح کی برکت سے نہ کہ محض حضور علیہ السلام کی دعائے۔ اگر محض دعائے کمی ہوتی تو حدیث میں خشک ہونے کی کیوں قید لگائی جاتی۔ لہذا اگر ہم بھی آج پھول وغیرہ رکھیں تو بھی انشاء اللہ میت کو فائدہ ہوگا (جبار الحق ص ۲۸۴)۔ مفتی صاحب اگر ٹہنیوں کی تسبیح کی وجہ سے عذاب میں تخفیف ہوتی تو سبزے کی قید کیوں لگائی؟ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے خشک ہو یا تر۔ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ۔

نوٹ : حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ کی دونوں روایتوں میں واقعہ دراصل ایک ہی ہے

البتہ راویوں کی تعبیر کا ضرور فرق ہے، اور علم حدیث میں ایسا بعض اوقات ہو ہی جاتا ہے۔ امام نوویؒ اور علامہ خطابیؒ (المتوفی ۷۸۸ھ) وغیرہ اس واقعہ کے اتحاد ہی کے قائل ہیں۔ اگر یہ دو واقعے

بھی ہوں جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ (فتح الباری ج ۱ ص ۲۱۸) لکھتے ہیں، تب بھی کوئی حرج نہیں۔

جس روایت میں آپ کی شفاعت کا ذکر ہے وہ اس روایت کی تفسیر ہے جس میں اس کا ذکر نہیں

ہے۔ تو اصل علت اور سبب شفاعت ہی ہے۔ والحدیث یفسر بعضہ بعضاً۔ لہذا مولوی نعیم الدین

صاحب مراد آبادی (المتوفی ۱۳۶۴ھ) نے اپنے رسالہ (فوائد النور ص ۲۲-۲۳) میں جو اس پر زور دیا ہے

کہ دو واقعے الگ الگ ہیں، ان کو چنداں مفید نہیں ہے۔

وثانیاً یہ ٹہنیاں عام درختوں سے نہ کاٹی گئی تھیں بلکہ مسلم ص ۲۱۸ کی روایت میں اس کی تصریح ہے

کہ یہ ان دو درختوں کی ٹہنیاں تھیں جو بطور معجزہ آپ کے پاس چل کر آئے تھے، اور پھر اپنے اپنے مقام پر پھلے گئے تھے۔

وثالثاً اس روایت سے اگر ثبوت ہے بھی تو صرف، تر ٹہنیوں کا، پھولوں اور چادروں کا ثبوت

کہاں سے ہوا؟

ورابعاً اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اصل سبب تخفیف عذاب کا ٹہنیوں کا سبز ہونا تھا، اور یہ

علت پھول وغیرہ میں پائی جاتی ہے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ گناہ گاروں اور فاسقوں کی قبروں

پر پھول وغیرہ ڈالنے چاہئیں۔ حضرات اولیاء کرام کی قبروں پر اس کا ثبوت کیسے ہوا؟ کیونکہ آپ نے

گناہ گاروں کی قبروں پر ٹہنیاں رکھی تھیں نہ کہ حضرات اولیاء کرام کی قبروں پر (ملاحظہ ہو عمدة القاری ج ۱ ص ۸۷)

وخامساً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام اور خیر القرون سے ہرگز اس کا

ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے کسی ولی اور بزرگ کی قبر پر سبز ٹہنی رکھی ہو اور پھول ڈالے ہوں۔ — یہی

حضرت بریدہ بن الخصیب کی وصیت کہ میری قبر پر تر ٹہنی رکھ دینا (بخاری ص ۱۸۱) جو حضرت وصیح بن سفيان

کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ انہوں نے انکساری سے اپنے کو گناہگار سمجھ کر یہ وصیت کی ہو۔ اور سوال یہ ہے کہ کیا

خیر القرون میں کسی نے کسی کو ولی اور بزرگ سمجھ کر اس کی قبر پر ٹہنیاں رکھی ہیں؟ اور کیا ان سے چادریں

ڈالنے کا ثبوت ہے؟ اسی جزو میں اختلاف ہے اور بس ع

سخن شناس نہ دہرا خطا اینجا است

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ مولوی اشرف علی صاحب نے اصلاح الرسوم میں لکھا،

کہ پھول وغیرہ فاسقوں، فاجروں کی قبروں پر ڈالنا چاہیے نہ کہ قبور اولیاء پر۔ ان کے مزارات میں

عذاب ہے ہی نہیں جس سے پھول وغیرہ سے تخفیف کی جائے۔ مگر خیال رہے کہ جو اعمال گناہگار کیسے

رفع مصیبت کرتے ہیں وہ صالحین کے لئے بلندی درجات کا فائدہ دیتے ہیں۔ (جبار الحق ص ۲۸۲)
 مفتی صاحب کو یہ نسخہ تو بہت ہی اکیسرا ہاتھ آیا ہے، مگر اس پر مطلقاً غور نہ کیا کہ یہ مسئلہ جناب
 نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام کو بھی معلوم تھا۔ پھر انہوں نے صالحین کی قبروں
 پر پھول کیوں نہ ڈالے؟ اور صالحین کو رفع درجات کے فائدہ سے کیوں محروم رکھا؟
 کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟

اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ قیاس بھی مردود اور باطل ہے کہ ایک تر پھول میں
 زندگی ہے، اس لئے وہ تسبیح و تہلیل کرتا ہے جس سے میت کو ثواب پہنچتا ہے یا اس کے عذاب میں
 کمی ہوتی ہے، زائرین کو خوشبو حاصل ہوتی ہے۔ لہذا ہر مسلمان کی قبر پر ڈالنا جائز ہے (جبار الحق ص ۲۸۳ بقلم)
 فی الجملہ ادراک و شعور اور تسبیح و تہلیل تو ہر ایک چیز سے شرعاً ثابت ہے اور قرآن کریم اس
 پر ناطق ہے پھر خشک و تر کا فرق کیوں؟ علاوہ بریں یہ مسئلہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور
 حضرات صحابہ کرام کو بھی معلوم تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ مزید برآں چادروں میں کونسی تری،
 سبزی اور زندگی ہے جو اس حدیث سے وہ بھی قبروں پر ڈالنی جائز ہو گئیں؟ باقی کسی غیر معصوم اور
 غیر مجتہد کی بات حجت نہیں ہے۔ رہا امام شامی وغیرہ کا یہ قول کہ قبور پر ستور درست ہیں کیونکہ اس
 میں صاحب قبر کی تعظیم ہے وغیرہ وغیرہ، تو قابل التفات نہیں ہے اس لئے کہ یہ غیر مجتہد کا قول ہونے
 کے علاوہ بلا دلیل بھی ہے۔ اور قبر اور تعظیم قبر کوئی نیا واقعہ نہیں کہ ہم اس میں متاخرین کے قیاس کو
 بھی تسلیم کر لیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین کے
 زمانہ میں قبریں بھی ہوتی تھیں مگر چادروں کا کوئی دستور نہ تھا (اور اسی پر ان کا عمل اور اتفاق رہا ہے
 یہ الگ بات ہے کہ مفتی احمد یار خان صاحب نے اپنی جہالت کا یوں ثبوت دیا ہے، ان کے قبور پر
 سبزہ یا پھول ڈالنا بالاتفاق جائز ہے۔ جبار الحق ص ۲۸۳۔ لاجول ولا قوۃ الا باللہ۔ لہذا ہمیں مصنوعی
 تعظیم اور احترام کی ضرورت نہیں ہے۔ جو انہوں نے کیا سو ہمیں بھی کرنا چاہیے۔

رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ قیاس کہ "چادر کی اصل یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ پاک

میں بھی کعبہ معظمہ پر غلاف تھا کہ اس کو منع نہ فرمایا۔ صدیوں حضور علیہ السلام کے روضہ پاک پر غلاف سبز لٹمی چڑھا ہوا ہے جو کہ نہایت قیمتی ہے۔ آج تک کسی نے اس کو منع نہ کیا۔ مقام ابراہیم یعنی وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر حضرت خلیلؑ نے کعبہ معظمہ بنایا، اس پر بھی غلاف چڑھا ہوا ہے۔ (بلفظہ جارالحق ص ۲۸۵)۔ تو یہ قیاس مع الفارق ہے جو مسموع نہیں ہے۔ اس لئے کہ کعبہ کا علاؤ النخست صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی موجودگی میں چڑھتا تھا، اور اس میں آپ نے تغیر نہیں کیا۔ لہذا وہ عین سنت ہے (دیکھئے بخاری جلد ۲ ص ۱۳۳ وغیرہ)۔ اسی طرح مقام ابراہیم کا غلاف بھی اگر ثابت ہو، تو بظاہر خیر القرون کا ہوگا، ان پر قبور کے غلاف کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ راقم ایتم دو مرتبہ حج کے شرف سے مشرف ہوا ہے لیکن مقام ابراہیم پر کوئی غلاف نہیں دیکھا۔ اس وقت یہ مبارک پتھر ایک دبیز شیشے کے مینار میں رکھا ہوا ہے۔ باقی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کا غلاف، تو اگر یہ کسی معتبر دلیل سے ثابت ہو تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غسل، دفن اور قبر وغیرہ کے متعلق چند اور خصوصیات بھی تھیں۔ ممکن ہے یہ بھی ان ہی میں سے ہو۔ لہذا اس پر عام قبروں کو قیاس کرنا باطل ہے۔ اور پہلے حضرت شاہ رفیع الدین صاحب سے اور بقول مفتی احمد یار خان صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے یہ نقل کیا جا چکا ہے کہ قبر کو ملبوس کرنا یعنی اس پر چادریں وغیرہ ڈالنا بدعتِ شنیعہ ہے۔ لہذا عام حکم یہی ہے۔

مفتی صاحب کا مقتیانہ استدلال | مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ اولیاء اللہ

اور ان کے مزارات شعائر اللہ ہیں اور شعائر اللہ یعنی اللہ کے دین کی نشانیوں کی تعظیم کرنے کا قرآنی حکم ہے وَمَنْ يُعْظِمِ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ۔ اس تعظیم میں کوئی قید نہیں۔ ہر ملک ہر رسم، جس ملک اور جس زمانہ میں جو بھی جائز تعظیم مروج ہے وہ کرنا جائز ہے۔ ان کی قبروں پر پھول ڈالنا، چادریں چڑھانا، چراغاں کرنا، سب میں ان کی تعظیم ہے لہذا جائز ہے (بلفظہ جارالحق ص ۲۸۳) داد دیکھئے مفتی صاحب کی اس تحقیق کی کہ حضرات اولیاء اللہ کے مزارات بھی شعائر اللہ میں

داخل ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے معظّم شعائر اللہ تو چار بتائے ہیں۔ قرآن، کعبہ نبی اور نماز (حجۃ اللہ ج احک)۔ وہاں قبور کا ذکر نہیں ہے، اور کسی امام سے بھی قبور کا شعائر اللہ ہوا منقول نہیں۔ مگر مفتی صاحب کی تحقیق سے مزارات سے بھی شعائر اللہ ٹھہرے۔ علماء عقائد نے صراحت سے لکھا ہے کہ جس کے خاتمہ بالآخر ہونے کی خبر اللہ تعالیٰ نے اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ندوی ہو، ہم صرف اس کے متعلق حسن ظن ہی رکھ سکتے ہیں، قطعیت سے کچھ نہیں کہہ سکتے، تو یقین کے ساتھ کسی کو ولی کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اور پھر ان کی قبر کو شعائر اللہ کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ اور پھر مفتی صاحب کے نزدیک ان شعائر اللہ کی تعظیم یوں ہے کہ ان کی قبروں پر پھول ڈالنا، چادریں چڑھانا اور چراغاں کرنا۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام نے کسی نیک کی قبر پر شاخیں نہیں رکھیں۔ حضرت زیدہ کا معاملہ ہی الگ ہے، بلکہ گناہ گار کی قبر پر رکھی تھیں۔ یہ عجیب شعائر اللہ اور ترالے ولی ہوتے کہ ہم پہلے ان کو گناہ گار تصور کریں اور پھر ان کی قبروں پر پھول وغیرہ چڑھائیں۔ (الغیاذ باللہ تعالیٰ)۔ اور کیا شعائر اللہ کی تعظیم چراغاں جیسے کام سے ہوگی، جس پر سردارِ دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! عجیب محکمہ افتار مفتی احمد یار خان صاحب کے ہاتھ آیا ہے اور پھر یہ سب کچھ ان کے نزدیک قرآن کریم کی مذکورہ آیت سے ثابت ہے معاذ اللہ تعالیٰ تم معاذ اللہ تعالیٰ۔ نہ تعظیم کا یہ پہلو اس آیت سے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو معلوم ہو سکا اور نہ حضرات صحابہ کرام کو۔ اگر معلوم ہوتا تو قبر پر چراغاں کرنے پر آپ لعنت نہ کرتے اور حضرت عمرو بن العاص وغیرہ اس کے خلاف وصیت نہ کرتے۔ مگر کیا کیا جائے، اہل بدعت کا باوا آدم ہی ترالا، ان کے نزدیک ہر ممنوع چیز مستحب اور کارِ ثواب ہے۔

نیا انکشاف مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ "حضور علیہ السلام کے زمانہ میں خود زندہ لوگوں کو پختہ مکان بنانے کی ممانعت تھی۔ ایک صحابی نے پختہ مکان بنایا تو حضور علیہ السلام ناراض ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کے سلام کا جواب نہ دیا۔ جب اس کو گرا دیا تب جواب سلام دیا۔" (دیکھو مشکوٰۃ، کتاب

اس کا ثبوت تو مفتی احمد یار خان صاحب کے ذمہ ہے کہ وہ کونسی حدیث ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں پختہ مکان بنانے کی ممانعت تھی؟ ذرا اُس حدیث کو نقل تو کیجئے اور اس کی سند اور اس کی تصحیح کا بھی ضرور خیال کیجئے۔ باقی جس روایت کا مفتی صاحب نے حوالہ دیا ہے کیا اچھا ہوتا ہے اس کو بلفظ نقل کر دیتے تاکہ عامۃ المسلمین کو معلوم ہو جاتا کہ حدیث کیا کہتی ہے اور مفتی صاحب کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابی کے لئے جواب سلام اس لئے ترک نہ کیا تھا کہ اُس نے مکان پختہ بنایا تھا، بلکہ اس لئے آپ نے اس کو سلام کا جواب نہ دیا تھا کہ اُس نے گنبد اور قبہ بنایا تھا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مزاج اور آپ کی طبیعت کو یہ اتنا ناگوار گزرا کہ آپ نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ حضرت اس روایت کرتے ہیں کہ:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج يوماً
ونحن معه فرأى قبة مشرفة فقال ما هذا۔
آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک دن باہر نکلے، اور ہم
بھی ساتھ تھے۔ آپ نے ایک اونچا گنبد اور قبہ دیکھا۔ فرمایا
(الحديث) ابوداؤد ج ۲، ۳۵۵۔ مشکوٰۃ ج ۲، ۲۲۱۔ یہ کیا ہے الخ

اسی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ جب اُس شخص نے وہ قبہ اور گنبد گرا دیا تو پھر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس سے راضی ہوئے۔ غور کیجئے کہ یہ روایت تو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے زندوں کیلئے بھی قبہ کی شکل کو پسند نہیں کیا، چہ جائیکہ مردوں کے لئے اس کو پسند کرتے۔ خصوصاً جبکہ آپ نے قبروں پر مطلق عمارت ہی کو پسند نہیں کیا۔ مگر آج نہ صرف قبروں پر عمارت کا جواز پیش کیا جاتا ہے بلکہ گنبد اور قبہ جیسی شکل پر زور دیا جاتا ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سرے سے پسند ہی نہیں فرمایا۔

پختہ قبریں بنانے کا ایک اور فائدہ | مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے وطن

میں دیکھا کہ دو قبرستان تھے۔ ایک میں کچھ قبریں پختہ تھیں اور دوسرا پختہ قبروں سے خالی تھا۔ فقیروں نے خفیہ طور پر وہ قبرستان فروخت کر دیا۔ مقدمہ چلا تو جس قبرستان میں پختہ قبریں نہ تھیں، حکام نے اس کو سفیدہ مانا اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے وہ نکل گیا۔ جس میں پختہ قبریں تھیں وہ حصہ مسلمانوں کے

پاس رہا (محصلاً) پھر آگے لکھتے ہیں کہ "اس سے مجھے پتہ لگا کہ اب ہندوستان میں کچھ قبریں پختہ ضرور بنوانی چاہئیں کیونکہ یہ بقار و قف کا ذریعہ ہیں جیسے مسجد کے لئے مینارے۔ (بلفظہ جار الحق ص ۲۷۶)۔

کیا خوب؟ سوال یہ ہے کہ وقف کو محفوظ رکھنے کے اس طریقہ کا پتہ حضرات صحابہ کرامؓ کو کیوں نہ لگا بلکہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بقار و قف کا یہ طریقہ کیوں معلوم نہ ہوا؟ اور آپ نے کیوں قبریں پختہ بنانے سے منع کیا؟ اور پھر حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ اور دیگر ائمہ اسلام کو یہ طریقہ کیوں نہ سوجھا۔ اور انہوں نے کیوں پختہ قبروں اور ان پر عمارتوں کو ڈھانے کی مہم شروع رکھی؟ مفتی صاحب کو تو اس سے پتہ لگا مگر ان کو نہ لگا کیوں؟ یہ نہ پوچھئے۔ باقی جس قبرستان میں پختہ قبریں نہ تھیں، اس کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جانا اس پر مبنی نہیں کہ وہاں قبریں پختہ نہ تھیں بلکہ اس میں ایک تو مسلمانوں کی غفلت اور بے پروائی شامل ہے۔ اور دوسری یہ بات ہے کہ قبروں پر فقیروں اور مجاوروں کا وجود نامسعود (جو سراسر اسلام کے خلاف ہے) اس کی علت ہے۔ اصل سبب اور علت کو سوچنے کی کوشش نہیں کی، اور غیر علت کو علت اور سبب بنانے کا مفتی احمد یار خان صاحب کو پتہ لگ گیا۔ سبحان اللہ تعالیٰ۔

قبروں پر مجاور بننا

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں "مجاور بننا تو جائز ہے۔ مجاور اسی کو تو کہتے ہیں جو کہ قبر کا انتظام رکھے۔ کھولے، بند کرنے کی چابی اپنے پاس رکھے وغیرہ وغیرہ، یہ صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ مسلمانوں کی والدہ حضور علیہ السلام کی قبر انور کی منتظمہ اور چابی والی تھیں جب صحابہ کرامؓ کو زیارت کرنی ہوتی تو ان سے ہی گھلوا کر زیارت کرتے (دیکھو مشکوٰۃ باب الدفن، بلفظہ جار الحق ص ۲۷۹) لیجئے ہم نے مشکوٰۃ شریف بھی دیکھی۔ اور مشکوٰۃ میں جہاں سے یہ روایت نقل کی ہے وہ اصل کتاب بھی دیکھ لی مگر مفتی صاحب کے اس غلط اور بے بنیاد دعویٰ کی دلیل وہاں نہ مل سکی۔ روایت ملاحظہ کریں۔

عن القاسم بن محمد قال دخلت علی حضرت قاسم بن محمد (بن ابی بکر) فرماتے ہیں کہ میں حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا فقلت یا امّہ اکشفی لی عن قبر
النّبی صلی اللہ علیہ وسلم و صاحبیہ
فکشفتم لی عن ثلاثہ قبور لا مشرفہ
وللا طئّیہ مطبوخہ بسطحاء العرصۃ
الحمراء۔ (رواہ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۲۱، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۲۱)

عائشہ کے پاس گیا اور میں نے کہا۔ اے میری اماں جان مجھے
آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے دو ساتھیوں
کی قبریں کھول کر دکھائیں تو انہوں نے تین قبریں کھول
کر مجھے بتائیں۔ نہ تو وہ قبریں اونچی تھیں اور نہ بالکل
زمین کے ساتھ پیوستہ عرصہ مقام کے سرخ رنگ کے سنگریزے

ان پر بچھائے ہوئے تھے۔

حضرت قاسم بن محمد تابعی اور حضرت عائشہ کے حقیقی بھتیجے ہیں اور بالکل نو عمر۔ انہوں نے اپنی پھوپھی
صاحبہ سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر (اپنے دادا کی) اور حضرت عمرؓ کی قبر دیکھنے کے
شوق کا اظہار کیا اور پھوپھی صاحبہ نے ان کو وہ تینوں قبریں دکھا دیں۔ اس میں نہ تو چابی کا کہیں ذکر
ہے اور نہ اس کا ذکر ہے کہ مستقل طور پر کھولنے اور بند کرنے کا انتظام حضرت عائشہ کے سپرد تھا، اور نہ
اس کا ذکر ہے کہ جب حضرات صحابہ کرام کو زیارت کرنی ہوتی تو ان سے گھلوا کر زیارت کرتے۔ حضرات
صحابہ کرام کو ان قبروں کی شناخت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ انہوں نے تو اپنے ہاتھوں سے ان بزرگوں کو
دفن کیا تھا۔ ہاں البتہ حضرات تابعین کو علی التبعین آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات شیخین
کی قبریں معلوم کرنے کا شوق تھا، اور ہر مسلمان کو ہونا چاہیے۔ اسی جذبہ کے تحت حضرت قاسم بن محمد نے
اپنی پھوپھی حضرت عائشہ کے ذریعہ یہ شوق پورا کیا، نہ یہ کہ حضرت عائشہ وہاں کی مجاور تھیں (العیاذ
باللہ تعالیٰ ثم العیاذ باللہ تعالیٰ)۔

نماز جنازہ کے بعد دعا

کسی مسلمان کی وفات کے بعد اس کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب اس کو جو بہترین تحفہ
بیج سکتے ہیں اور اس کے ساتھ جو حسن سلوک کر سکتے ہیں، وہ اس کے حق میں دعا کرتا ہے۔ انفرادی طور
پر جس وقت بھی کوئی چاہے اس کی وفات کے بعد تازلیت اس کے لئے دعا کرے۔ اس میں کوئی قیامت

اور خرابی نہیں ہے اور نصوص شرعیہ سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ لیکن بصورت اجتماع میت کے لئے دعا کرنے کا ثبوت صرف نماز جنازہ کی صورت میں اور قبر پر تلقین شرعی کی شکل میں ہے۔ اس کے علاوہ جہاں شریعت نے اجتماعی صورت میں دعا کا طریقہ نہیں بتلایا، وہ درست نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؓ اور اتباع تابعینؓ نے ایک دو نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں جنازے پڑھے اور پڑھائے مگر کسی سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے فوراً بعد اجتماعی رنگ میں دعا مانگی ہو۔ باقی میت کے لئے مطلق دعائے، مل کر اجتماعی شکل میں یا نماز جنازہ کے متصل بعد ثبوت کرنا، افسوس ناک مخالطہ یا قلت تدبیر کا حیرت ناک مظاہرہ ہے۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے کہ احکام عامہ سے امور خاصہ کا اثبات درست نہیں ہے بلکہ یہ ایک عیارانہ مخالطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء احناف کثر اللہ تعالیٰ سواد ہم نے نماز جنازہ کے بعد دعا کرنے سے منع کیا ہے اور اس کو مکروہ کہا ہے۔ چنانچہ امام ابو بکر بن حامد الحنفی (معاصر ابوالحنفہ الکبیر المتوفی ۲۶۲ھ) فرماتے ہیں کہ:

ان الدعا بعد صلوة الجنائزہ مکروہ (محیط باب الجنائزہ) نماز جنازہ کے بعد دعا مکروہ ہے۔

امام ابو بکر بن حامد کا حوالہ ہم نے قنیہ سے نقل نہیں کیا تا کہ مفتی احمد یار خان صاحب اپنے اعلیٰ حضرت کی تقلید کرتے ہوئے یہ نہ کہہ دیں کہ قنیہ غیر معتبر کتاب ہے، قنیہ والا بد مذہب اور معتزلی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ (دیکھئے جوار الحق ص ۲۶۸ محصلہ)۔ ملحوظ رہے کہ ہم نے یہ حوالہ محیط سے نقل کیا ہے جو فقہ حنفی کی معتبر اور مشہور کتاب ہے۔ محیط مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور (انڈیا) کے کتب خانہ میں موجود ہے (تذکرۃ تحلیل ص ۲۹۱) اور محیط کا یہ حوالہ امام ابو بکر بن حامد کا نام لئے بغیر دلیل الخیرات (مصنف حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب) میں بھی مذکور ہے اور دلیل الخیرات ص ۱۹ میں حضرت مولانا تحلیل احمد صاحب (المتوفی ۱۳۲۶ھ) نے اپنے تصدیقی بیان میں بحوالہ محیط امام ابو بکر بن حامد کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے جنہوں نے مدینہ منورہ سے محیط برہانی کی آٹھ جلدیں خرید کر مدرسہ کے کتب خانہ کو وقف کر دی تھیں۔ علاوہ بریں قنیہ اتنی غیر معتبر بھی نہیں ہے جتنی کہ اعلیٰ حضرت بریلوی نے سمجھ

رکھی ہے۔ قنویہ کا صرف وہ حوالہ غیر معتبر ہوگا جس کی تائید دوسرے حضرات، فقہاء سے نہ ہوتی ہو۔
 دیکھئے فوائد ہیہ ۲۱۳، ہفت روزہ رسالہ رضوان لاہور بابت ماہ ۲۱ مئی ۱۹۵۲ء ص ۵۳ میں ہے قنویہ وغیرہ معتبر کتابوں میں لکھا ہے۔ الخ
 امام شمس الامامہ حلوانی الحنفی (المتوفی ۱۰۸۴ھ) اور بخارا کے منسی قاضی شیخ الاسلام علامہ سعدی
 الحنفی (المتوفی ۱۰۸۴ھ) فرماتے ہیں کہ:

لا یقوم الرجل بالدعاء بعد صلوة الجنائزہ (قنویہ ص ۱۵۶)۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے کوئی آدمی نہ ٹھہرے۔
 امام طاہر بن احمد البخاری الحنفی (المتوفی ۱۰۸۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

لا یقوم بالدعاء فی قراءۃ القرآن لاجل المیت بعد صلوة الجنائزہ و قبلہا (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۲۵)۔ نماز جنازہ کے بعد اور اسی طرح اس سے قبل میت کیلئے
 قرآن پڑھ کر دعا نہ کی جائے۔
 علامہ سرخ الدین اودی الحنفی (المتوفی فی حدود ۱۰۸۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

اذا فرغ من الصلوة لا یقوم بالدعاء (فتاویٰ سراجیہ ص ۲۳)۔ جب نماز جنازہ سے فارغ ہو جائے تو دعا کیلئے نہ ٹھہرے۔
 امام حافظ الدین محمد بن شہاب کروری الحنفی (المتوفی ۱۰۸۲ھ) فرماتے ہیں کہ:

لا یقوم بالدعاء بعد صلوة الجنائزہ لانه دعا مرتہ۔ (فتاویٰ بزازیہ ج ۱ ص ۲۸۳)۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے نہ ٹھہرے کیونکہ اس نے
 ایک مرتبہ دعا کر لی ہے (یعنی نماز جنازہ کے اندر)۔

امام شمس الدین محمد خراسانی کوہستانی الحنفی (المتوفی ۱۰۸۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا یقوم داعیالہ (جامع الرموز ج ۱ ص ۱۲۵)۔ اور میت کے حق میں دعا کے لئے نہ ٹھہرے۔
 اور علامہ فہامہ ابو حنیفہ ثانی ابن نجیم الحنفی لکھتے ہیں کہ:

ولا یدعوا بعد التسلیم (مکررات ج ۲ ص ۱۸۳)۔ سلام پھیر لینے کے بعد دعا نہ کرے۔

اور مفتی محمد نصیر الدین الحنفی (المتوفی ۱۰۸۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

وبعد استادہ نماز برائے دعا (فتاویٰ برہنہ ص ۳)۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے نہ ٹھہرے۔

اور حضرت ملا علی نقاری لکھتے ہیں کہ:

ولا یدعوا للمیت بعد صلوة الجنائزہ لانه یشبہ نماز جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا نہ کرے کیونکہ یہ نماز

الزیادة فی صلوة الجنائز (مرقات ج ۲ ص ۲۱۹) جنازہ میں زیادتی کے مشابہ ہے۔

اور فقہ کی مشہور کتاب مجموعہ خانی میں ہے :

دعا بخواند و فتویٰ بریں قول است (مجموعہ خانی قلمی ص ۳۲۹) یعنی دعا نہ کرے اور فتویٰ اس قول پر ہے۔

اور فقہیہ سعد اللہ صاحب الحنفی (المتوفی ۱۲۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ :

خالی از کراہت نیست زیرا کہ اکثر فقہا بوجہ زیادہ یعنی یہ کراہت سے خالی نہیں ہے کیونکہ اکثر حضرات فقہار

بودن بر امر مسنون منع میکنند (فتاویٰ سعیدیہ ص ۱۳) کرام اس کو امر مسنون پر زائد ہونے کی وجہ سے منع کرتے ہیں۔

مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی لکھتے ہیں کہ :

”بعد نماز جنازہ کے دعا کرنا مکروہ ہے۔“ (نفع المفتی والسائل ص ۶)

اور علامہ برجندی الحنفی نے بھی دعا بعد نماز جنازہ کو مکروہ کہا ہے۔ (برجندی حاشیہ شرح وقایہ)

اس کے علاوہ بھی متعدد حضرات فقہار کرام نے نماز جنازہ کے بعد دعائے مانگنے کو منع کہا ہے مثلاً دیکھئے

مدخل ج ۳ ص ۲۲ لابن امیر الحاج، مظاہر حق ج ۲ ص ۵۷ لنواب قطب الدین خان صاحب وغیرہ۔

حضرات فقہار احناف کی یہ عبارتیں بھی ملاحظہ کیجئے اور مولوی محمد عمر صاحب کا فیصلہ بھی دیکھ لیجئے کہ :

”احناف نماز جنازہ کے بعد دعائے مانگنے میں، وہابی برا جانتے ہیں، دیوبندی بھی متکرر ہیں۔ اب

تم فیصلہ کرو کہ دعا کا انکار کرتے ہو، تم کون ہو؟ (بلفظ مقیاس الحنفیت ص ۵۲۹)

یہ فیصلہ مولوی محمد عمر صاحب کو خود کرنا چاہیے کہ وہ کون ہیں؟ حنفی یا غیر حنفی؟ ذرا مولوی صاحب

ہمت کر کے دوچار حضرات فقہار کرام کی عبارتیں تو نقل کر دیں جن سے ان کا مسلک ثابت ہوتا

ہے۔ دیدہ یا دیدہ۔

ربا امام فضلی کے لا باس بہت سے استدلال کرنا تو بے کار ہے۔ اولاً اس لئے کہ جمہور حضرات

فقہار احناف کے مقابلہ میں ان کی بات ہرگز حجت نہیں ہو سکتی۔ وثانیاً علامہ شامی (ج ۸ ص ۸۲) وغیرہ

نے اس کی تصریح کی ہے کہ لا باس بہ میں کراہت تنزیہی پائی جا سکتی ہے، اور لا باس بہ غیر مستحب

پر بھی اطلاق ہوتا ہے (ج ۱ ص ۸۸)۔ لہذا یہ بھی ان کو سو و مند نہیں ہے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

(المستوفی ۱۳۷۲ھ) لکھتے ہیں کہ اور چونکہ لفظ لا بآسن اکثر خلافِ اولیٰ میں مستعمل ہوتا ہے، اس لئے ایک صاف اور واضح تطبیق تو امام محمد بن الفضل اور امام ابو بکر بن حامد کے کلام میں یہ ہو سکتی ہے کہ اول الذکر مکروہ تشریحی اور نہ ترا از ذکر مکروہ تحریمی فرماتے ہیں اور ظاہر یہی ہے کیونکہ اکثر کتب فقہ و فتاویٰ میں اول اصل مذہب یہی بیان کیا ہے کہ دعائے کرے یا دعائے مکروہ ہے۔ اور کراہتِ مطابقت سے اکثری طور پر تحریمی ہے، مراد ہوتی ہے اور امام محمد بن الفضل سے اس کے خلاف جو قول نقل کیا اس کو لا بآسن سے تعبیر کیا جو اصل معنی کے لحاظ سے کراہت تشریحی یا کم از کم خلافِ اولیٰ میں مستعمل ہوتا ہے۔ (دلیل الخیرات فی ترک المنکرات ص ۶۹)

مولوی محمد عمر صاحب کا ایک اور کمال ملاحظہ ہو، وہ ایک عبارت کے مطلب کو نہ سمجھتے ہوئے یوں نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "جو دعائے رد کے وہ تمام زمانے سے زیادہ اہم ہے۔" (مقیاس ص ۵۳)

مولوی محمد عمر صاحب یہ فرماتے ہیں کہ جن حضرات فقہاء احناف کے حوالے ہم نے ذکر کئے ہیں وہ تو تمام اس دعا سے منع کرتے ہیں، کیا وہ بھی تمام زمانے سے زیادہ اہم ہیں؟ سوچ کر اور ہوش میں آکر جواب دینا۔ قارئین کرام! غور فرمائیے کہ اکابرین علماء احناف بجزانہ کے بعد کی دعا کو مکروہ بھی کہتے ہیں اور اس سے محض اس لئے منع کرتے ہیں کہ یہ امر مسنون پر زیادتی ہے۔ اگر خیر القرون میں یہ دعا ہوتی تو یہ اکابر ہرگز اس کو خلافِ مسنون اور مکروہ کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ مگر افسوس ہے کہ آج مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کی بدعت نواز پارٹی اس خلافِ مسنون اور مکروہ کام کو جائز اور مستحب سمجھتے ہیں، اور اس کے اثبات کے ورپے ہیں، اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے کو حنفی کہتے ہوئے حضرات فقہاء احناف کی صریح مخالفت کرتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ:

"و مکروہ راستحسن و انستن از اعظم جنایات است چه
حرام را مباح و کستن منجر بکفر است و مکروہ را حسن
پنداشتن یک مرتبہ ازاں پایاں است شلعت این فعل
را نیک ملاحظہ باید نمود۔ (مکتوبات حصہ پنجم ص ۶۷)

مکروہ کو اچھا سمجھنا بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ حرام کو
مباح سمجھنا کفر تک نوبت پہنچا دیتا ہے اور مکروہ
کو اچھا جاننا اس سے ایک مرتبہ فروتر ہے۔ اس
فعل کی قباحت کو اچھی طرح ملاحظہ کرنا چاہیے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عبارات پر فریق مخالف کی طرف سے جو اعتراضات (یا بزم خود جو جوابات) پیش کئے گئے ہیں، ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

اعتراض : مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ "اس اعتراض کے (کہ حضرات فقہاء کرام کی عبارات میں دُعا بعد الجنازہ کی ممانعت آئی ہے) دو جواب ہیں۔ ایک اجمالی دوسرا تفصیلی۔ اجمالی جواب تو یہ ہے کہ اس دُعا سے ممانعت کی تین وجہیں ہیں۔ اولاً یہ کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے ہو۔ دوم یہ کہ دعائیں زیادہ لمبی نہ ہوں جس سے کہ دفن میں بہت زیادہ تاخیر ہو، اسی لئے نماز جمعہ کے انتظار میں دفن میں تاخیر کرنا منع ہے۔ تیسرے یہ کہ اسی طرح صاف بستہ بہیئت نماز کی جاوے کہ دیکھنے والا سمجھے کہ نماز ہو رہی ہے کہ یہ زیادتی کے مشابہ ہے۔ لہذا اگر بعد سلام بیٹھ کر یا صفیں توڑ کر، تھوڑی دیر دعا کی جاوے تو بلا کراہت جائز ہے۔ یہ وجوہ اس لئے نکالے گئے ہیں کہ فقہاء کی عبارات میں آپس میں متعارض نہ ہوں اور یہ اقوال احادیث مذکورہ اور صحابہ کرام کے قول و عمل کے خلاف نہ ہوں تفصیلی جواب یہ ہے کہ عبارات میں سے جامع الرموز، ذخیرہ، محیط، کشف الغطاء کی عبارتوں میں تو دُعا سے ممانعت ہے ہی نہیں۔ بلکہ کھڑے ہو کر دُعا کرنے سے منع فرمایا ہے، وہ ہم بھی منع کرتے ہیں مرقات اور جامع الرموز میں یہ بھی ہے لانه يشبه الزيادة، یہ زیادتی کے مشابہ ہے۔ یعنی اس دعا سے دھوکا ہوتا ہے کہ نماز جنازہ زیادہ ہوگی الخ (بہار الحق ص ۲۶۸)"

جواب : یہ جملہ اعتراضات یا بزم خود جو جوابات مفتی احمد یار خان صاحب کی جہالت اور بے خبری کا نتیجہ ہیں اور کئی وجوہ سے یہ قابل التفات ہی نہیں ہیں :

اولاً اس لئے کہ اگرچہ حضرات فقہاء احناف اور شوافع کا اس میں اختلاف ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے قبل دعا کرنا درست ہے یا نہیں، حضرات احناف اس کے منکر اور حضرات شوافع اس کے قائل ہیں۔ مگر حضرات فقہاء کرام کی وہ عباراتیں جو ہم نے پیش کی ہیں (بلکہ وہ عباراتیں بھی جو مفتی احمد یار خان صاحب نے پیش کی ہیں بجز ایک عبارت کے) ان کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ چوتھی تکبیر کے بعد اور سلام سے پہلے کے متعلق حضرات فقہاء کرام یہ فرما رہے ہیں۔ وہ تو اس امر کی صراحت کرتے

ہیں کہ نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد دُعا نہ مانگی جائے۔ بعد صلوة الجنائزۃ - اذا فرغ من الصلوة کی قید لگاتے ہیں۔ اس سے بھلا سلام سے قبل کی دُعا کیسے مراد ہو سکتی ہے؟ اور ذکر اللق کی یہ عبارت تھی لا یدعوا بعد التسلیم، سلام پھیرنے کے بعد دُعا نہ کی جائے۔ الغرض حضرات فقہاء احناف کی ان عبارات کا مطلب یہ بیان کرنا کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے کے متعلق ہیں ان کی خالص تکریم ہے محض کچھ نہ کچھ لکھ دینے کا نام جواب نہیں ہوتا۔

و ثانیاً کسی مستند اور معتبر فقیہ سے یہ ثابت نہیں کہ ممانعت لمبی لمبی دعائیں نہ پڑھنے سے ہے، اور مختصر قسم کی دُعا جائز ہے۔ مفتی صاحب کی خود تراشیدہ منطق ہے۔ حضرات فقہاء کرام تو لا یدعوا وغیرہ جملہ سے بالکل اس کی نفی کرتے ہیں۔ جملہ فعلیہ نکرہ کے معنی میں ہوتا ہے اور نکرہ جب سیاق نفی میں آئے تو اس سے عموم ہی مراد ہوتی ہے، اِلَّا یہ کہ کوئی مخصوص دلیل ہو اور یہاں کوئی مخصوص دلیل موجود نہیں ہے۔ محض اختراعات سے تخصیص ہرگز نہیں ہو سکتی۔

و ثالثاً مفتی صاحب اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ لا یقوم بالدعاء کا یہ معنی ہے کہ صفت بستہ کھڑے ہو کر دُعا نہ کی جائے تاکہ دیکھنے والوں کو نماز کا شبہ نہ ہو، بلکہ صفوف کو ٹوٹ کر اور بیٹھ کر دُعا کی جائے جو جائز ہے۔ مگر اس پر غور نہیں کیا کہ یہاں صرف یقوم ہی نہیں بلکہ یقوم بالدعاء ہے۔ معنی یہ ہے کہ نماز جنازہ کے بعد وہ دُعا کو قائم نہ کرے اور دُعا کے لئے نہ ٹھہرے بالفاظ دیگر دُعا نہ مانگے۔ مفتی صاحب لغت کی کتابوں میں قام بامر کذا کے معنی دیکھ لیں کہ کیا ہوتے ہیں انکو سمجھ آجائے گی۔ خود انکے اعلیٰ حضرت نے بذل الجواز میں قیام کا معنی ٹھہرا بھی کیا ہے۔ تعجب ہے کہ بعض دیوبندی حضرات کو بھی یہاں مغالطہ ہوا ہے اور بعض نے اس سلسلہ میں راقم سے خط و کتابت بھی کی ہے انکی تسلی کے لئے ہم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کا حوالہ درج کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ "بعض فقہاء نے فرمایا کہ کھڑا رہ کر دُعا نہ کرے چونکہ نماز جنازہ کے بعد اسی حالت پر کھڑا رہنا اور دُعا کرنا خاص طور سے اجتماع و اہتمام کو ثابت کرتا ہے اس لئے اس طرح تعبیر فرمادیا۔ مطلب یہی ہے کہ اجتماع و اہتمام سے دُعا نہ کرے یعنی اگر کوئی ایک شخص نماز جنازہ کے بعد اتفاقی طور پر اپنی جگہ کھڑا رہا اور اس نے کوئی دعا اپنے دل میں میت کیلئے مانگ

لی۔ تو اگرچہ اُس نے کھڑے رہ کر یہ دُعا کی ہے مگر مکروہ نہیں ہوگی کیونکہ کراہت کی اصلی علت (اجتماع و اہتمام) موجود نہیں۔ اور نفس قیامِ عِلَّتِ کراہت نہیں۔ انتہی بلفظہ (دلیل الخیرات ص ۵۱ و ۵۲) اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ کراہت کی علت اجتماع و اہتمام ہے۔ اس لئے اگر صفیں توڑ کر یا بیٹھ کر اجتماعی صورت میں دُعا کی جائے تب بھی مکروہ اور ممنوع ہے۔

وَرَابِعًا اِذَا كَانَ يَتَوَضَّعُ بِالْفَرْضِ لَا يَقُومُ بِالْإِدْعَاءِ كَمَا يَطْلُبُ لِيَأْتِيَ بِمَا كُفِّرُ بِهِ دُعَاءَهُ كَمَا جَاءَ تَوْحِيهُ الرَّاغِبِ فِيهِ فِي عِبَارَاتِ كَمَا يَطْلُبُ هُوَ كَمَا لَا يَدْعُو بَعْدَ التَّسْلِيمِ (کہ سلام کے بعد دُعا نہ کرے) اس میں تو لا يقوم کا ذکر ہی نہیں۔ اور مجموعہ خانی کے یہ لفظ تھے "وَدُعَا نَحْوَانِدُ وَفَتْوَى بِرِسْ قَوْلِ اسْت"۔ ان میں تو مطلقاً دُعا کی نفی کی گئی ہے عام اس سے کہ کھڑے ہو کر کی جائے یا بیٹھ کر صرف بستہ ہو یا صفت توڑ کر۔ الغرض مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ ارشاد کہ دُعا سے ممانعت ہے ہی نہیں بلکہ کھڑے ہو کر دُعا سے منع فرمایا، سراسر باطل اور مردود ہے۔

وَخَامِسًا مَفْتِي صَاحِبِ كَمَا يَكُنَى كَمَا يَكُنَى فِي رُجُوعِ اس لِيَأْتِيَ بِمَا كُفِّرُ بِهِ دُعَاءَهُ كَمَا جَاءَ تَوْحِيهُ الرَّاغِبِ فِيهِ فِي عِبَارَاتِ كَمَا يَطْلُبُ هُوَ كَمَا لَا يَدْعُو بَعْدَ التَّسْلِيمِ (کہ سلام کے بعد دُعا نہ کرے) اس میں متعارض نہ ہوں اور یہ احادیث مذکورہ اور صحابہ کرام کے قول و عمل کے مخالف نہ ہوں ایک نعیالی اور ہوائی قلعہ ہے جس میں مفتی صاحب پناہ گزیں ہیں۔ حضرات فقہاء کرام کی عبارات میں جب متعارض ہی نہیں تو پھر بلاوجہ یہ وجوہ نکالنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور جب کسی صحیح حدیث سے اور کسی صحابی کے قول و عمل سے جتنا کہ بعد دُعا کا ثبوت ہی نہیں تو ان کی مخالفت کا کیا مطلب؟ یہاں تو مخالفت کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وَسَادِسًا مَفْتِي صَاحِبِ يَهَا تَوَكَّفَتْ هِيَ كَمَا كُفِّرُ بِهِ دُعَاءَهُ كَمَا جَاءَ تَوْحِيهُ الرَّاغِبِ فِيهِ فِي عِبَارَاتِ كَمَا يَطْلُبُ هُوَ كَمَا لَا يَدْعُو بَعْدَ التَّسْلِيمِ (کہ سلام کے بعد دُعا نہ کرے) اس میں متعارض نہ ہوں اور یہ احادیث مذکورہ اور صحابہ کرام کے قول و عمل کے مخالف نہ ہوں ایک نعیالی اور ہوائی قلعہ ہے جس میں مفتی صاحب پناہ گزیں ہیں۔ حضرات فقہاء کرام کی عبارات میں جب متعارض ہی نہیں تو پھر بلاوجہ یہ وجوہ نکالنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور جب کسی صحیح حدیث سے اور کسی صحابی کے قول و عمل سے جتنا کہ بعد دُعا کا ثبوت ہی نہیں تو ان کی مخالفت کا کیا مطلب؟ یہاں تو مخالفت کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کھڑے ہو کر دُعا کی اور فرمایا کہ میں نے حضور علیہ السلام کو ایسے ہی کرتے ہوئے دیکھا۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کھڑے ہو کر دُعا کی ہے تو مفتی صاحب کو اس سے منع کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟ یہ یاد رہے کہ مفتی صاحب اصل بات ہی نہیں سمجھے حضرت عبداللہ بن

ابنی اوفیٰ کی روایت سے، باوجود ضعیف ہونے کے کیونکہ اس کی سند میں ابراہیم، بصری نہایت ضعیف اور کمزور راوی ہے، جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ چوتھی تبکیر کے بعد سلام سے قبل انہوں نے دُعا مانگی، جس پر حضرات شوافع کا عمل ہے۔ امام بیہقی نے باب قائم کر کے یہ ثابت کیا ہے (سنن الکبریٰ ج ۱ ص ۱۲۱) اور ان کی یہ روایت مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۶ میں بھی موجود ہے۔ لیکن یہاں جو بحث ہے وہ یہ ہے، کہ نماز جنازہ سے فراغت کے بعد قبل از دفن دُعا مکروہ نہیں ہے اور مفتی صاحب اس کے اثبات سے قاصر ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی بدحواسی | مفتی صاحب نے جارا الحق ص ۲۶ میں جامع الرموز کا تین مرتبہ حوالہ دیا ہے۔ ان کے قائم کردہ نمبروں کے لحاظ سے عا و عک و عک، حالانکہ عا کی عبارت تو جامع الرموز ج ۱ ص ۱۲۵ کی ہے اور عک و عک کی عبارت ہی جامع الرموز کی نہیں ہے۔ خدا جانے انہوں نے کس رسالہ یا اخبار سے بدحواسی میں یہ نقل کر دیا ہے۔ کیا خوب تحقیق ہے۔ ٹائٹیل پر انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی اس کتاب میں — "عام مختلف فیہ مسائل کا نہایت محققانہ مدلل فیصلہ کر دیا گیا ہے" — سبحان اللہ تعالیٰ، یہ ہیں مفتی صاحب کی تحقیق انیق کے چند نمونے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کے دُعا بعد الجنازہ کے اثبات کے دلائل اور ان کے جوابات

مفتی صاحب لکھتے ہیں: مشکوٰۃ باب صلوة الجنازہ فصل ثانی میں ہے اذ اصلیت علی المیت فخلصوا له الدعاء (جب تم میت پر نماز پڑھ لو تو اس کے لئے خالص دُعا مانگو) ف سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے بعد فوراً دُعا کی جاوے بلا تاخیر۔ جو لوگ اس کے معنی کرتے ہیں کہ نماز میں اس کے لئے دُعا مانگو وہ ف کے معنی سے غفلت کرتے ہیں۔ صلیتہم شرط ہے ماضی اور ف اخلصوا ہے جزار۔ شرط اور جزا میں تغایر چاہیے نہ یہ کہ اُس میں داخل ہو۔ پھر صلیتہم ہے ماضی اور ف اخلصوا ہے امر۔ جس سے معلوم ہوا کہ دُعا کا حکم نماز پڑھ چکنے کے بعد ہے جیسے فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا میں کھا کر جانے کا حکم ہے نہ کہ کھانے کے درمیان، اور إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ میں نماز کے لئے اٹھنا مراد ہے نہ کہ نماز کا قیام حدیثاً کہ اِلَى سے معلوم ہوا، لہذا یہاں بھی وضو ارادۃ نماز کے بعد ہی ہوا، اور ف سے تاخیر ہی معلوم ہوتی ہے تحقیق معنی

کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں۔ (جاء الحق ص ۲۶۲)

جواب: مفتی صاحب نے حدیث کا جو یہ معنی کیا ہے کہ جب تم میت پر نماز پڑھ لو تو اس کے

لئے خالص دُعا مانگو، خرابی ہی سب اس میں ہے سخن شناس نہ دلبرِ خطا میں جا است۔

اولاً اس لئے کہ یہ معنی اس حدیث کے رُوح کے خلاف ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم تو یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ میت پر جب تم نماز جنازہ پڑھو تو اس میں نہایت اخلاص سے دعا کرو۔

یہ مطلب تو نہیں کہ نماز جنازہ تو بغیر اخلاص کے پڑھ لو اور اس کے بعد اخلاص سے دعا کرو۔ علاوہ ازیں المدونۃ الکبریٰ ص ۱۶۱

میں ہے: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: قال فی الصلوٰۃ علی المیت اخلصوا بالدعا۔ اس میں صراحت ہے کہ اخلاص

فی الدعاء نماز کے اندر مطلوب ہے۔ ثانیاً: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ اخلاص نماز

جنازہ کے اندر ہی ہونا چاہیے۔ آپ ایسے مخصوص دل اور وقت آمیز الفاظ سے جنازہ کی نماز پڑھایا کرتے تھے کہ زندہ صحابی یہ آرزو کیا

کرتے تھے کہ کاش یہ جنازہ ہمارا ہوتا۔ دیکھئے صحیح عوف بن مالک (وغیرہ) کی روایت مسلم ص ۳۱۱ افشکوة ص ۱۲۵ وغیرہ میں ہے اور

سنن الکبریٰ ص ۳۹ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے نماز جنازہ کا طریقہ بتایا جس میں یہ بھی فرمایا کہ درود شریف

پڑھنے کے بعد اخلاص کے ساتھ میت کے لئے دعا کرے۔ (ثم یسلم سراً فی نفسه) پھر آہستہ دل میں سلام کہے اس

صاف طور پر معلوم ہوا کہ یہ اخلاص فی الدعاء سلام پھیرنے سے پہلے ہے۔

ثالثاً اگر اس روایت کا یہی معنی ہوتا جو مفتی صاحب نے کیا ہے تو جنازہ کے بعد کی دعا کو حضرت

فقہاء کرام اور خصوصاً فقہاء احناف خلاف مسنون اور مکروہ کیوں کہتے ہیں؟ کیا حضرات فقہاء کرام

سے یہ جرات ہو سکتی ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل اور قول کو بھی خلاف سنت

اور مکروہ کہہ دیں؟

و سراً بعباً باوجودیکہ یہ حدیث حضرات فقہاء کرام کے پیش نظر ہے، مگر وہ پھر بھی جنازہ کے بعد دعا

کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر اس حدیث کا وہی مطلب ہوتا جو مفتی صاحب اور ان کی بدعت پسند

پارٹی نے گھڑا ہے تو حضرات فقہاء کرام کیوں لایدعوا اور دعا بخواند سے اس کو منع کرتے۔ وہی حضرت

ملا علیٰ آثارہ (وغیرہ) جب اس حدیث کی شرح کرتے ہیں تو ان کو مفتی صاحب کا یہی معنی سمجھ نہیں آتا،

اور جب اُس کے صرف ایک صفحہ بعد حضرت مالک بن ہیرہ کی حدیث کی شرح کرتے ہیں تو صاف لکھتے ہیں کہ "جنازہ کی نماز کے بعد میت کے لئے دُعا نہ مانگے کیونکہ یہ نماز جنازہ کے اندر زیادت کے مشابہ ہے" (مرقات ج ۲ ص ۱۹۱) الغرض کوئی اندرونی اور بیرونی قرینہ ایسا نہیں ہے جس کے تحت اس حدیث کا وہ مطلب صحیح ہو جو مفتی صاحب نے کیا ہے۔

رہا مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ شرط اور جزا میں تغایر ہونا چاہیے تو یہ مسلم ہے مگر یہ تغایر کبھی ذات اور ذات کا ہوتا ہے جیسے فَإِذَا أَطَعْتُمْ فَأَنْتَشِرُوا میں کھانا الگ ایک حقیقت ہے اور انتشار الگ اور کبھی یہ تغایر جزو و کل کا ہوتا ہے جیسے وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ مطلق قرآن کا پڑھنا کل ہے اور صرف اَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ کا پڑھنا جزو ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اَعُوذُ بِاللَّهِ اِنِ قرآن کریم کے بالکل معایر ہے۔ اسی طرح کبھی یہ تغایر اطلاق و تقيید کا ہوتا ہے جیسے إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ میں جملہ شرطیہ کے اندر جو سوال ہے وہ مطلق ہے۔ اور جملہ جزائیہ میں جو سوال ہے وہ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ کے ساتھ مقید ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جملہ شرطیہ میں جو سوال ہے وہ اُس سوال کے بالکل متغایر ہے جو جملہ جزائیہ میں ہے جیسا کہ کسی نبی اہل علم پر یہ مخفی نہیں ہے، اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ مطلق نماز جنازہ (جس میں شمار اور دُرود شریف وغیرہ کا پڑھنا اور با وضو ہو کر قبلہ رخ ہو کر قیام کرنا وغیرہ بھی کچھ ہے) کل ہے اور میت کے لئے دعا جزو ہے اور شرط و جزا کے لئے اتنا تغایر کافی ہے۔ اور اگر مفتی صاحب إِذَا قُمْتُمْ إِلَى السَّلْوَةِ (الایۃ) اور إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ (الایۃ) اور إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ (الایۃ) وغیرہ میں ارادہ وغیرہ مقدر تسلیم کرتے ہیں تو وہ فرمائیں کہ اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ (الحديث) میں اس ارادہ کے نکلنے سے کیا چیز مانع ہے؟ وجہ فرق بتین ہونی چاہیے۔ الغرض یہ مفتی صاحب کی صواب دید پر موقوف ہے کہ اگر وہ ان آیات میں کوئی مقدر نکالتے ہیں تو حدیث میں بھی تسلیم کر لیں یا جزو و کل وغیرہ کا تغایر مانتے ہیں تو وہ مان لیں۔ یہ ان کی مرضی ہے۔ باقی حرف اِلَى نماز کے قیام کے لئے بھی آیا ہے سینکڑوں حدیثیں اس پر پیش کی جاسکتی ہیں مگر خوف طوالت ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ فت سے تاخیر ہی مفہوم نہوتی،

حقیقی معنی کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں، تو ان کا یہ کہنا اصول سے بے خبری پر مبنی ہے۔
 اولاً اس لئے کہ جیسے تاخیر و تعقیب زمانی ہوتی ہے ایسے ہی مرتبہ بھی ہوتی ہے، اور جزا کے لئے
 یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ زمانہ کے لحاظ سے مشروط سے متاثر ہو، بلکہ بسا اوقات جزا مشروط کیلئے علت
 ہوتی ہے اور علت کا معلول پر مقدم ہونا ایک بین امر ہے۔ علماء اصول نے اس کی تصریح کی ہے کہ:
 اذا الجزاء قد تكون علة للشرط كان وجداً کبھی جزا شرط کے لئے علت ہوتی ہے جیسے کہ یہ مثال (ان
 النهار فالشمس طالعة۔ وجد النهار فالشمس طالعة) کہ اگر دن موجود ہے تو اس

(شرح تلویح ص ۲۲۱) نے کہ سورج نکل چکا ہے۔

ثانیاً اس لئے کہ میت کے لئے نماز جنازہ میں جو دعائے کی جاتی ہے تو وہ ثنار اور درود شریف
 کے بعد کی جاتی ہے اور اس میں جملہ جزائے کی جملہ شرطیہ سے زمانی تاخیر بھی متحقق ہے۔ اور علماء نے
 تصریح کی ہے :-

التراخی بزمان وان قلّ (باش تلویح ص ۲۲۱) کہ تراخی بہت قلیل زمانہ سے بھی متحقق ہو جاتی ہے۔
 ثالثاً اس میں حقیقی معنی کسی نے ترک ہی نہیں کیا تاکہ ان پر یہ الزام صحیح ہو کہ بلا قرینہ مجازی معنی
 مراد لینا جائز نہیں۔ علاوہ بریں اگر مفتی صاحب وغیرہ کے پاس ارادہ وغیرہ نکلنے کے لئے کوئی قرینہ
 اور منطق موجود ہے تو شاید کسی اور کے پاس بھی کوئی ایسا ہی حربہ موجود ہو کیونکہ ع

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سنو

رابعاً کیا مفتی صاحب لوگوں کو یہ فتویٰ دیا کرتے ہیں کہ وہ قرآن مجید پڑھ لینے کے بعد اعوذ
 باللہ اللہ پڑھا کریں۔ اذ اقرأت القرآن (الایة) میں بھی فت ہے جس سے بقول مفتی صاحب تاخیر ہی
 معلوم ہوتی۔ پھر حقیقی معنی کیوں چھوڑا جائے؟ اسی طرح اور بہت سی آیات میں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔
 غرضیکہ کوئی صحیح عقلی اور نقلی دلیل ایسی موجود نہیں ہے جس سے اذا صلیتم علی الہیت (الحديث)
 سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ نماز جنازہ کے بعد دعا ہونی چاہیے اور اس سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔

فرق مخالف کا استدلال اور اس کا حشر | مفتی احمد یار خان صاحب منتخب کنز العمال کے

حوالہ سے اور مولوی محمد عمر صاحب بہیقی اور فتح ربانی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی نے اپنی لڑکی کا جنازہ پڑھا اور چوتھی تکبیر کے بعد دعا کی، اور فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے (جار الحق ص ۲۱۳ اور مقیاس حنفیت ط ۵۲۲ محصلہ)

الجواب : اس روایت سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ اس کی سند میں ابراہیم بصری واقع ہے (دیکھئے جار الحق وغیرہ) اور حضرات محدثین کرام اس کی روایت کو نہایت ہی ضعیف سمجھتے ہیں۔ امام ابن معین کہتے ہیں۔ اس کی حدیث محض بیچ ہے۔ امام ابو زرہ کہتے ہیں، وہ ضعیف ہے۔ امام ابو حاتم اس کو ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث کہتے ہیں۔ امام بخاری اور امام نسائی اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں۔ امام ترمذی کہتے ہیں حدیث میں ضعیف ہے۔ امام ابو احمد الحاکم کہتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک وہ حدیث میں ضعیف ہے۔ علامہ ابن عدی کہتے ہیں، اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے۔ علامہ ابن سعد، امام سعدی اور امام حربی وغیرہ اس کو ضعیف کہتے ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۶۵) لہذا یہ روایت سرے سے قابل التفات ہی نہیں ہے۔

وثانیاً یہ دعا نماز جنازہ کے ختم ہونے کے بعد کی دعا نہیں ہے، جیسا کہ مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے لکھا ہے کہ — پھر نماز جنازہ ختم کرنے کے بعد آپ وہیں کھڑے رہے، اندازہ دو تکبیروں کے مابین کا دعا فرماتے رہے (مقیاس ص ۵۲۶) بلکہ یہ دعا چوتھی تکبیر اور سلام پھیرنے کے درمیان کی دعا ہے جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسا بھی کیا تھا اور حضرات شوافع کا اس پر عمل ہے۔ اور حضرات احناف چوتھی تکبیر کے بعد اور سلام سے قبل دعا کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ امام نووی لکھتے ہیں کہ :

وفی رواية كبار اربعاً فمكث ساعة حتى ظننت انه سيكبر خمساً ثم سلم عن يمينه وعن شماله الخ
 (رياض الصالحين ص ۳۶۹ و کتاب الاذکار ص ۱۲۵)

ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی نے چار تکبیریں کہیں اور ایک ساعت ٹھہرے رہے، حتیٰ کہ ہم نے یہ خیال کیا کہ وہ پانچویں تکبیر بھی کہیں گے، مگر پھر انہوں نے دائیں اور بائیں سلام پھیر دیا۔

حضرت امام بیہقیؒ اس روایت پر یوں باب قائم کرتے ہیں کہ :

باب ماروی فی الاستغفار للذیبت والدعاء له وہ باب جس میں اس کا ذکر ہوگا کہ میت کے لئے چوتھی تکبیر
ما بین التکیبیرۃ الرابعة والسلام (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۲۶۳) اور سلام کے درمیان دعا اور استغفار کرنا چاہیے۔

اس روایت سے نماز جنازہ سے فارغ ہو چکنے کے بعد کی دعا ثابت کرنا جہالت یا خیانت ہے۔
مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ بیہقی میں ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک جنازے پر نماز کے بعد دعا
مانگی (جبار الحق ص ۲۶۳)۔ مگر یہ بھی مفتی صاحب کی کوتاہ فہمی کا ایک کرشمہ ہے ورنہ بیہقیؒ کی روایت میں آتا
ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک جنازہ پڑھایا اور چند حضرات نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

فقالوا یا امیر المؤمنین لم نشهد الصلوة انہوں نے کہا، اے امیر المؤمنینؑ! ہم اس کے جنازے
علیہ فصلی بہم فکان امامہم قرظہ بن میں شریک نہیں ہو سکے تو انہوں نے ان کے ساتھ نماز
کعب۔ (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۲۶۳) ادا کی۔ ان کے امام قرظہ بن کعب تھے۔

اور دوسری روایت میں یہ آتا ہے کہ :

فجاء قرظہ بن کعب و اصحابہ بعد الدفن قامرہم ان یصلوا علیہ (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۲۶۳)
قرظہ بن کعب اور ان کے ساتھی دفن کے بعد آئے اور انہوں نے ان کو صلوٰۃ پڑھنے کا حکم دیا۔

اس روایت سے جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ دوبارہ جنازہ پڑھنا یا دفن کے بعد جنازہ پڑھنا ہے۔
اس مقام پر اس کا جھگڑا نہیں ہے۔ اس روایت سے دعا بعد الجنازہ کا اثبات بالکل بے بنیاد امر ہے
اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؑ
بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن رواحہؑ کا (غائبانہ) جنازہ پڑھا اور پھر دعا کی (محصلاً جبار الحق ص ۲۶۲)
بالکل بے اصل اور بے حقیقت بات ہے۔ حضرت اصحٰمہ نجاشیؑ کے بغیر غائبانہ جنازہ پڑھنا سرے سے ثابت
ہی نہیں۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو کسی صحیح اور متصل سند کے ساتھ پیش کر دے۔ دیدہ باید۔ جب اصل
نماز جنازہ ہی ثابت نہیں تو دعا بعد الجنازہ کا کیا مطلب؟ اسی طرح مبسوط کے حوالہ سے حضرت ابن
عمرؑ، حضرت ابن عباسؑ اور حضرت ابن سلامؑ سے یہ ثابت کرنا کہ ان حضرات نے دعا بعد نماز جنازہ

کی قلتِ فہم یا عدمِ تدبیر کا حیرت ناک مظاہرہ ہے دیکھئے مبسوط ص ۲۴۰ وغیرہ۔ رہا یہ قصہ کہ حضرت عبداللہ بن سلام ایک جنازہ پر نماز کے بعد پہنچے اور فرمایا کہ:

ان سبقتہونی بالصلوٰۃ علیہ
فلا تسبقونی بالدعاء۔
(مبسوط جلد ۲ ص ۲۴۰) ساتھ مل کر دُعا کر لو۔

تو اس سے استدلال بھی باطل ہے اس لئے کہ اس میں کوئی جملہ ایسا نہیں، جس کا یہ ترجمہ ہو کہ اُو میرے ساتھ مل کر دُعا کر لو۔ یہ مفتی صاحب کی ذاتی اور خانہ زاد اختراع ہے جو ہرگز قابل التفات نہیں ہے۔ یہ دُعا کب ہوئی؟ دفن سے قبل یا بعد؟ قبرستان میں یا مسجد یا گھر میں؟ اس روایت میں اس کی کوئی تعیین نہیں ہے۔ پھر اس کی بھی کوئی تعیین نہیں ہے کہ اس میں سبقتِ زمانی ہے یا کیفی اور کمی؟ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگرچہ میں نمازِ جنازہ میں شریک نہیں ہو سکا مگر میں کثرت سے ایسی پُرازِ اخلاص دُعا کرونگا کہ اس کی تلافی ہو جائے گی اور اس میں تم مجھ سے ہرگز سبقت نہیں لے جا سکتے۔

نوٹ : دفن کے بعد قبر کے سربانے اور اس کی پائنتی میں سورۃ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ

پڑھنا جائز ہے، اور صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح تسبیح و تہلیل اور ثبوت وغیرہ کی دُعا احادیث

سے ثابت ہے۔ یہ چیز محلِ نزاع سے بالکل خارج ہے۔ اسی طرح مطلق دُعا بھی منع نہیں، جب کسی کا

جی چاہے کرے۔ ہاں البتہ نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دُعا درست نہیں ہے، جیسا کہ باحوالہ عرض کیا گیا

ہے۔ اور مفتی احمد یار خان صاحب کشف الغطا کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ قائم نہ شود بعد از نماز برائے

دُعا (جا۔ الحق ص ۲۶۰)۔ رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا اس پر بزمِ عتلی دلائل پیش کرنا، تو بیکار ہے

اولاً اس لئے کہ دین کا ہر معاملہ عقل سے ثابت نہیں ہوتا۔ ابو داؤد ج ۱ ص ۱۰۰ میں حضرت علیؑ کی

مسح والی روایت ملاحظہ کیجئے۔ وثانیاً عقل سے بھی ہر عقل مراد نہیں ہوتی۔ ہمارے عقل کیا اور ہم

کیا؟ کیا پیدی اور کیا پیدی کا شوربہ۔ وثالثاً، الدعاء مع العبادۃ وغیرہ روایات سے دُعا بعد

الجنازہ ثابت کرنا، اپنی رائے کو شریعت میں دخل دینا ہے۔ گذر چکا ہے کہ امورِ عامہ سے احکامِ خاصہ

کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ ورابعاً اگر واقعی ان روایات سے یہ دُعا ثابت ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ وغیرہم سے اس کا ثبوت ہوتا، اور حضرات فقہاء احنافؒ اس کو مکروہ نہ کہتے۔

جنازہ کے ساتھ ساتھ ذکر کرنا اور قرآن کریم وغیرہ پڑھنا | حدیث شریف اور فقہ حنفی کے پیش نظر اس کی گنجائش معلوم نہیں ہوئی کہ جنازہ کے ساتھ اجتماعی طور پر ذکر کیا جائے اور خاص طور پر جہر کے ساتھ۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ بحوالہ طبرانی حضرت زبیر بن ارقم (المتوفی ۶۶ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

ان الله يحب الصمت عند ثلاث
عند تلاوة القرآن وعند الزحف،
وعند الجنازة۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱۹)

اللہ تعالیٰ تین موقعوں پر خاموشی کو پسند کرتا ہے
قرآن کریم کی تلاوت کے وقت، میدان جنگ میں
اور جنازہ کے ساتھ۔

حضرت امام محمدؒ اور علامہ ابن نجیمؒ، حضرت قیس بن عباد (المتوفی ۸۵ھ) سے روایت نقل کرتے ہیں کہ:

قال كان اصحاب رسول الله صلى الله
عليه وسلم يكرهون الصوت عند ثلاث
الجنازة، والقتال والذكر۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات صحابہؓ
کرامؓ تین مواقع پر آواز بلند کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔
جنازہ کے ساتھ، لڑائی میں اور ذکر کے وقت۔

والسير الكبير للامام محمد مع شرح السرخسي ج ۱ ص ۸۹ و بجر الرائق ج ۶ و راجع مصنف ابن ابی شیبہ ج ۵ ص ۵۳ و ج ۶ ص ۴۶۲ و ج ۱۲ ص ۱۰۶

بلکہ حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود تین مقامات پر آواز بلند کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ قرأت قرآن، جنازہ اور لڑائی کے وقت۔ (السير الكبير ج ۱ ص ۸۹)

یہ روایتیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنے کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ مکروہ سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ بھی اس وقت خاموشی کو پسند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء احنافؒ نے یہ مسئلہ یوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے

کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنا، قرآن کریم پڑھنا اور اسی طرح کلّٰ حی یموت (کہ ہر زندہ مرنے والا ہے) وغیرہ پڑھنا مکروہ اور بدعت ہے، اور کراہت بھی اس میں تنزیہی نہیں بلکہ تحریمی ہے چنانچہ عالمگیری میں ہے :

وعلیٰ متبعی الجنازة الصمت و یکرہ
لہم رفع الصوت بالذکر و قراة القرآن -
(کذا فی شرح الطحاوی و عالمگیری مصری ج ۱ ص ۱۷۱)

کہ جو لوگ جنازہ کے ساتھ جانے والے ہوں ان پر لازم ہے کہ وہ خاموش رہیں، اور ان کے لئے بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن پڑھنا مکروہ ہے۔

امام سراج الدین اودمی لکھتے ہیں :
رفع الصوت بالذکر و قراة القرآن و قولہم
کلّٰ حی یموت و نحو ذلک خلف الجنازة بدعتہ
(سراجیہ ص ۱۷۱ طبع نول کشور)

کہ جنازہ کے پیچھے بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن کریم پڑھنا اور یہ کہنا کہ ہر زندہ مرنے والا ہے، بدعت ہے۔

اور اسی کے قریب قریب عبارت ہے در مختار کی (دیکھئے کتاب الجنائز)
اور علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں کہ :

وینبغی لمن تبع الجنازة ان یطیل الصمت
و یکرہ رفع الصوت بالذکر و قراة القرآن
و غیر ہما فی الجنازة و الکراہة فیہا
کراہة تحریم - البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۹ مصری

اور مناسب ہے کہ جو لوگ جنازہ کے ساتھ جائیں وہ طویل خاموشی اختیار کریں اور بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن کریم پڑھنا، اور اسی طرح کچھ اور پڑھنا مکروہ ہے، اور کراہت بھی اس میں تحریمی ہے۔

یہ تمام عبارتیں ذمہ دار حضرات فقہاء احناف کی ہیں جو اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہیں کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنا، قرآن کریم پڑھنا، کلّٰ حی یموت پڑھنا اور اسی طرح کچھ اور پڑھنا بدعت اور مکروہ تحریمی ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی سینہ زوری ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں کہ "میں فقہار نے میت کے ساتھ ذکر بالجہر کو مکروہ فرمایا، اُن کی مراد مکروہ تنزیہی ہے۔" (جہاد الحق ص ۳۹۱)

ہاں اگر کوئی شخص اپنے دل میں آہستہ ذکر کرے تو اس کیلئے گنجائش ہے چنانچہ امام قاضی خان لکھتے ہیں:

ویکرہ رفع الصوت بالذکر فان اراد اور مکروہ ہے کہ (جنازہ کے ساتھ) بلند آواز سے ذکر ان یدکر اللہ یدکر فی نفسہ۔ کیا جائے۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنے دل میں ذکر کرنے کا ارادہ

(قاضی خان ج ۱ ص ۹ طبع نو لکھنؤ) رکھتا ہو تو وہ آہستہ دل میں ذکر کر سکتا ہے۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور حضرات فقہاء احنافؒ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر

کرنے کو مکروہ (تحرمی) اور بدعت کہتے ہوئے اس سے منع کرتے ہیں۔ مگر مولوی محمد عمر صاحب بنعم خوش کئی آیات سے یہ ثابت کرتے ہیں اور پھر یوں گوہر افشانی فرماتے ہیں:

”جنازہ کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھنا“ اور پھر جامع الصغیر سیوطیؒ، کنوز الحقائق مناویؒ، اور کنز العمال سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قول لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ جنازہ میں زیادہ پڑھا کرو۔ اور دوسری روایت یوں نقل کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے موتی کے لئے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا سامان تیار کرو۔ تو ان مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہوا کہ جنازہ کے ساتھ کلمے کا ذکر ثواب ہے اور میت کو مفید ہے۔ اور اس زمانہ میں ذکر جہری بالمیت کرنا اہل سنت کیلئے ضروری ہے کیونکہ مسلمانوں کو وہابی اور حنفی کے جنازے کا علم ہو جائے۔ (مقیاس الحنفیت ص ۵۸۴)

سبحان اللہ تعالیٰ! یہ ہیں مولوی محمد عمر صاحب کے جنازہ کے ساتھ ذکر کرنے کے اثبات کے دلائل، کہ قرآن کریم میں جہاں بھی ذکر کا تذکرہ اور اس کی فضیلت آئی ہے اس سے جنازہ کے ساتھ ذکر کرنا بھی ثابت ہو گیا۔

پہلے یہ باحوالہ درج کر دیا گیا ہے کہ احکام عامہ سے امور خاصہ کا اثبات درست نہیں ہوتا۔ یہی قرآن کریم کی آیات جن سے مولوی محمد عمر صاحب کے نزدیک جنازہ کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھنا ثابت ہوتا ہے، حضرات صحابہ کرامؓ اور حضرات فقہاء احنافؒ کے سامنے بھی تھیں مگر ان کو یہ مبارک اجتہاد نہ سوجھا۔ یہ مولوی محمد عمر صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ ان کو قرآن کی ایک آیت ہی سے نہیں بلکہ کئی آیات سے مسئلہ معلوم ہو گیا۔ باقی جو حدیث پیش کی ہے اس سے استدلال بھی تا کافی ہے اسلئے

کہ جھگڑا اس میں ہے کہ جو آدمی خلف الجنازہ یا متبعی الجنازہ (کہ جنازہ کے پیچھے جا رہے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ چل رہے ہوں) کی فہرست میں شامل ہو، اس کے لئے جہر سے ذکر کرنا یا قرآن کریم وغیرہ پڑھنا کیسا ہے؟ ہم نے حضرات فقہاء کرام کی عبارتیں بتلائی ہیں، وہ اپنے مفہوم میں نص صریح ہیں اور مولوی محمد عمر صاحب کی پیش کردہ یہ روایتیں خلف الجنازہ یا متبعی الجنازہ کے مفہوم کے بیان سے قاصر ہیں۔ ان روایات کا صحیح مطلب ہے کہ وفات کے وقت ان کو **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کی تلقین کروجیسا کہ سنت سے ثابت ہے۔ اور مسلمانوں میں تلقین شہادتین کا مسئلہ معمول بہا ہے اور اس کا بھی قوی احتمال ہے کہ جنازہ پڑھتے وقت بطور **عَالَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کثرت سے پڑھا کر دینا اور یہ افضل الذکر ہے۔ اور فی الجنازہ کے لفظ، جس کا ترجمہ مولوی محمد عمر صاحب نے کیا ہے: "جنازہ میں زیادہ پڑھا کر" اسکے مؤید ہیں مولوی شاہ محمد کن دین الوری بریلوی لکھتے ہیں: سوال: جو لوگ جنازہ کے ہمراہ ہوں ان کو کلمہ طیبہ راستہ میں پڑھنا کیسا؟ جواب: پکار کر پڑھنا تو مکروہ ہے دل میں اگر پڑھیں تو مضائقہ نہیں۔ بہتر خاموشی ہے۔ دعا گیری، رکنین مکتبہ

مولوی محمد عمر صاحب کی انوکھی دلیل | مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ وہابی — فقہاء نے ذکر بالجہر فی الجنازہ مکروہ لکھا ہے (محمد عمر)۔ مکر الرائق ج ۲ ص ۲۰۱ میں مذکور ہے کہ ولا یأمن بمرثیۃ المیت شعراً۔ میت کا شعروں میں مرثیہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ تم اپنے جنازہ کے ساتھ فقہاء کی اتباع میں مرثیہ خوانی کر لیا کرو، ہم ذکر کلمہ کر لیا کریں گے۔ (مقیاس حقیقت ص ۵۸۵)

جواب: مولوی محمد عمر صاحب کا تقریر و تحریر میں یہی وطیرہ ہے کہ وہ خاموش نہیں ہا کرتے۔ ان کے نزدیک کچھ نہ کچھ کہہ دینا یا لکھ دینا ہی جواب تصور ہوتا ہے عام اس سے کہ وہ حقیقت اور نفس الامر میں جواب ہو یا نہ ہو۔ صاحب مکر الرائق تو یہ فرماتے ہیں کہ شعروں کے اندر میت کا مرثیہ پڑھنا جائز ہے یعنی مردہ کے دنیا سے پہلے جانے پر افسوس اور صدمہ کا ذکر اور مردہ کے کمالات اور خوبیوں کا تذکرہ درست ہے۔ یہ انہوں نے کب اور کہاں کہا ہے کہ جنازہ کے ساتھ ساتھ مرثیہ پڑھا کر اور جھگڑا تو جنازہ کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا ہے اور یہ حوالہ اس کا ہرگز جواب نہیں ہے۔ یہ ہے مولوی محمد عمر صاحب کا طرز استدلال اور اس کا پس منظر۔

منفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں۔ ابن عدی نے کامل میں اور امام زلیعی نے نصب الرایہ تخریج

احادیث الہدایہ جلد دوم ص ۲۹۲ مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل میں لکھا ہے عن ابن عمر قال لم یکن یسمع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو دیشی خلف الجنانۃ الا قول لا الہ الا اللہ مبدیاً وراجعاً اگر یہ حدیث ضعیف بھی ہو پھر بھی فضائل اعمال میں معتبر ہے۔ انتہی (جبار الحق ص ۳۸۶)

جواب : مفتی صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ ضعیف حدیث فضائل اعمال میں معتبر ہے۔ اس کی تحقیق اپنے مقام پر آئے گی (انشار اللہ تعالیٰ) کہ فضائل اعمال میں کیسی ضعیف حدیث معتبر ہوتی ہے؟ لیکن یہ تو ضعیف بھی نہیں۔ اس میں خیر سے ایک راوی ہے جس کا نام ابراہیم بن ابی حمید ہے۔ امام ابو نعیمؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں۔ کان یضع الحدیث (لسان المیزان ج ۱ ص ۲۸) کہ وہ جعلی حدیثیں بتایا کرتا تھا۔ افسوس ہے کہ موضوع اور جعلی حدیثوں سے بھی مفتی احمد یار خان صاحب فضائل اعمال ثابت کرتے ہیں۔ رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا امام شعرانیؒ، شیخ عبد العزیز نابلسی اور شیخ عثمان بحیرمی وغیرہ سے جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کے حوالجات نقل کرنا، تو اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ صوفیوں کا گروہ ہے اور حیل و حرمت میں ان کی بات ہرگز حجت نہیں ہوتی (میدان فتویٰ میں حضرات فقہاء کرام کی بات معتبر ہوتی ہے نہ کہ حضرات صوفیاء کی) اس کا مختصر جواب مفتی صاحب کی زبانی سن لیجئے، وہ لکھتے ہیں: ابن حجر شافعی ہیں تو احناف کے مقابل شوافع کے فتوے پر عمل ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ (بلفظہ جبار الحق ص ۳۲ و مثلہ فی ص ۳)۔ ہم بھی کہہ دیں گے کہ حضرات احناف کے مقابل حضرت امام شعرانیؒ وغیرہ شوافع کی بات پر ہرگز عمل نہ ہوگا، کیونکہ حضرات فقہاء احناف کی صریح عبارات سے اس کی ممانعت ثابت ہے، جیسا کہ باحوالہ یہ بات بیان کر دی گئی ہے۔

قبر پر اذان

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد میت کو قبر میں دفن کیا جائے اور بسم اللہ علی سنتہ رسول اللہ وغیرہ پڑھا جائے، اور دفن کے بعد

سورہ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھنا بھی احادیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں سورہ فاتحہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذ کی قبر پر سبحان اللہ اور الحمد للہ وغیرہ خود بھی پڑھا اور حضرات صحابہ کرامؓ کو اس کی تلقین بھی کی۔ اسی طرح استغفار اور تثبیت کا سوال بھی کیا۔ یہ سب امور صحیح اور ثابت ہیں۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ قبر پر کھڑے ہو کر آپ نے دعا بھی کی ہے اور اس کا حکم بھی فرمایا ہے۔ لیکن قبر پر اذان کا ثبوت نہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین اور تبع تابعین سے۔ اس وقت قبریں بھی ہوتی تھیں، مڑے دفن بھی کئے جاتے تھے اور اذان بھی تھی اور اذان دینے والے بھی ہوتے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس وقت تو اذان علی القبر سنت اور جائز نہ ہوتی، اور کئی صدیاں گزرنے کے بعد یہ جائز ہو گئی، اور اس کے جواز پر رسالے بھی لکھے جانے لگے۔

اذان ایک خاص عبادت ہے اور اس کے لئے شریعت مقدسہ میں مخصوص مواقع مقرر کئے گئے ہیں۔ ان سے تجاوز کرنا حدود اللہ سے تعدی اور معصیت ہے۔ اگر ایسی قسمیں جائز ہوتیں تو عیدین کی نماز کے لئے بھی اذان و اقامت درست ہوتی اور اس کے لئے اذان علی القبر سے بہت زیادہ اور بہت اچھے وجوہ بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن یاس ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس بارہ میں تمام حضرات فقہاء کرام متفق ہیں۔ چنانچہ امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

ومن ذلك الاذان والاقامة في العیدین قد نقل ابن عبد البر اتفاق العلماء علی ان لا اذان ولا اقامة فیہا۔ (الاعتصام ج ۲ ص ۶۱)

اور اسی قبیل سے اذان و اقامت عیدین میں امام ابن عبد البر نے تمام حضرات فقہاء کا اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ عیدین میں نہ اذان ہے نہ اقامت۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء احناف قبر پر خلاف سنت امور کا سختی کے ساتھ انکار کرتے ہیں چنانچہ امام ابن ہمام الحنفیؒ اپنی بے نظیر تالیف میں لکھتے ہیں کہ:

ویکروا عند القبر کل ما لم یعد من السنۃ والمعہود منہا لیس الا زیارتہا والدعاء نہ ہو، اور ثابت من السنۃ صرف قبروں کی زیارت ہے اور

عندھا قاتھا کما کان یفعل صلی اللہ علیہ
وسلم فی الخروج الی بقیع ویقول السلام
علیکم دار قوم مؤمنین وانا انشاء اللہ بکم
لاحقون اسأل اللہ لی ولکم العافیة۔

(فتح القدیر ج ۲ ص ۲۲۷ طبع مصر)

لئے اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرتا ہوں۔

اور اسی طرح کی عبارت بحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۲ اور در المختار ج ۱ ص ۱۶۶ اور فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱۷۱ وغیرہ
میں بھی ہے۔ اس سے بھی صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اذانِ قبر بلکہ اس قسم کے وہ جملہ مراسم جو سنت
سے ثابت نہیں، قبر کے پاس مکروہ ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں :

وفی الاقتصار علی ما ذکر من الوارد اشارۃ الی
انہ لا یسنّ الاذان عند ادخال المیت فی قبرہ
کما ہو معتاد الان وقد صرح ابن حجر فی
فتاواہ بانہ بدعة۔ (شامی ج ۱ ص ۶۵۹)

اور در البحار میں ہے :

من البدع التي شاعت في الهند الاذان علی
القبر بعد الدفن۔

ان بدعات میں سے جو (بعض) بلاد ہند میں شائع ہو گئی
ہیں ایک دفن کے بعد قبر پر اذان دینا بھی ہے۔

اور توشیح شرح تنقیح لمحمود البلیخی میں اس اذان کے متعلق لکھا ہے :

یہ اذان کوئی چیز نہیں۔

لیس بشیئ۔

یہ تمام عبارتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ دفن کے بعد قبر پر اذان دینے کا شریعتِ مطہرہ میں کسی
سے کوئی ثبوت ہی نہیں۔ یہ خلافِ سنت بھی ہے اور بدعت بھی۔ حضرات فقہاء کرام کے احکام کے خلاف
بھی ہے اور لیس بشیئ بھی۔ ایک منصف آدمی کے لئے یہ حوالجات بالکل کافی ہیں۔ البتہ متنت کیلئے

کوئی چیز بھی سوو مند نہیں ہوتی۔ فریق مخالف کی طرف سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ بھی سن لیجئے اور ساتھ ساتھ جوابات بھی دیکھ لیجئے تاکہ حق و باطل میں بخوبی فرق معلوم ہو سکے۔

پہلا اعتراض : مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں : (ان عبارات میں جو دُعا کا ذکر کیا گیا ہے) کہ اذان خود دُعا بلکہ بہترین دُعا سے ہے کہ وہ ذکرِ الہی ہے اور ہر ذکرِ الہی دُعا، تو وہ بھی سنتِ ثابتہ کی ایک فرد ہوتی۔ (ایران الابرص ۸)

جواب : خان صاحب کا یہ ارشاد ایک مجذبانہ مغالطہ ہے اور کسی وجہ سے باطل ہے۔ اولاً اس لئے کہ اگرچہ بعض اعتبارات سے ذکر اور دُعا ایک ہی ہے لیکن عرف میں یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دُعا میں طلب اور سوال پیدا ہوتا ہے اور ذکر اس سے خالی ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ شاطبی لکھتے ہیں :

هو في العرف غير الدعاء (الاختصاص ج ۲ ص ۲۸) ذکر عرف میں دُعا کے علاوہ ہے۔

اور فتح القدر کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنت البقیع والوں کے لئے جو دُعا کی تھی اس میں عافیت کا سوال تھا اور یہی سنت سے ثابت ہے۔

وثانیاً خود خان صاحب اذان کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ تو خالص ذکر بھی نہیں (فتاویٰ رضویہ، جلد دوم ص ۵۰۲) تو پھر یہ کیسے صحیح ہوگا کہ اذان ذکرِ الہی ہے اور ہر ذکرِ الہی دُعا ہے ؟

وثالثاً اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اذان دُعا ہے تو سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین وغیرہ کو یہ بات کیوں سمجھ نہ آئی کہ اذان دُعا ہے، اور قبر پر یہ بھی ہونی چاہئے۔ جب یہ طریقہ ان کو سمجھ نہ آسکا اور حضرات ائمہ مجتہدین نے بھی اس کو نہ سمجھا، تو کسی دوسرے کی سمجھ کیسے حجت ہو سکتی ہے۔

سر خدا کہ عارف و زاہد کسے نگفت در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید
دوسرا اعتراض : مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ بحر الرائق کا یہ فرمانا کہ قبر پر جا کر بجز زیارت و دُعا اور کچھ کرنا مکروہ ہے، بالکل درست ہے۔ وہ زیارتِ قبور کے وقت فرماتے ہیں یعنی جب

وہاں زیارت کی نیت سے جاوے تو قبر کو چومنا یا سجدہ کرنا وغیرہ ناجائز کام نہ کرے اور یہاں گفتگو ہے ودفن کے وقت کی، یہ زیارت کا وقت نہیں۔ اگر وقت دفن بھی اس میں شامل ہے پھر لازم ہوگا کہ میت کو قبر میں اتارنا، تختہ دینا، مٹی ڈالنا اور بعد دفن تلقین کرنا، جس کو فتاویٰ رشیدیہ میں بھی جائز کہا ہے، سب منع ہوا الخ (جاء الحق ص ۳۱ و ص ۳۲ بلفظہ)

جواب : یہ ہے مفتی احمد یار خان صاحب بدایونی ثم گجراتی کا جواب۔ مگر بات یہ ہے کہ صاحب بحر الرائق وغیرہ نے تو ویکرہ عند القبر کہا ہے یکرہ فی القبر نہیں کہا۔ میت کو قبر میں اتارنا فی القبر ہے عند القبر نہیں ہے۔ اسی طرح تختہ دینا اور مٹی ڈالنا فی القبر اور علی القبر ہے عند القبر نہیں۔ ہاں البتہ دفن کے بعد تلقین کرنا عند القبر ہے مگر وہ تو والدعا عندہا قائمہ کی مد میں ہے جو سنت سے ثابت ہے۔ اور زیارت و دعا و دفن سے قبل خالی قبر کی کوئی نہیں کرتا۔ مگر یہ یاد رہے کہ تلقین سے سورہ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھنا مراد ہے۔ جس کا ثبوت حضرت ابن عمرؓ کی

مرفوع حدیث سے ہے۔ (مشکوٰۃ ص ۱۲۹) اگر یہ موقوف بھی ہو تب بھی حکم مرفوع ہے ایسے البحر الرائق وغیرہ کے الفاظ ہی اس کو متعین کر دیتے ہیں کہ دفن کے بعد دعا اور زیارت کے علاوہ قبر کے پاس اور جو کچھ بھی کیا جائیگا وہ خلاف سنت ہوگا، سجدہ ہو یا طواف، استسجاد ہو یا اذان وغیرہ، اور یہی حکم کہہ چاہتے ہیں۔

تیسرا اعتراض : (علامہ شامی نے امام ابن حجر کے حوالہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ قبر کے پاس اذان بدعت ہے) اولاً تو ابن حجر شافعی مذہب ہیں۔ بہت سے علماء جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں فرماتے ہیں کہ اذان قبر سنت ہے اور امام ابن حجر شافعی اس کی تردید کرتے ہیں تو بتاؤ کہ حنفیوں کو مسئلہ جمہور پر عمل کرنا ہوگا کہ قول شافعی پر؟ دوم امام ابن حجر نے بھی اذان قبر کو منع نہ کیا بلکہ اس کے سنت ہونے کا انکار کیا یعنی یہ سنت نہیں۔ (بلفظہ ج ۱، الحق ص ۳۱)

جواب : مفتی صاحب نے یہ جو کچھ لکھا ہے نرمی و دفع الوقتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ ان کا ضمیر بھی ان کو ملامت کرتا ہوگا۔ اولاً اس لئے کہ یہی امام ابن حجر (اور امام سیوطی) جو شافعی ہیں مگر مسئلہ میلاد وغیرہ مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کی بدعت پسند پارٹی ان ہی سے ثابت کرتی ہے۔

اور اُس وقت اُن کی شافعییت پیش نظر نہیں ہوتی۔ وہاں تو ان کی تعریفیں کرتے کرتے قلم کند اور زبانیں خشک ہو جاتی ہیں اور یہاں اس طرح جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے "تو بتاؤ کہ حنفیوں کو مسئلہ جمہور پر عمل کرنا ہوگا کہ قول شافعی پر؟"۔

و ثانیاً امام ابن حجر نے صرف اس کی سنیت ہی کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کو بدعت بھی کہا ہے۔ چنانچہ خود مفتی احمد یار خان صاحب بحوالہ شامی یہ حوالہ اس طرح نقل کرتے ہیں (ترجمہ بھی مفتی صاحب کا ہے)۔
وقد صرح ابن حجر بانہ بدعة وقال اور ابن حجر نے صریح فرمادی کہ یہ بدعت ہے اور جو کئی من ظن انه سنۃ قلم یصب۔ اس کو سنت جانے وہ درست نہیں کہتا (جبار الحق، ص ۳۲۱)

اس سے قبل علامہ شامی کی عبارت یوں ہے کہ :

لا یسن الاذان عند ادخال المیت فی قبوہ میت کو قبر میں داخل کرتے وقت جیسا کہ اباء بت
کہا ہوا المعتاد الان الخ (شامی ج ۱ ص ۸۳) بنالی گئی ہے اذان کہنا سنت نہیں ہے۔

امام ابن حجر کی تصریح کے بعد کہ یہ بدعت ہے، یہ کہہ دینا کہ انہوں نے منع نہیں کیا کتنی حیرتناک بات ہے مگر مفتی صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ بدعت کے ذریعہ ہی سے تو ہماری گاڑی چلتی ہے ہم اس کو منع نہیں کہتے۔ یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے ناصح نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں

و ثالثاً درر البحار والے تو حنفی ہیں وہ تو شافعی نہیں۔ ان کی بات کیوں رو کر دی گئی ہے؟ اور
طرح امام ابن عابدین شامی حنفی ہیں اور امام ابن حجر کے اس حوالہ کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔
اس سے کیوں انماض کیا گیا ہے؟

ورابعاً وہ کونسے علماء ہیں جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں جو اذان قبر کو سنت کہتے ہیں۔ ان کا نام اور کتاب کا حوالہ تو تحریر فرمائیے۔ یہ بات آپ نے صیغہ راز میں کیوں رکھ چھوڑی ہے تاکہ ہمیں بھی معلوم ہو جائے کہ ایسے علماء بھی ہیں (جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں) جو اذان قبر کو سنت کہتے ہیں۔ باقی خان صاحب بریلی وغیرہ بدعت پسند مولویوں کی عبارتوں سے صرف اپنے ماؤف دل کی تسکین تلاش کیجئے۔ اہل سنت و الجماعت کے لئے ایسے مبتدعین کی بات پر گاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی کیونکہ ان

کی بات صرف آپ کو ہی پسند آسکتی ہے۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

ہمارے اکابر نے تصریح کر دی ہے۔ **الجواب** : قبر پر اذان کہنا خلاف سنت اور بدعت

سید ہے جیسا کہ تصریحات فقہاء سے ثابت ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۵ ص ۳۸۱)۔

چوتھا اعتراض : (علامہ محمود ملنجی کی توشیح کی عبارت کے جواب میں) مفتی صاحب لکھتے ہیں :

توشیح کا فرمانا لیس بٹشی ء اس کے معنی یہ نہیں کہ حرام ہے۔ مراد یہ ہے کہ نہ فرض نہ واجب نہ سنت

محض جائز اور مستحب ہے اور اس کو سنت یا واجب سمجھنا محض غلط ہے۔ جو فقہاء کہ اس کو بدعت فرماتے

ہیں، وہ بدعت جائزہ یا کہ بدعت مستحبہ فرماتے ہیں نہ کہ بدعت مکروہہ۔ کیونکہ بلا دلیل کراہت ثابت نہیں

ہوتی۔ (بلفظہ جارالحق ص ۳۵)۔

جواب : مفتی صاحب کا یہ جواب بچند وجوہ باطل ہے۔ اولاً اس لئے کہ یہ ان کے اس زعم

باطل پر مبنی ہے کہ جواز اور استحباب کے لئے دلیل شرعی ضروری نہیں سمجھتے اور علماء کے قول سے بھی اس کو وہ

صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ سراسر باطل ہے کیونکہ جواز اور استحباب بھی شرعی

احکام ہیں اور ان کے اثبات کے لئے بھی دلیل شرعی کی ضرورت ہے۔

و ثانیاً مستحب جیسے شرعی حکم کو جس کے کرنے سے ثواب ملتا ہے لیس بٹشی ء سے تعبیر کرنا اور وہ

بھی محض اپنی غرضِ فاسد کے تحت، دین کی سراسر بغاوت ہے اور دُرِّ مختار کے حوالہ سے قیل یستحب

سے اس پر استدلال کرنا اور پھر لفظ قیل کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ضعف کی علامت نہیں، تمام بے بنیاد باتیں

ہیں کیونکہ دین کسی اکیلے دوکیلے عالم کی رائے یا اس کی لغزش کا نام نہیں ہے۔ یہاں جمہور کی نقل معتبر ہوگی

یا کم از کم معتبر اور مستند عالم کی بات جو با دلیل ہو۔

و ثالثاً وہ کون سے حضرات فقہاء کرام ہیں جو اذان علی القبر کو بدعت جائزہ یا بدعت مستحبہ فرماتے

ہیں؟ شاید وہ مفتی صاحب کے عالم خیال، صوبہ خواہش اور ضلع غرضِ فاسد میں آبار ہوں۔ مفتی

صاحب نے ہدایہ کے حاشیہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ لیس بٹشی ء سے وہ چیز مراد ہوگی جس پر ثواب نہ

ملتا ہو اور لیس بٹشی ء اباحت پر صادق آتا ہے، اور پھر یہ نتیجہ نکالا کہ : معام ہوا کہ لیس بٹشی ء

مباح کو بھی کہا جاتا ہے (صفحہ ۳) تو یہ بھی مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند حضرات کے اس نظریہ پر مبنی ہے کہ وہ اباحت کو دلیل شرعی کا محتاج نہیں سمجھتے۔ واللہ باحوالہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ اباحت بھی حکم شرعی ہے اور اباحت بغیر اذن شامع اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ تمام مغز کھپائی مفتی صاحب کے لئے بالکل بے سود ہے۔

الحاصل یہ ایک واضح اور یقین حقیقت ہے کہ قبر پر اذان نہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ثابت ہے اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور تبع تابعینؓ سے اس کا ثبوت ملتا ہے، نہ حضرات مجتہدینؒ سے اس کا جواز منقول ہوا اور نہ ذمہ دار فقہاء کرامؒ سے، بلکہ وہ اس کو خلاف سنت اور بدعت کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز خلاف سنت اور بدعت ہو، وہ کیسے جائز اور مستحب ہو سکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خان صاحب بریلی وغیرہ اس کو فرسنت کہتے ہیں۔ مگر اثبات سنت

ان کے منہ کی بات کا نام نہیں ہے، یہاں ٹھوس اور صریح دلیل درکار ہے۔

اذان علی القبر کے جواز کے دلائل | قبر پر اذان دینے کے جواز میں متعدد اہل بدعت حضرات نے

چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے لکھے ہیں۔ چنانچہ ان کے اعلیٰ حضرت خان صاحب بریلی نے ایک سالہ لکھا

ہے جس کا نام ایذان الابرہ ہے (جس کا بہترین جواب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے امعان النظر سے

دیا ہے) اس میں خان صاحب نے بزعم خود پندرہ دلیلیں قائم کی ہیں۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں۔ "یہ پندرہ

دلیلیں ہیں کہ چند ساعات میں فیض قدیر سے قلب فقیر پر فائز ہو میں" (ایذان الابرہ ص ۱) مگر ان میں

ایک بھی دلیل ایسی نہیں ہے جس سے قبر کے اوپر اذان کا مسئلہ ثابت ہو۔ ان دلائل میں کسی میں اذان کی

فضیلت کا ذکر ہے اور کسی میں دعا اور ذکر کی فضیلت کا تذکرہ ہے۔ کسی میں قبر کے اندر میت کیلئے تسبیح

کا سوال ہے، اور کسی میں اس کے لئے تخفیف عذاب کا بیان ہے۔ اور کسی میں سبحان اللہ اور الحمد للہ

اور لا الہ الا اللہ وغیرہ کا قبر پر اثبات ہے۔ کسی میں استعاذہ من الشیطان کی دعا کا ذکر ہے اور کسی

میں تلقین کا۔ کسی میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسم گرامی لینے سے عذاب کے ٹل جانے کا بیان ہے

اور کسی میں شیطان کے بھاگ جانے کا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب مسائل اور دلائل اپنے مقام پر حق ہیں اور ان کا

کوئی بھی مسلمان منکر نہیں ہے۔ مگر سوال تو صرف یہ ہے کہ کیا معبود اذان آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ و تبع تابعینؓ نے قبر پر وہی ہے؟ اگر اس کا ثبوت ہے تو لایئے اللہ بسم اللہ۔ اس دلیل سے یہ مسئلہ ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا کہ کسی حدیث سے لا الہ الا اللہ کا جملہ لے لیا اور کسی سے درود شریف کی فضیلت اخذ کر لی، اور کسی حدیث سے شیطان کے بھاگنے کی بات اخذ کر لی اور کسی سے اذان کی، اور سب کو جوڑ کر اذان ثابت کر دی۔ اس کا نام دلیل نہیں ہے۔ ایسے طرز استدلال سے اسلام میں کیا کچھ ثابت نہیں کیا جاسکتا؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خان صاحب کی سب سے بڑی اور زنی دلیل کو جس کو انہوں نے دلائل کی مدین نمبر اول پر پیش کیا ہے نقل کر کے اس کے متعلق کچھ عرض کر دیں تاکہ آپ کو نمونہ از خروارے کے طور پر بقیہ دلائل کا معیار اور خان صاحب کا گلستانِ دلائل بھی معلوم ہو جائے، اور ان دلائل سے ان کے اختیار کردہ مسائل کا خاکہ بھی سامنے آجائے۔ اور یقین کیجئے کہ ان کی ہر دلیل انکے دعویٰ کے اثبات سے قاصر اور فی نفسہ غیر موثر ہے۔ بقول علامہ اقبال نہ

اک فغانِ بے شمر سینے میں باقی رہ گئی سوز بھی جاتا رہا جاتی رہی تاثیر بھی

خان صاحب لکھتے ہیں کہ دلیل اول وارد ہے کہ جب بندہ قبر میں رکھا جاتا ہے اور سوال نکیرین ہوتا ہے۔ شیطان رحیم وہاں بھی تصل انداز ہوتا ہے اور جواب میں بہکاتا ہے۔ امام ترمذی محمد بن علی نوادر الاصول میں امام اجل سفیان ثوریؒ سے روایت کرتے ہیں۔ جب مُردے سے سوال ہوتا ہے کہ تیرا رب کون ہے۔ شیطان اس پر ظاہر ہوتا اور اپنی طرف اشارہ کرتا ہے کہ میں تیرا رب ہوں۔ اس لئے حکم آیا کہ میت کے لئے جواب میں ثابت قدم رہنے کی دعا کریں اور صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ اذان شیطان کو دفع کرتی ہے، اور جب ثابت ہو گیا کہ وہ وقت عیاذاً باللہ مداخلت شیطان لعین کا ہے اور ارشاد ہوا کہ شیطان اذان سے بھاگتا ہے اور ہمیں حکم آیا کہ اس کے دفع کو اذان کہو، تو یہ اذان خاص حدیثوں سے مستنبط بلکہ عین ارشاد شامع کے مطابق اور مسلمان بھائی کی عمدہ امداد و اعانت ہوئی۔ (ایذان الابرصا و صلا بلفظہ ملخصاً)۔

جواب: خان صاحب کا یہ ارشاد ایک خالص مجذورانہ مغالطہ اور قلتِ تدبیر کا افسوسناک

مظاہرہ ہے۔ اولاً اس لئے کہ شرعی اصول کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی تکلیفی زندگی جس میں اغوائے شیطانی کا خطرہ رہتا ہے موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ قبر میں اغوا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ باقی نوادیر الاصول کا حوالہ تو چنداں قابل التفات نہیں ہے اس لئے کہ یہ کوئی مرفوع حدیث نہیں بلکہ ایک تابعی کا موقوف قول ہے، اور پھر اس کی سند بھی ذکر نہیں کی گئی اور نوادیر الاصول ان کتابوں میں ہے جن میں رطب ویابس سبھی کچھ ہے۔ المراح فی المراح لعلامہ بدرالدین غزنی (المتوفی ۸۱۴ھ) کے حاشیہ میں ہے:

قال السيوطي في الجامع الكبير كل ما عزي الى العقيلي وابن عدى والخطيب البغدادي وابن عساكر والاحكام الترمذي وذكر جماعة غيرهم فهو ضعيف فيستغنى بالعز واليهما عن بيان ضعفه۔

امام سیوطی جامع کبیر میں لکھتے ہیں کہ جو روایت عقیلی اور ابن عدی اور خطیب بغدادی اور ابن عساکر اور حکیم ترمذی اور ان کے علاوہ ایک بڑی جماعت کا ذکر کیا، کی طرف منسوب ہو تو وہ ضعیف ہوگی۔ ان کی طرف روایت کا نسبت کر دینا ہی اس کے ضعف کے لئے کافی ہے اسکے ضعف

(حاشیہ المراح فی المراح ص ۱۵) کے الگ بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

اگر ان کتابوں میں کوئی روایت باسند ہو اور سند بھی متصل ہو اور راوی بھی تمام ثقہ ہوں اور شذوذ اور علت قاعدہ سے بھی محفوظ ہو، تو الگ بات ہے ورنہ ان کی طرف کسی روایت کا منسوب کر دینا ہی اس کے ضعیف اور کمزور ہونے کی دلیل ہے اور یہی وہ کتابیں ہیں کہ جن سے جملہ اہل بدعت اور خصوصاً خان صاحب بریلی اپنے سب مسائل ثابت کرتے ہیں۔ کیا خوب صحیح مذہب معلوم اہل مذہب معلوم!

و ثانیاً اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قبر میں بھی شیطان کا دخل ہوتا ہے اور بعض حضرات صحابہ کرام سے دفن کے بعد کی دعاؤں میں اللھم اجرھا من الشیطان اور اللھم اعذکا من الشیطان اور اس قسم کے جو الفاظ وارد ہوتے ہیں وہ اپنی حقیقت ہی پر محمول ہیں۔ تو عرض یہ ہے کہ بہت سے مقامات ایسے ہیں جن میں شیطان کا دخل احادیث سے معلوم ہے مگر ان مقامات پر شاید خان صاحب بھی اذان گو گوارا نہ کریں۔ چنانچہ صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۴۵ وغیرہ کتب صحاح میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس وقت یہ دعا پڑھے:

بِسْمِ اللّٰهِ جَبَبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَبَبْنَا الشَّيْطَانَ
 اللہ کے نام سے اے اللہ مجھے شیطان سے بچا اور شیطان کو
 ما رزقتنا (الحديث - بخاری ج ۲ ص ۹۲۵) اس چیز (یعنی اولاد) میں جو تو ہمیں دے ہم سے الگ رکھ۔

حافظ ابن حجر حضرت مجاہد سے اس کی شرح میں نقل کرتے ہیں کہ :

ان الذی یجامع ولا یستمی یلتف الشیطان
 جو شخص ہمبستری کے وقت یہ دعا نہیں پڑھتا تو شیطان اس کے
 علی احلیلہ الخ (فتح الباری ج ۲ ص ۹۲) آگے تناسل پر لپٹ جاتا ہے (اور ساتھ شریک ہو جاتا ہے)۔

یعنی اس سے زیادہ نازک مقام شیطان کو بھگانے کا اور کیا ہوگا؟ کیا قبر پر اذان دینے والے حضرات
 کے نزدیک اس موقع پر بھی شیطان کو بھگانے کا کبھی خیال پیدا ہوا ہے؟ ان کے نزدیک تو اس موقع پر
 بھی اذان کم از کم مستحب اور فریضہ بنتی ہے۔ یہاں صرف مسلمان بھائی ہی کی امداد نہیں بلکہ
 مسلمان بہن کی بہرہ رزی اور امداد بھی ہوگی، اور وہ بے چاری دو گونہ تکلیف سے بھی محفوظ رہے گی بلکہ
 اور اولاد پر بھی احسان ہوگا کہ شیطان کی خلل اندازی سے وہ بھی محفوظ رہے گی۔ اس موقع پر اذان دینے
 میں مسلمان بھائی اور بہن اور اولاد کی افراد کا بھلا ہے اور نیک آدمی کی اذان کا اثر بھی مخفی نہیں لہذا فریق
 مخالف کے نیک حضرات مریدوں ہمتیوں اور شاگردوں کو مشغول بکار ہونے کا حکم دیں اور خود اذان دینے
 کا فریضہ ادا کریں تاکہ انکی امداد ہو جائے۔ اگر اس موقع پر وہ ایسا نہیں کرتے تو وجہ فرق بیان کریں۔

وَالثَّالِثُ أَنْ حَضَرَتْ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَ ارشاد فرمایا کہ :

ان هذا الخشوش محتضرة (الحديث)
 یعنی قضائے حاجت کے مقامات پر شیاطین موجود رہتے ہیں
 (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۷۷ و مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۷۷) پس جب تم میں سے کوئی پاخانے جائے تو یہ دعا کر لیا کرے۔

نیز فرمایا :

اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخَبَثِ وَالْخَبَائِثِ (ترمذی ص ۱۷۷) کہ اے اللہ مجھے نہ اور مادہ جنوں اور شیطانوں سے بچا۔

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ پاخانوں میں شیاطین موجود رہتے ہیں۔ کیا قبر پر اذان دینے والوں
 نے کبھی اس موقع پر اذان کہنے کو مستحب اور فریضہ بنتی کہا ہے؟ اور اس پر بھی کبھی عمل کیا ہے کہ پیر مولوی
 اور مفتی صاحب تو قضائے حاجت میں مشغول ہوں اور یا دفا مرید اور شاگرد اذان دے کر شیاطین کو بھگا

کی فکر میں ہوں، اور اگر ایسا کرتے ہیں تو خوب، اور اگر نہیں تو وجہ فرق کیا ہے؟ بیٹنوا و تو جروا۔
 و رابعاً خان صاحب بریلی کے پیش کردہ جملہ فوائد (اور ان سے اخذ کر کے مفتی احمد یار خان
 صاحب کے یہ تمام منافع کہ اذان میں پوری تلقین ہے۔ اذان کی آواز سے شیطان بھاگتا ہے۔
 — اذان سے دل کی وحشت دُور ہوتی ہے۔ اذان کی برکت سے غم دُور ہوتا ہے۔ اذان کی
 برکت سے لگی ہوئی آگ بجھتی ہے۔ اذان ذکر اللہ ہے اور ذکر اللہ کی برکت سے عذابِ قبر دُور ہوتا
 ہے اور اذان میں حضور علیہ السلام کا ذکر ہے اور صالحین کے ذکر کے وقت نزولِ رحمت ہوتا ہے،
 وغیرہ وغیرہ۔ دیکھئے ایدان الاجر اور جوار الحق ص ۲۹ ماہنامہ ۳ بلفظہ ملتقطاً) جناب رسول اللہ صلی اللہ
 تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ و تبع تابعینؓ کو بھی معلوم تھے۔ مگر کیا وجہ ہے کہ آپ نے
 مدۃ العمر ایک دفعہ بھی کسی کی قبر پر اذان نہ کہی، نہ اس کا حکم صادر فرمایا، نہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ
 میں سے کسی نے اس پر عمل نہ کیا اور نہ حضرات ائمہ دین میں سے کسی نے یہ راز سمجھا، تو آج چودھویں صدی
 میں کسی شخص کو یہ حق کہاں سے اور کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ اپنی ان بے حقیقت قیاس آرائیوں سے دین
 میں پیوند کاری کرے؟ قبر پر اذان دے کر مسلمان بھائی کی عمدہ امداد کا یہ جاؤ و اثر نسخہ جناب نبی
 کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود روف اور رحیم ہونے کے اپنی امتِ مرحومہ کو نہ بتایا اور حضرات
 صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کو بھی یہ نسخہ عجیبہ و مفیدہ معلوم نہ ہو سکا اور حضرات ائمہ مجتہدینؒ
 بھی اس اکسیرِ اعظم سے محفوظ رہے اور سلف صالحینؒ بھی اس زود اثر کُشتہ کے اثر سے فیض یاب نہ ہو
 سکے تو پھر آج اس نسخہ کو کون پوچھتا ہے؟

اور ہوں گے جو سہیں ان کی جفائیں بے محل ہم کسی کا غم نزعہ بے جا اٹھا سکتے نہیں
 و خامساً دلائل شرعیہ سے ثابت ہے کہ شیطان لعین انسان کا عدو مبین ہے، اور ہر وقت
 اسی فکر میں رہتا ہے کہ انسان کو اغوا کر کے اپنا رفیق اور ساتھی بنا لے۔ بیداری میں وہ بھلا پیچا کیسے
 چھوڑتا، وہ تو خوابِ غفلت میں بھی انسان کو پریشان کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اور خواب کی ایک قسم
 تخويف من الشيطان ہے جو اس کی واضح دلیل ہے۔ اہل بدعت کے قاعدہ کی رُو سے لازم ہے کہ دن اور

رات کے جُملہ اوقات میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کی عمدہ امداد اس اذان کے ذریعہ کی جائے، اور سفر و حضر میں اس عمدہ امداد کو فراموش نہ کیا جائے۔ کوئی اس کو پسند کرے یا نہ کرے، یہ کہتے ہوئے اس پر عمل کرنا چاہیے کہ مان نہ مان میں تیرا مہمان! اور یہ کس سے پوشیدہ ہے کہ اسمبلیوں، کلبوں، سنیماؤں، کالجوں، اسکولوں اور دفاتروں میں آج کل جس طرح شیطان کا دخل ہے وہ کسی اور جگہ ہرگز نہیں۔ لہذا اپنے مسلمان بھائیوں کی عمدہ امداد اذان کے ذریعہ ہونی چاہیے، اور پھر حکومت کے فیصلہ کا انتظار کیجئے کہ وہ اس ہمدردی کا کیا صلہ تجویز کرتی ہے؟ اور آج کون مسلمان ہے جو اس ناپائیدار دُنیا میں وحشت اور غم میں مبتلا نہیں، ہر طرف سے بیچارہ مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے اور وہ کون سنگدل ہے جس کے ماں باپ اور بیٹیا یا کوئی عزیز فوت ہو جائے اور وہ غم دالم سے دوچار نہ ہو، اس کی عمدہ امداد اذان کے ذریعہ کیوں نہیں کی جاتی؟ اور سینکڑوں مکانات بعض افراد کی غلطی اور نادانی کی وجہ سے نذر آتش ہو جاتے ہیں پھر اذان کے ذریعہ آگ بجھا کر ان بیچاروں کی یہ عمدہ امداد کیوں نہیں کی جاتی؟ یہ بھی کوئی عجیب نسخہ ہے کہ میت کی عمدہ امداد تو اس سے ہوتی ہے اور زندوں کا ہولِ دل، وحشت اور غم اس سے دُور نہیں کیا جاتا، اور نہ تو آتشِ حسی اس سے بجھائی جاتی ہے اور نہ معنوی (مثلاً حسد، بغض، عداوت وغیرہ) یہ کیا عجیب اور مجیر العقول منطق ہے، فیصلہ آپ پر ہے۔

یہاں تک آپ کی تعظیم کر دی اب آگے آپ کے اعمال جانیں

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ | اہل بدعت حضرات کا ایک اُصولی مغالطہ ہے جس میں وہ سب کے سب گرفتار ہیں۔ چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب کے الفاظ میں وہ مغالطہ یہ ہے کہ بعدِ فن ذکر اللہ، سبح و بکیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے اور جس کی اصل ثابت ہو وہ سنت ہے۔ اس پر زیادتی کرنا منع نہیں۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ حج میں تلبیہ کے جو الفاظ احادیث سے منقول ہیں، ان میں کمی نہ کرے۔ اگر کچھ بڑھاوے تو جائز ہے (ہدایہ وغیرہ) اذان میں تلبیہ بھی ہے اور کچھ زیادہ بھی، لہذا یہ سنت سے ثابت ہے (بلفظہ جارا الحق ص ۳۱)۔

جواب : یہ استدلال بھی سراسر مردود ہے۔ اولاً اس لئے کہ پوری تفصیل کے ساتھ عرض کیا جا

چکا ہے کہ یہ سب منافع اور فوائد جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام وغیرہم کو معلوم تھے۔ مگر انہوں نے اپنی زندگی میں ایک دفعہ بھی قبر پر اذان نہیں دی۔ لہذا سنت ثابتہ کے مقابلہ میں ایسے خود ساختہ عقلی دلائل ہرگز قابل قبول نہیں ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں، کہ وہ عقلیات جو شریعت کے معیار اور میزان پر پورے نہ اترتے ہوں، قابل اعتماد و محل اعتبار نمی تواند بود۔ (عجالتہ نافعہ ص ۳۱)۔

و ثانیاً مفتی احمد یار خان صاحب نے ہدایہ کے حوالہ سے اتنی بات (جو مفید طلب ہمتی) تو نقل کر دی ہے کہ اگر کچھ بڑھاوے تو جائز ہے لیکن صاحب ہدایہ کی دلیل نقل نہیں کی کہ یہ زیادت کیوں جائز ہے؟ صاحب ہدایہ اپنی عادت کے موافق اس مسئلہ کی نقلی دلیل یوں پیش کرتے ہیں کہ:

ان اجلاء الصحابة کابن مسعودؓ وابن عمرؓ بڑے بڑے حضرات صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ و ابی ہریرہؓ زادوا علی الماثور (ہدایہ ج ۱ ص ۲۱۴) اور حضرت ابو ہریرہؓ ماثور تبلیہ میں کچھ الفاظ زیادہ پڑھتے تھے۔ یہ وہ صحابی ہیں جو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ ان کے اس زیادت والے عمل سے یہ ثابت ہوا کہ ان کے پاس آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور موجود تھا، ورنہ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عمرؓ وہی جلیل القدر صحابی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت اور ہیئت کے بدلنے کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور تعبیر کو بدعت ظلماء، اور بدعت عظمیٰ وغیرہ سے تعبیر کرتے تھے۔ جس کی پوری تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اگر ان کے پاس ایسا ثبوت نہ ہوتا تو ہرگز وہ یہ زیادتی نہ کرتے۔

ہم نے جو یہ کہا کہ ان کے پاس ثبوت ہوگا۔ یہ بات محض "ہوگا" پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ حقیقتاً ان کے پاس ثبوت موجود تھا۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں:

والناس یزیدون لبیک ذالمعارض ونحوہ من الکلام والتبیی صلی اللہ علیہ وسلم یسمع فلا یقول لہم شیئاً۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۲۵۲ و نصب التلیح ص ۲۵)

کہ لوگوں نے لبیک کے معارض اور اسی طرح کا اور کلام تبلیہ میں زیادہ کیا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو سنا اور ان کو کچھ نہ کہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تلبیہ کے اندر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے اور آپ کی موجودگی میں یہ کلمات حضرات صحابہ کرامؓ زیادہ کرتے تھے، اور آپ نے سن کر بھی ان کو منع نہیں کیا تو یہ آپ کی تقریری حدیث ہے (دیکھئے نخبۃ الفکر ص ۱۶ وغیرہ)۔ وہی حضرت ابو ہریرہؓ جن کا حوالہ صاحب ہدایہ نے دیا ہے کہ وہ تلبیہ میں بعض الفاظ زیادہ کیا کرتے تھے، ان سے (نسائی ج ۲ ص ۱۱۱، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۵۴ میں علی شرط الشیخین اور اس کے ملخص موارد النظم ان ص ۱۲۲) یہ روایت آتی ہے کہ وہ زیادت کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کیا کرتے تھے (ملاحظہ ہو زیلعی ج ۳ ص ۲۵ وغیرہ) الغرض جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ تلبیہ میں زیادت کیا کرتے تھے۔ مگر یہ زیادت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قوی اور تقریری حدیث سے ثابت تھی۔ اس پر مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا قیاس کرنا سراسر باطل اور مردود ہے۔ غرضیکہ کوئی بھی ایسی صحیح اور صریح دلیل موجود نہیں جس سے قبر پر اذان کا جواز ثابت ہو سکے، چہ جائیکہ وہ فرد سنت ہو۔ اور عرض کیا جا چکا ہے کہ جواز اور اباحت بھی حکم شرعی ہے اور وہ بھی صرف شارع سے ثابت ہوگا اور بس۔

اذان میں انگوٹھے چومنا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو پردہ خفا میں ہو اور امت کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہو۔ آپ کی ایک ایک ادا، ایک ایک حرکت اور نشست و برخاست غرضیکہ کوئی بھی آپ کا قول و فعل پوشیدہ نہیں۔ اذان جیسی عبادت جو دن میں پانچ مرتبہ ادا کی جاتی تھی اور ہجرت کے بعد تقریباً دس سال مدینہ طیبہ میں آپ کے سامنے ہوتی رہی اور اذان کے کلمات نیز اذان دینے والوں کے نام اور اذان کی جملہ کیفیات احادیث کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔ مگر کسی بھی صحیح روایت میں اس کا ذکر نہیں کہ اذان سنتے وقت انگوٹھے چومنے چاہئیں۔ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) سے ہی محبت ہے (اور ہر مسلمان کو ہونی چاہیے) تو اذان دینے والے کے ہاتھ کو چومنا چاہیے جس کے مبارک ہونٹوں اور زبان سے یہ مبارک نام نکلا ہے، اپنے انگوٹھے تو ہر وقت

ساتھ ہی رہتے ہیں، نہ تو ان سے آپ کا اہم گرامی صادر ہوتا ہے اور نہ ان پر لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جب اس فعل کا صحیح احادیث سے ثبوت ہی نہیں (اور اذان جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ اور خیر القرون میں ہوتی رہی) تو پھر اس کو آج کیسے دین کہا جاسکتا ہے اور کس طرح اس کو شعار دین بنانا درست ہے اور نہ کرنے والوں کو کیونکر ملامت کرنا روا ہے۔

انگوٹھے چومنے کے ثبوت میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ اصولی طور پر دو ہیں ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے جب مؤذن کا یہ قول سنا کہ اَنَّ مُحَمَّدًا اَرْسَوْلَ اللّٰهِ تو اس وقت انہوں نے

قبل باطن الانہلتین السباحتین و مسح
عینہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم من فعل
مثل ما فعل خلیلی فقد حلت له شفاعتی
اپنے گلے کی انگلیوں کے باطنی حصوں کو چوما اور آنکھوں
سے لگایا۔ پس حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، جو
شخص میرے اس پیارے کی طرح کرے، اس کیلئے میری
شفاعت واجب ہوگئی۔

یہ روایت مسند فردوس و بیہی کے حوالہ سے تذکرۃ الموضوعات ص ۳۶ اور الموضوعات کبیر ص ۱۷۷ میں
نقل کی گئی ہے اور مفتی احمد یار خان صاحب نے مقاصدِ حسنہ کے حوالہ سے جوار الحق ص ۳۷۸ میں نقل کی ہے اور
ترجمہ بھی مفتی صاحب ہی کا ہے اور یہ روایت مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاسِ حقیقت ص ۱۶ میں بھی نقل کی ہے۔

جواب : علامہ محمد طاہر حنفیؒ لکھتے ہیں ولا یصح (تذکرۃ الموضوعات ص ۳۶) کہ یہ روایت صحیح
نہیں ہے۔ ملا علی قاریؒ، علامہ سخاویؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں لا یصح (موضوعات کبیر ص ۱۷۷) کہ یہ روایت
صحیح نہیں ہے۔ جب سرے سے یہ روایت ہی صحیح نہیں تو اس پر عمل کرنے کی کیسے گنجائش؟ اور خود مفتی احمد یار
خان صاحب نے امام سخاویؒ سے ولہ یصح نقل کر کے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: "یہ حدیث پایہ صحت تک نہ
پہنچی" (جوار الحق ص ۳۷۸)۔ مولوی محمد عمر صاحب کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے تذکرۃ الموضوعات اور الموضوعات
کبیر سے حوالے تو نقل کئے ہیں۔ لیکن لا یصح کا جملہ بشیرِ ماورِ سمجھ کر ہضم کر گئے ہیں۔ تفت ہے اس علمی خبیثت
اور بددیانتی پر۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی اُتج | مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ صحیح نہ ہونے سے ضعیف ہونا لازم نہیں کیونکہ صحیح کے بعد درجہ حسن باقی ہے۔ لہذا اگر یہ حدیث حسن ہو تب بھی کافی ہے (جبار الحق ص ۳۸۲) مگر مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ کوئی محدث جب مطلقاً صحیح کہتا ہے تو اس کا مطلب اس کے بغیر اور کچھ نہیں ہوتا کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ اگر حدیث حسن ہوتی ہے تو اس کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے یا ایسے بصریح بل حسن وغیرہ سے اس کو تعبیر کرتے ہیں۔ مطلقاً صحیح سے حسن سمجھنا قلتِ فہم کا نتیجہ ہے۔

ایک وہم اور اُس کا ازالہ | حضرت ملا علی نقاری فرماتے ہیں کہ جب اس حدیث کا رفع حضرت صدیق اکبر تک صحیح ہو گیا تو عمل کے لئے یہی کافی ہے کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم پر میری اور میرے خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے (موضوعات کبیرہ ص ۱۷۷)۔ اور یہی دلیل مفتی احمد یار خان صاحب نے جبار الحق ص ۳۸۲ میں اور مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاسِ حنفیت ص ۲۱۱ میں پیش کی ہے۔ لیکن یہ حضرت ملا علی نقاری کا وہم ہے۔ اس لئے کہ اگر واقعی یہ روایت حضرت ابوبکر تک موقوف بھی صحیح ہوتی تب بھی حجّت تھی مگر حضرت ابوبکر سے جو روایت منقول ہے وہ مرفوع ہے اور اس کی سند سرے سے صحیح ہی نہیں ہے نہ یہ کہ مرفوع صحیح نہیں۔ پھر یہ کہنا کہ مرفوع صحیح نہیں ہے موقوف صحیح ہے اور عمل کے لئے کافی ہے کیسے صحیح ہوا؟ باقی جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ لا یصح دفعہ یا لا یصح فی المرفوع تو وہ ابن صالح وغیرہ بعض شیوخ کی موقوف روایات کے پیش نظر ہے۔ وہ اگر بالفرض صحیح بھی ہوں تب بھی موقوف ہونے کی وجہ سے حجّت نہیں ہیں خصوصاً جبکہ ابن صالح وغیرہ صحابی بھی نہیں ہیں۔ ملا علی نقاری کا وہم کوئی نئی چیز نہیں، امام عبداللہ ابن المبارک نے خوب کہا ہے ومن ذالسلو من الوهم (سان المیزان ج ۱ ص ۱۷۱) وہم سے کون بچ سکتا ہے؟ الا من عصمه اللہ تعالیٰ۔

ضعیف حدیث پر عمل کرنے کی تحقیق | مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جاوے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، پھر بھی فضائلِ اعمال میں حدیث ضعیف معتبر ہوتی ہے (جبار الحق ص ۳۸۳)۔

جواب: یہ بھی مفتی صاحب کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ یہ کہہ دینا کہ فضائلِ اعمال میں ہر قسم کی حدیث غیر مشروط طور پر حجّت ہوتی ہے، قطعاً غلط ہے۔ امام قاضی ابن العربی المالکی (المتوفی ۵۴۲ھ) وغیرہ تو ضعیف

حدیث کے متعلق فرماتے ہیں لا یعمل بہ مطلقاً (القول البیہ ۱۹۵) "مطلقاً اس پر عمل صحیح نہیں ہے۔ اور جو عمل کرتے ہیں وہ شرطیں لگاتے ہیں۔ چنانچہ امام ابن وقیف العید (المتوفی ۳۸۷ھ) لکھتے ہیں :

العمل بالحدیث الضعیف مقید بشرط (امام علیؑ) ضعیف حدیث پر عمل کرنا چند شرطوں سے مقید ہے۔

وہ شرطیں کیا ہیں۔ امام سخاوی (المتوفی ۸۹۷ھ) اپنے شیخ حافظ ابن حجر کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ :

ان شرائط العمل بالضعیف ثلاثة الاول

متفق علیہ ان یکون الضعیف غیر شدید

فیخرج من انفراد من الکذابین والمتهمین

بالکذب ومن فحش غلطه الثانی ان یکون

مندرجا تحت اصل عام فیخرج ما یخترع

بحدیث لا یکون له اصل اصلاً الثالث

ان لا یعتقد عند العمل بہ ثبوتہ لئلا

ینسب الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما

لہ بقلہ۔ (القول البیہ ۱۹۵)

منسوب نہ ہو جائے جو آپ نے نہیں فرمائی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر یہ شرطیں منقود ہوں تو روایت ہرگز قابل عمل نہ ہوگی۔ اور آخری شرط تو

خاص طور پر قابل لحاظ ہے کیونکہ جو چیز وثوق کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت نہیں،

اس کو آپ کی طرف منسوب کرنا اور پھر اس کو ثابت ماننا، سنگین جرم ہے اور یہ درجہ اول کی متواتر حدیث

من کذب علی (الحدیث) کے بظاہر خلاف ہے۔

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں کہ :

فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر بالاتفاق عمل

واما العمل بالضعیف فی فضائل الاعمال

کا دعویٰ کرنا باطل ہے۔ ہاں جمہور کا یہ مذہب ہے۔

فدعوی الاتفاق فیہ باطلہ نعم ہو مذہب

الجہور لکنہ مشروط بان لا یكون الحدیث
ضعیفاً شدید الضعف فان كان كذلك لم
مگر اس میں شرط یہ ہے کہ حدیث سخت ضعیف نہ ہو ورنہ
فضائل اعمال میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔

يقبل في الفضائل ايضاً (الآثار المرفوعة في الاخبار الموضوعه من ۳)

افسوس ہے کہ مبتدعین حضرات ایسی حدیثوں کے اثبات کے لئے ایڑھی چوٹی کا زور لگاتے ہیں،
فوا اسفا! خان صاحب بریلی نے کیا ہی خوب فرمایا ہے کہ "حدیث ماننے اور حضور اکرم سید عالم
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرنے کے لئے ثبوت چاہیے، بے ثبوت نسبت جائز نہیں (بلفظہ عرفان
شرعیۃ حصہ سوم ص ۲)۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگرچہ سابقہ شرطوں کے ساتھ فضائل اعمال میں
عمل کرنا جائز اور مستحب ہے لیکن شرط یہ ہے کہ موضوع نہ ہو۔ اگر روایت موضوع ہوگی تو ہرگز قابل عمل
نہ ہوگی۔ حافظ ابن وقین العید لکھتے ہیں :

وان كان ضعيفاً لا يدخل في حيز الموضوع
فان احدث شعراً في الدين منع منه وان
لم يحدث فهو محل نظر۔ (احكام الاحكام ص ۱۵)
یعنی اگر ضعیف حدیث ہو لیکن شرطیکہ وہ موضوع نہ ہو، تو
اس پر عمل جائز ہے لیکن اگر اس سے دین کے اندر کوئی شعار
قائم اور پیدا ہوتا ہو تو اس سے بھی منع کیا جائے گا ورنہ
اس پر غور کیا جائے گا۔

لیجئے یہاں ایک اور بات بھی حل ہو گئی۔ وہ یہ کہ ضعیف حدیث اس وقت قابل عمل ہوگی جبکہ موضوع
اور جعلی نہ ہو، اور ساتھ ہی وہ دین کا شعار اور علامت نہ ٹھہرائی گئی ہو۔ اگر دین کی علامت یا شعار کا خطرہ
ہو تو اس سے بھی منع کیا جائے گا۔ اور اہل بدعت حضرات خیر سے ان چیزوں کو سنت اور خفیت کا معیار
قرار دیتے ہیں اور ان بدعات کو نہ کرنے والوں کو گستاخ اور وہابی کہتے ہیں، اور ان کے خلاف مقیاس
خفیت جیسی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں بھلا یہ ضعیف روایتیں کیونکر حجت ہو سکتی ہیں؟
اور علامہ سخاوی لکھتے ہیں :

يجوز ويستحب العمل في الفضائل
والترويج والترهيب بالحدیث الضعیف
کہ جائز اور مستحب ہے کہ فضائل اعمال اور ترغیب و
ترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے مگر شرط یہ

مالعینک موضوعا۔ (القول البدیع ۱۹۵) ہے کہ وہ موضوع اور جعلی نہ ہو۔

نیز لکھتے ہیں :

واما الموضوع فلا يجوز العمل به بحال (طہ) بہر حال موضوع حدیث تو اس پر کسی حالت میں عمل جائز نہیں ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ فضائل اعمال میں ہر ضعیف حدیث قابل عمل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے حضرات محدثین کے نزدیک چند شرطیں ہیں، اور جو حدیث موضوع اور جعلی ہو اس پر کسی حالت اور کسی صورت میں عمل جائز نہیں ہے، نہ فضائل اعمال میں اور نہ ترغیب و ترہیب وغیرہ میں۔ اب بقائمی ہوش و سواس سن لیجئے کہ انگلیاں چومنے کی تمام حدیثیں صرف ضعیف ہی نہیں ہیں بلکہ موضوع اور جعلی ہیں۔

چنانچہ امام جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں :

الاحادیث التي رويت في تقبيل الانامل

وجعلها على العينين عند سماع اسمه صلى

الله عليه وسلم عن المؤذن في كلمة الشهادة

كلها موضوعات انتهى (تيسير المقال السيوطي بحوالہ عماد الدین سیوطی ص ۱۳۲)

لیجئے اب تو قصہ ہی ختم ہو گیا۔ مفتی احمد یار خان صاحب کو یہ الفاظ دیکھ کر غور کرنا چاہیے کہ "الحمد لله

کہ اس اعتراض کے پرچے اڑ گئے ہیں اور حق واضح ہو گیا۔" (بلفظہ جارالحق ص ۳۸۲)۔ پرچے کس کی دلیل کے اڑ

گئے اور حق کس کی طرف سے واضح ہو گیا ہے؟ عیاں راچہ بیاں طر

ظلمت کے بھیانک ہاتھوں سے تنویر کا دامن چھوٹ چکا

امام سیوطی کے کلہا موضوعات کے حوالہ کے بعد یہ ضرورت تو نہیں کہ ہم کچھ عرض کریں مگر محض

تکمیل فائدہ کے لئے حضرت نضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روایت کا ذکر بھی کر دیتے ہیں۔ اسی مضمون کی روایت

حضرت نضر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بھی منقول ہے مگر اس کے الفاظ یہ ہیں :

ثم يقبل ابهاميه۔ (الحديث) پھر اپنے دونوں انگوٹھے چومے۔

پہلی روایت میں انگوٹھوں کا ذکر نہیں بلکہ شہادت کی انگلیوں (اور ایک روایت میں ابہام

اور سباحتہ) کا ذکر تھا اور وہ مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کے باب یا سُرخِی کے مطابق نہ تھی مگر یہ روایت مطابق ہے۔ یہ روایت موضوعات کبیر ص ۱۵۱ اور تذکرۃ الموضوعات ص ۳۱ وغیرہ میں ہے اور مفتی احمد یار خان صاحب نے مقاصدِ حسنہ کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ (جاء الحق ص ۳۱) اور مولوی محمد عمر صاحب نے طحاوی ص ۱۲۱ کے حوالہ سے نقل کی ہے (مقیاس ص ۶۰)۔ لیکن علامہ محمد طاہر اور ملا علی نقاری لکھتے ہیں:

بسند فیہ مجاہیل مع انقطاعہ الخ کہ اس کی سند میں کئی مجہول راوی ہیں، اور سند (تذکرہ ص ۳۱ و موضوعات ص ۱۵۱) بھی منقطع ہے۔

تو اس ضعیف روایت سے دین کیسے اخذ کیا جاسکتا ہے؟ امام بیہقی ایک مقام پر لکھتے ہیں کہم
 فی هذا الاسناد قوم مجہولون ولم یكلفنا اللہ
 تعالیٰ ان نأخذ دیننا عن لا نعرفہ (کتاب القراءۃ ص ۱۲)
 کہ اس سند میں کئی راوی مجہول ہیں اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس کا
 مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین مجہول راویوں سے اخذ کریں۔

انگوٹھے چومنے کا ایک اور وزنی ثبوت | مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں:

”صدر الافاضل مولانا مرشدی استاذی مولانا الحاج سید محمد نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی
 دام ظلہم فرماتے ہیں کہ ولایت سے انجیل کا ایک بہت پرانا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل بربناس آج کل
 وہ عام طور پر شائع ہے اور ہر زبان میں اس کے ترجمے کئے گئے ہیں۔ اس کے اکثر احکام اسلامی احکام
 سے ملتے جلتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے روح القدس (نورِ مصطفوی) کے دیکھنے
 کی تمنا کی تو وہ نور ان کے انگوٹھوں کے ناخنوں میں چمکایا گیا۔ انہوں نے فرطِ محبت سے ان ناخنوں کو چوما
 اور انگوٹھوں سے لگایا۔ (جاء الحق ص ۳۱ و ص ۳۸)۔ مولوی محمد عمر صاحب نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور انجیل
 بربناس کا صفحہ بھی دیا ہے (انجیل بربناس ص ۳) اور عبارت بھی نقل کی ہے جو اغلب ہے کہ انجیل بربناس کی
 ہی عبارت ہوگی۔ اس میں یہ بھی ہے کہ پس آدم علیہ السلام نے بمنت یہ کہا کہ اے پروردگار یہ تحریر مجھے میرے
 ہاتھ کی انگلیوں کے ناخنوں پر عطا فرما۔ تب اللہ نے پہلے انسان کو یہ تحریر اس کے دونوں انگوٹھوں پر عطا
 کی (پھر آگے ہے) تب پہلے انسان نے ان کلمات کو پوری محبت کے ساتھ بوسہ دیا اور اپنی دونوں انگوٹھوں
 سے ملا۔ (مقیاس حقیقت ص ۶۰)۔

اب بھی اگر کوئی شخص انگوٹھے نہ چومے تو اس کی مرضی۔ یہ تو بقول مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ، قومی حدیثوں اور حضرات صوفیاء کرام اور حضرات فقہاء سے ثابت ہے بلکہ عیسائیوں سے بھی ثابت ہے اور انجیل برنباس کی بین شہادت ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! غیر مسلموں کی بات کو اپنی تائید میں پیش کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اصل چیز کسی معتول طریقہ سے اسلام سے بھی تو ثابت ہو۔ جب انگوٹھے چومنے کی سب حدیثیں ہی موضوع اور جعلی ہیں تو پھر اصل کیا اور اس کی تائید کیا؟ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سابق زمانہ میں عیسائیوں کی اقتدار کرتے ہوئے کسی نے اسی انجیل برنباس کو پیش نظر رکھ کر یہ جعلی حدیثیں بنا ڈالی ہیں اور یار لوگوں نے ان کو پتے باندھ لیا ہے، اور دوسروں سے یوں مخاطب فرماتے ہیں کہ "انشاء اللہ کراہت کے لئے صحیح حدیث تو کیا، ضعیف بھی نہ ملے گی، صرف یاروں کا اجتہاد اور عداوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے"۔ (جاء الحق بلفظہ ص ۳۸۴) لاجل ولا قوۃ الا باللہ! معاذ اللہ تعالیٰ، تم معاذ اللہ تعالیٰ۔

دیکھا آپ نے اہل بدعت حضرات کو کہ دعویٰ کرتے وقت تو گاؤں زبان مگر ثبوت پیش کرتے وقت ریشہ نعلی مفتی صاحب کو اس کا علم ہونا چاہیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی چیز کو ترک کرنا بھی سنت ہے اور آپ کا عدم فعل بھی حضرات فقہاء کرام کے نزدیک کراہت کی دلیل ہے اور یہ صرف یاروں کا اجتہاد نہیں بلکہ ان کے پاس سو فیصدی محدثین کا طے شدہ قاعدہ ہے کہ جعلی اور موضوع حدیث قابل عمل نہیں ہے مفتی صاحبی فرمائیں کہ کیا جعلی اور موضوع حدیث کو سلیم کرنے اور اس کی ترویج سے عداوت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہوتی ہے یا جعلی حدیث کے انکار سے؟ اس کا جواب مفتی صاحب پر موقوف ہے، جیسا مناسب سمجھیں ارشاد فرمائیں۔

کفتی یا الفی لکھنے کا بیان

میت کو غسل دینے کے بعد اس کو سنت کے مطابق کفن پہنانا احادیث سے ثابت ہے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ بطور تبرک کسی کے کفن میں کوئی کپڑا رکھا جائے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت زینب کے لئے اپنا تہ بند عطا فرمایا تھا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ کسی بزرگ سے کوئی کپڑا لے کر اپنے کفن

کے لئے اس کو رکھ لیا جائے جیسا کہ بخاری باب من اعدا الکفن میں اس کے متعلق حدیث آتی ہے۔ اسی طرح حضرت علیؑ اور حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تبرکات کو اپنی قبروں میں کھولنے کی وصیت اگر بسند صحیح ثابت ہو تو تسلیم کرنے میں کوئی تاثر نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ایک دو نہیں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے فوت ہوئے اور دفن کئے گئے۔ اسی طرح حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ و تبع تابعینؓ کے سامنے بھی ہوتا رہا۔ کفن بھی لوگ مڑوں کو پہناتے تھے اور لکھنا بھی جانتے تھے۔ ان کو کلمہ طیبہ بھی ہم سے بدرجہا زیادہ اچھا یاد تھا اور ان کے دلوں میں اس کی صحیح معنی میں عظمت بھی تھی۔ اسی طرح درود شریف وغیرہ اور سبح و تہلیل وغیرہ سبھی کچھ ان کو حفظ تھا، اور ان کو قبر اور آخرت کا صحیح حال بھی معلوم تھا اور اپنے اعزہ و اقارب کا تو ذکر ہی چھوڑتے۔ اہل محلہ میں سے اگر کوئی فوت ہو جاتا تو کسی کسی دن تک وہ اس غم میں مبتلا رہتے تھے کہ خدا معلوم اس کے ساتھ قبر میں کیا ہوا ہوگا؟ الغرض ان میں کامل ہمدردی بھی تھی اور فکرِ آخرت بھی۔ مع ہذا انہوں نے کفنی وغیرہ نہ لکھی اور نہ اس کا حکم دیا۔ پھر آج وہ کونسا نیا انقلاب رونا ہوا ہے جس کے تحت یہ سب کچھ جائز ہو گیا ہے؟ جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہو گیا ہے۔ چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں :

”لہذا میت کے لئے کفن وغیرہ پر ضرور عہد نامہ لکھا جاوے۔“ (بلفظ جبار الحق ص ۳۲۵)

کفنی اور الفی لکھنے کے جواز پر جو دلائل پیش کئے گئے ہیں، امام حکیم ترمذی کی نوادرا اصول سے جو مروع روایت نقل کی گئی ہے کہ جو شخص اس دُعا کو لکھے اور میت کے سینے اور کفن کے درمیان کسی کاغذ میں لکھ کر رکھے تو اس کو عذابِ قبر نہ ہوگا اور نہ منکر نکیر کو دیکھے گا (جبار الحق ص ۳۲۳)۔ اسی طرح طاؤس تابعیؓ سے بحوالہ ترمذی مذکور جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ ان کی وصیت کے بموجب ان کے کفن میں یہ کلمات لکھے گئے (جبار الحق ص ۳۲۴) یہ تمام بے حقیقت اور بے اصل باتیں ہیں۔ پہلے امام سیوطیؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ کسی روایت کا حکم ترمذیؒ وغیرہ کی طرف منسوب کر دینا ہی اس کے ضعیف اور کمزور ہونے کے لئے بالکل کافی ہے۔ باقی جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے سرکاری اصطلح کے گھوڑوں کی رانوں پر جس فی سبیل اللہ لکھا ہوتا تھا، باوجودیکہ گھوڑے کا نجاست میں آلودہ ہونے کا خطرہ بھی رہتا تھا، لہذا میت کے کفن پر لکھنا بھی درست ہے

(جبار الحق ص ۳۲۲) تویہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ سرکاری زندہ گھوڑوں پر نمبر لگانے سے میت کے کفن پر لکھنے کا اثبات مشکل اور دور کی بات ہے یہی وجہ ہے کہ امام ابن حجر نے اس کو روکیا ہے۔ باقی انکو شافعی کہہ کر اغماض کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیا امام ابن حجر شافعی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ غلط قیاس کو باطل کر دیں؟ اگر یہ دلیل اور قیاس صحیح ہوتا تو حضرت عمرؓ کے وقت اور بعد کو خیر القرون میں یہ قیاس لوگوں کو کیوں نہ سوجھا؟ کونسا نیا حادثہ اور مسئلہ درپیش ہوا ہے جس کے لئے یہ قیاس ایجاد کیا گیا ہے۔ اسی طرح شیخ عبدالحق صاحب کے والد حضرت سیف الدین صاحب جو صوفی مشرب آدمی تھے، ان کی وصیت سے استدلال بھی صحیح نہیں ہے خود شیخ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں "مشرب پر حجّت نیست دلیل از کتاب و سنت مے باید" (اخبار الاخبار ص ۹۳)۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جو حضرات پیشانی اور کفن پر لکھنے کی اجازت دیتے ہیں ان میں بعض اس کی بھی تصریح کرتے ہیں کہ یہ روشنائی سے نہ لکھا جائے بلکہ محض انگلی سے لکھا جائے۔ چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب شامی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ:

ان مٹا یکتب علی جہتہ المیت بغیر
مداد بالاصح المسبحة الخ (جبار الحق ص ۳۲۲) دیا جاوے۔

سیاہی وغیرہ سے لکھنے میں چونکہ بے ادبی کا احتمال ہے اس لئے بعض علماء نے منع کرنے کی یہ دلیل پیش کی ہے جیسے شاہ عبدالعزیز صاحب اور علامہ شامی وغیرہ اور ان کا حوالہ مفتی احمد یار خان صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب جہاں بزرگوں سے قبر میں شجرہ رکھنے کا واقعہ نکل کرتے ہیں اس میں اس کی تصریح کرتے ہیں کہ "بر سینہ مرورہ درون کفن یا بالائے کفن گذارند ایں طریق را فقہار منع مے کنند" (بحوالہ جبار الحق ص ۳۲۲) اس سے معلوم ہوا کہ کفن کے اوپر یا کفن کے نیچے میت کے سینہ پر کسی لکھی ہوئی چیز کا رکھنا حضرات فقہاء کرام کے نزدیک منع ہے۔ ہاں اگر قبر کے سرخانہ میں کوئی طاقتیہ ہو اور اس میں رکھا جائے تو حضرت شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ درست ہے۔ لیکن اس سے محل نزاع حل نہیں ہوتا کیونکہ جھگڑا کفنی اور الفنی لکھنے کا ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کہتے ہیں۔ در مختار میں اسی جگہ ایک واقعہ نقل فرمایا کہ کسی نے وصیت

کی تھی کہ اُس کے سینہ پر یا پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کیا گزری؟ اُس نے کہا کہ بعد دفن ملائکہ عذاب آئے مگر جب انہوں نے بسم اللہ لکھی ہوئی دیکھی تو کہا کہ تو عذابِ الہی سے بچ گیا۔ (بلفظہ جبار الحق ص ۳۲۲)

عذابِ الہی سے اور فرشتوں کے جھگڑے سے بچنے کا یہ بہت ہی عمدہ نسخہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ طریقہ خیر القرون میں کسی کو کیوں نہ سوجھا؟ اور ان کو ایسا مبارک خواب کیوں نہ آیا؟ پھر یہ بھی قابلِ غور امر ہے کہ خواب سے دین کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

”اجماع اہل شرع است برآنکہ بیچ حکم از احکام
شرعیات بواقعات و منامات امتیان ثابت
نمے شو۔ (قرۃ العینین ص ۳۲۶)

اہل شرع کا اس بات پر اجماع ہے کہ شریعت کے حکموں
میں سے کوئی بھی حکم واقعات اور امتیوں کے خوابوں
سے ثابت نہیں ہو سکتا۔

غرضیکہ جو کام آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین نے نہیں کیا باوجودیکہ اس کا سبب موجود تھا، آج بھی اس کے کرنے کی مطلقاً کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ کسی صوفی کا کوئی قول و فعل اور خواب معتبر ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں، کہ

”نصیر الدین محمود چرخ دہلوی، خلیفہ نظام الدین گفتہ است فعل مشائخ حجت نہ باشد۔ (البلاغ المبین ص ۵۵)

منسوب بشاہ ولی اللہ صاحب۔ بعض حضرات نے ان کی کتاب ہونے کا انکار بھی کیا ہے۔

بدنی اور مالی طریقہ پر ایصالِ ثواب کا حکم

جمہور اہل اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ میت کے لئے ایصالِ ثواب درست اور جائز ہے، خواہ بدنی عبادت ہو خواہ مالی ہو۔ البتہ بدنی عبادت میں (مثلاً نماز، روزہ اور تلاوتِ قرآن کریم وغیرہ) حضرت

علہ مولانا عبد المجید صاحب غیر مقلد تحریر فرماتے ہیں کہ ”مروجہ ختم بدعت ہے۔ ہاں اگر خاموشی سے بلا یا صدقہ کیا جائے خصوصاً صدقہ جلدیہ وغیرہ تو اس کا ثواب میت کو پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح تلاوتِ قرآن کریم کا بھی انتہی بلفظہ (اہلحدیث)۔“

۸ ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۳۱۔ اور ثواب صاحب لکھتے ہیں۔ ”وہ دن اس تلاوتِ مجعول از برائے میت

امام مالک اور حضرت امام شافعی اختلاف کرتے ہیں (شرح فقہ اکبر ص ۱۵۱ و کتاب الروح ص ۱۵۱ وغیرہ) مگر اکثر حضرات شوافع اور حضرات موالک اس مسئلہ میں دیگر ائمہ کا ساتھ دیتے ہیں۔ حافظ ابن القیم نے کتاب الروح از ص ۱۴۱ تا ص ۱۴۲ میں اس کی نقلی اور عقلی طور پر مبسوط بحث کی ہے۔ حق اور اقرب الی القلوب یہی بات ہے کہ بدنی اور مالی ہر قسم کی عبادت کا ثواب میت کو پہنچایا جاسکتا ہے مگر اس کیلئے چند بنیادی اور اصولی شرطیں ہیں۔ جب تک وہ نہ ہوں کوئی فائدہ نہیں ہوگا :

① میت مؤمن اور مسلمان و صحیح العقیدہ ہو، گو کلتی ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، اور اسی طرح ایصالِ ثواب کرنے والا بھی مؤمن اور مسلمان ہو، ورنہ سب محنت رائیگاں ہوگی۔

② ایسی کسی عبادت میں ریا، نام و نمود و شہرت اور اپنی مصنوعی عزت اور ناک کی حفاظت کا ہرگز سوال نہ ہو اور نہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کا خیال ہی دل میں ہو، اور خیرات حق و اذی سے بھی پاک ہو۔

③ جو مال صدقہ و خیرات میں دیا جائے وہ حلال اور طیب ہو، نجیث، ناپاک اور غلول وغیرہ کا غیر طیب مال ہرگز نہ ہو جیسا کہ قرآن کریم، صحیح احادیث اور اقوال حضرات فقہاء کرام سے یہ بالکل واضح ہے۔

④ جس مال کا صدقہ اور خیرات دی جائے اُس میں کوئی وارث غائب اور نابالغ بچہ نہ ہو، ورنہ اس کا صدقہ کرنا بلا خلاف حرام اور موجب عذابِ خداوندی ہے۔

⑤ جو قرآن کریم میت کو پڑھ کر بخشا جائے وہ بلا معاوضہ اور بلا اجرت پڑھا جائے۔

⑥ اپنی طرف سے نول کی اور خاص کنفیتوں کی تعیین نہ کی جائے اور نہ کھانے کے اقسام میں یہ تعیین ہو۔

⑦ یہ کھانا صرف فقراء اور مساکین کو دیا جائے، برادری کو اور اغنیاء کو نہ کھلایا جائے۔

ان میں بعض ایسے امور ہیں جن میں کسی ادنیٰ کلمہ گو کو بھی شک و شبہ نہیں ہو سکتا، اور ان کا ثبوت قرآن کریم اور صحیح احادیث سے بخوبی واضح ہے۔ بعض دعاوی کے اختصاراً دلائل سن لیجئے۔

قرآن کریم میں آتا ہے کہ لَا تَيْتَمُّوا النَّجْثَ اور ناپاک اور روی چیز اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نہرہج کرنے کی کوشش نہ کرو۔ حدیث شریف میں آتا ہے لَا يَقْبَلُ اللَّهُ صَدَقَةً مِنْ غُلُولٍ

(ترمذی ج ۱ ص ۱) یعنی اللہ تعالیٰ حرام مال سے صدقہ قبول نہیں کرتا اور حضرت ملا علی نقاری لکھتے ہیں :
 ولو علم الفقير انه من الحرام ودعا له وامن المعطى كفرا -
 یعنی اگر فقیر کو معلوم ہو کہ یہ مال جو مجھے دیا جا رہا ہے حرام ہے اور اُس نے دینے والے کے حق میں دُعا کی اور دینے والے نے آمین کہی تو دونوں کافر ہو جائیں گے۔
 (شرح فقہ اکبر ص ۱۳۱ کانپوری)

اور یہی عبارت فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۲۹۹ میں بھی موجود ہے۔

امام قاضی خاں لکھتے ہیں :

وان اتخذ طعاما للفقراء كان حسنا اذا كانوا بالغين فان كان في الوثرة صغيرا لم يتخذوا ذلك من التركة - (قاضی خاں ج ۲ ص ۱۸۱ نوکشور)
 کہ اگر میت کے ترکہ سے فقراء کیلئے کھانا تیار کر لیا جائے تو اچھا ہوگا جبکہ وارث سب بالغ ہوں اور اگر وارثوں میں کوئی ایک بھی نابالغ ہو تو ترکہ سے یہ کھانا تیار نہیں کیا جاسکتا۔

اور علامہ شامی لکھتے ہیں :

محدث جریریدل علی الكراهة ولا سيما اذا كان في الوثرة صفارا وغائب (شامی ج ۱ ص ۸۴)
 حضرت جریر کی روایت کراہت پر دلالت کرتی ہے خصوصاً جبکہ وارثوں میں چھوٹے بچے یا کوئی وارث غائب ہو۔

اور ملا علی نقاری لکھتے ہیں کہ :

بل صح عن جریر كذا نعدا من النياحة وهو ظاهر في التحريم قال الغزالي ويكره الاكل منه قلت هذا اذا لم يكن من مال اليتيم والغائب والا فهو حرام بلا خلاف - (مرقات علی المشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۱)
 بلکہ حضرت جریر کی حدیث سے ثابت ہے کہ میت کے ہاں سے کھانے کو حضرات صحابہ کرامؓ توجہ کی طرح سمجھتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا کھانا حرام ہے۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ ایسا کھانا مکروہ ہے۔ میں کہتا ہوں یہ کراہت اس وقت ہوگی، جب کہ میت کے وارثوں میں کوئی نابالغ یا غائب نہ ہو ورنہ یہ بلا اختلاف حرام ہوگا۔

ان عبارات سے یہ بات بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ میت کے وارثوں میں اگر سب ہی بالغ اور حاضر ہوں تب بھی ایسا کھانا مکروہ ہے بلکہ بظاہر حرام ہے، اور اگر میت کے وارثوں میں کوئی نابالغ یا کوئی وارث

غائب ہو تو بالاتفاق ایسا کھانا حرام ہوگا اور فقرام کے لئے بھی ایسا کھانا ناجائز ہوگا۔
 خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں :

” غالباً ورثہ میں کوئی یتیم یا اور بچہ نابالغ ہوتا یا بعض ورثہ موجود نہیں ہوتے، نہ ان سے اس کا
 اذن لیا جاتا جب تو یہ امر سخت حرام شدید پر متضمن ہوتا ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ
 أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا۔ بے شک جو لوگ یتیموں
 کے مال ناحق کھاتے ہیں، بلاشبہ وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں اور قریب ہے کہ جہنم کے گہراؤ میں
 جائیں گے۔ مال غیر میں بے اذن غیر تصرف خود ناجائز ہے۔ قال اللہ تعالیٰ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم
 بِالْبَاطِلِ خُصُوصًا نَابَالِغٍ كَمَا مَالٌ ضَائِعٌ كَمَا جِسٌّ كَاخْتِيَارٌ نَحْوِ دُاسٍ نَحْوِ اس کے باپ نہ اس کے وصی کو۔
 لان الولاية للنظره للضرر على الخصوص اگر ان میں کوئی یتیم ہو تو آفت سخت تر ہے والعیاذ باللہ رب
 العالمین۔ ہاں اگر محتاجوں کے دینے کو کھانا پکوانیں تو حرج نہیں بلکہ خوب ہے بشرطیکہ یہ کوئی عاقل بالغ
 اپنے مال خاص سے کرے یا ترکہ سے کرے تو سب وارث موجود بالغ و نابالغ راضی ہوں (احکام شریعت حصہ
 سوم ص ۱۹۲)۔ خان صاحب کی یہ عبارت قابلِ داد ہے۔ مگر ان کا یہ مجذبانہ مغالطہ قابلِ غور ہے کہ جب نابالغ
 کو اپنے مال کا باقرار خان صاحب خود بھی اختیار نہیں تو پھر بالغ و نابالغ راضی ہوں کا کیا مطلب ہے؟
 نابالغ کی رضا کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء احناف نے تصریح کی ہے :

لَا تَجُوزُ وَصِيَّةُ الصَّبِيِّ إِذَا لَمْ يَكُنْ
 مَرَاهِقًا عِنْدَنَا۔ (قاضی خان ج ۲ ص ۸۳)
 یعنی نابالغ لڑکے کی وصیت ہمارے نزدیک جائز نہیں،
 ہے جبکہ مراهق نہ ہو۔

اور سراجیہ ص ۱۲۱ میں ہے :

وصية الصبي باطلة۔
 نابالغ کی وصیت باطل ہے۔

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں :

”جب کوئی آدمی مر جاوے اور کوئی شخص اس کا عزیز و قریب اپنے خاص مال میں سے اس کے لئے فاتحہ
 کرے۔ اس میں کسی فقیہ و محدث کو کلام نہیں اور خاص وصیت کا مال اگر اس کام میں صرف کرنے لگیں تو اس میں

یہ شرط ہے کہ اس کے وارثوں میں کوئی نابالغ لڑکی یا لڑکا نہ ہو، اس لئے کہ ترکہ بعد مرنے مورث کے ملک وارثوں کا ہو جاتا ہے۔ پس اگر وارث بالغ ہیں تو وہ مال خاص ان کا ہو گیا۔ اگر کوئی وارث ان میں غائب نہیں، سب موجود ہیں یا کوئی غائب تھا اور اس نے اجازت دے دی تو اس صورت میں ان کو اختیار ہے جس قدر چاہیں میت کے لئے صرف کر دیں، اور اگر سب نابالغ ہیں تو ترکہ میت سب ان کی ملک ہو گیا۔ اس کا صرف کر دینا میت کے ایصالِ ثواب میں جائز نہیں، نہ کپڑا، نہ کھانا، نہ روپیہ نہ پیسہ۔ فقط تجہیز و تکفین میں جو اٹھے وہی درست ہے اور بس۔ اور اگر بعض وارث نابالغ ہیں تب بھی نابالغوں کا حصہ کل اشیاء ترکہ میں مشترک ہے اس کا صرف کرنا بھی ایصالِ ثواب کے لئے جائز نہیں الخ۔ (انوار ساطعہ ص ۱۲۵)

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ :

”نیز اگر میت کی فاتحہ میت کے ترکہ سے کی ہو تو خیال رہے کہ غائب وارث یا نابالغ کے حصے سے فاتحہ نہ کی جاوے یعنی اولاً مالِ میت تقسیم ہو جائے، پھر کوئی بالغ وارث اپنے حصہ سے یہ امور خیر کرے۔ ورنہ یہ کھانا کسی کو بھی جائز نہ ہوگا کہ بغیر مالک کی اجازت یا بچہ کا مال کھانا جائز ہے۔ یہ ضرور خیال رہے۔“ (جاء الحق ص ۲۵۶)

مگر مفتی صاحب بھی جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایک فیصد می تیجہ، ساتواں، دسواں اور چالیسواں وغیرہ بھی شاید مشکل ایسا ہو جس میں شرعی طور پر مالِ ترکہ تقسیم ہو چکنے کے بعد بالغ وارث صرف اپنے حصہ سے یہ صدقہ کرتے ہوں۔ اور کتنے مولوی، حافظ اور پیر ہیں جو تیجہ، ساتواں اور دسواں وغیرہ مجالس میں شریک ہونے سے قبل یہ سوال کر لیتے ہیں، کہ اس ترکہ میں کوئی نابالغ یا غائب وارث تو شامل نہیں اور کیا اس کی شرعی تقسیم ہو چکی ہے یا نہیں؟

تلاوتِ قرآنِ کریم پر اجرت لینا

قرآنِ کریم کا پڑھنا ایک بہت عمدہ عبادت ہے، اور پڑھ کر اس کا ثواب میت کو بخشا جاسکتا ہے بشرطیکہ ایصالِ ثواب کے لئے جو قرآنِ کریم پڑھا گیا ہو اس پر اجرت نہ لی گئی ہو، خواہ اجرت پہلے

طے کی گئی ہو یا طے نہ کی گئی ہو مگر عرف اور رواج سے یہ معلوم ہو کہ کچھ نہ کچھ اُجرت ضرور ملے گی لان المہود
کامل بشرط، اور فقہاء احناف نے اس کی وضاحت کی ہے۔ پختا نچہ تاج الشریعت محمود بن احمد الحنفی ج
(المتوفی ۶۷۳ھ) شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں :

ان القرآن لا يستحق بالاجرة الثواب
لا للمیت ولا للقاری (بحوالہ انوارِ ساھلہ ص ۱۸)
اور علامہ عینی الحنفی لکھتے ہیں کہ :

کہ جو قرآن کریم اُجرت پر پڑھا جاتا ہے اس کا ثواب
نہ تو میت کو پہنچتا ہے اور نہ پڑھنے والے کو۔

الاعتد والمعطى اثمان، فالحاصل
ان ماشاع فى زماننا من قراءة الاجزاء
بالاجرة لا يجوز۔
قرآن کریم کی تلاوت پر اُجرت لینے والا اور دینے والا دونوں
گنہگار ہوتے ہیں۔ حاصل یہ کہ ہمارے زمانہ میں جو قرآن کریم
کے پاروں کا اُجرت کے ساتھ پڑھنا رائج ہو چکا ہے، وہ

(بنایہ شرح ہدایہ ج ۳ ص ۱۵۵) جائز نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی پوری تشریح علامہ شامی نے کی ہے، قلیو اجمع۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی تلاوت قرآن کریم پر اُجرت لینے کی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :
صورتِ اول انکہ ثواب قرآن خواندہ خود را بعوض مبلغ کذا بدست کسے بفروشد و این
صورت محض باطل است باجماع اہل سنت الی ان قال صورتِ دوم انکہ شخصے را برائے
ختم نمودن قرآن بزور بی بگزند و ثواب آن ختم بمستاجر برسد و این صورت نزد حنفیہ جائز
نیست و نزد شافعیہ طولے و تفصیلے دارد۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۸)

اور مولانا عبدالحی صاحب نے حضرات فقہاء کرام کے متعدد حوالوں سے یہ امر ثابت کیا ہے کہ اُجرت
لے کر قرآن کریم پڑھنا اور بیع و تہلیل کرنا باطل ہے۔ نہ اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور نہ پڑھنے والے
کو۔ (دیکھئے مجموعۃ الفتاویٰ ج ۲ ص ۸۷)۔

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ :

واما قراءة القرآن واهدائها له تعلوفا
قرآن کریم کا اُجرت کے بغیر پڑھ کر بطور تبرع کے اس کا ثواب

میت کو بخشنا صحیح ہے اور اس کا ثواب اس کو پہنچتا ہے
جیسا کہ روزہ اور حج کا ثواب اس کو پہنچتا ہے۔

بغیر أُجْرَةٍ فَمَا يَصِلُ إِلَيْهِ كَمَا يَصِلُ
ثَوَابُ الصَّوْمِ وَالْحَجِّ - (کتاب الروح ص ۱۷۱)
حضرت ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ :

قرآن مجید کا بغیر اُجرت کے محض لٹہ پڑھ کر اس کا ثواب
میت کو پہنچ کر نادرست ہے۔

ثم قراءة القرآن واهدائها له تطوعا بغیر
أجرة يصل اليه - (شرح فقہ اکبر ص ۲۱۷ طبع کراچی)

علامہ صدر الدین علی بن محمد الاذری المشقی الحنفی (المتوفی ۱۰۲۶ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ :

اُجرت پر قرآن کریم کی تلاوت کر کے اس کا ثواب میت
کو پہنچ کرنا، تو سلف میں سے کسی ایسا نہیں کیا اور حضرت
ائمہ دین میں سے کسی نے اس کا حکم اور اجازت دی ہے۔
نفس تلاوت پر اُجرت ناجائز ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف
نہیں ہے۔

و اما استیجار قوم یقرأون القرآن ویهدونه
للمیت فهذا لم یفعله احد من السلف ولا
امر به احد من ائمة الدین ولا سرتخص فيه
والاستیجار عن نفس التلاوة غیر جائز بلا
خلاف - (شرح عقیدة الطحاویہ ص ۳۸۱ طبع مصر)

بجا معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب بریلوی کا حوالہ نقل کر دیا جائے تاکہ اس پر رجسٹری ہو جائے۔
مسئلہ : بعض لوگ بعد دفن کر دینے میت کے حافظ کو اس کی قبر پر واسطے تلاوت
سوم تک یا کچھ کم و بیش بیٹھاتے ہیں اور وہ حافظ اپنی اُجرت لیتے ہیں۔ پس اس طرح کی اُجرت دے کر
قبروں پر پڑھوانا چاہیے یا نہیں ؟ بتینوا توجروا۔

الجواب : تلاوت قرآن عظیم پر اُجرت لینا دینا حرام ہے اور حرام پر استحقاق عذاب ہے ،
کہ ثواب پہنچے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ حافظ کو اتنے دنوں کے لئے معین داموں پر کام کان کیلئے نوکر رکھ لیں۔
پھر اس سے کہیں ایک کام یہ کرو کہ اتنی دیر قبر پر پڑھ آیا کرو، یہ جائز ہے۔ (احکام شریعت حصہ اول ص ۶۳)
مگر خان صاحب ہی از راہِ کرم یہ فرمائیں کہ یہ طریقہ کون کرتا ہے ؟ اور کہاں ہوتا ہے ؟
مولوی عبدالسمع صاحب لکھتے ہیں : "اگر حافظوں کو مزدوری دے کر قرآن پڑھواویں یہ البتہ مکروہ
ہے۔ اس کی تصدیق کتب فقہ میں موجود ہے الخ۔ (انوار بساطہ ص ۱۰۱)۔ جوہرہ نیوہ ج ۱ ص ۲۷ میں ہے

”لايجوز هو المختار“ یہ جائز نہیں ہے یہی مختار ہے۔ بہار شریعت ۱۳۹ میں ہے۔ یوم وغیرہ کے موقع پر اجرت پر قرآن پڑھوانا جائز ہے۔ دینے والا لینے والا دونوں گنہگار۔ اہ اور ۱۶۹ میں ہے۔ میت کے گھر والے تیرے وغیرہ کے دن دعوت کریں تو ناجائز و بدعت قبور ہے الخ۔ رسالہ ضنوان ۶۲ بابت ماہ اگست و ستمبر ۱۹۰۸ء میں ہے۔ میت کے گھر کا کھانا ناجائز و ممنوع ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے:-

”پس جو کچھ ملاؤں کو دیا جاتا ہے وہ اجرت ان کے پڑھنے کی ہے، اور جو پڑھائی کہ اجرت پر ہوتی ہے اس کا ثواب نہ پڑھنے والے کو ہوتا ہے اور نہ مردہ کو۔ لہذا یہ فعل ان کا باطل اور لینا دینا دونوں حرام اور موجب ثواب کا نہیں بلکہ گناہ ہے۔ مردہ کو اس کا ثواب نہیں ہوتا ہے اور دینے والے اور لینے والے دونوں گنہگار ہوتے ہیں۔ لہذا اس کلم کا ترک بھی واجب ہے۔ اگر لوجہ اللہ ثواب پہنچانا منظور ہے تو ہر شخص اپنے مکان پر پڑھ کر ثواب پہنچا دے اور تیسرے دن کا کیوں انتظار کیا جاوے نفس ایصالِ ثواب کوئی منع نہیں کرتا۔ اگر بلا تعین ہو۔ مگر ان قیود و خصوصیات کے ساتھ بدعت بھی ہے اور ثواب بھی نہیں پہنچتا“ (فتاویٰ رشیدیہ ص ۸۴)

الغرض اس نکتہ پر خان صاحب بریلوی اور مولانا گنگوہی صاحب دونوں متفق ہیں کہ ایصالِ ثواب کے لئے جو قرآن کریم پڑھا جاتا ہے اس پر اجرت لینا دینا دونوں حرام ہیں اور ثواب کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اس پر استحقاق عذاب ہے۔ اب جو لوگ اس مسئلہ میں علماء دیوبند کو کوستے ہیں، تو ان کو بخور سوچ لینا چاہیے کہ طعن کس پر ہوگا؟

یوں نظر دوڑے نہ بر چھی تان کر اپنا بیگانہ ذرا بہ چپان کر

نوٹ ضروری | قرآن کریم کی تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کے معاوضہ میں اجرت اور تنخواہ لینا نیز مؤذن، امام و خطیب اور قاضی کے لئے اجرت و تنخواہ لینا جائز ہے۔ حضرات خلفاء راشدین نے اپنے اپنے دور میں ان حضرات کو وظیفے اور تنخواہیں دیں۔ اگر یہ کارروائی ناجائز ہوتی تو یقیناً حضرات خلفاء راشدین اس کا کبھی بھی ارتکاب نہ کرتے۔ اور حضرات خلفاء راشدین کا عمل اور سنت بقوائے حدیث علیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدین (الحدیث) امت کے لئے مشعل راہ ہے جس سے ان کیلئے کوئی مخلص نہیں ہے۔ امام ابوالفرج عبدالرحمن ابن جوزی کتبلی (المتوفی ۷۹۷ھ) لکھتے ہیں کہ:

ان عمر بن الخطاب و عثمان بن عفان کان حضرت عمر بن الخطاب اور عثمان بن عفان مؤذنون

یزقان المؤمنین والائمة والمعلمین - اماموں اور معلموں کو وظائف اور تنخواہیں دیا کرتے

(سیرت العمرین لابن جوزی ص ۱۶۵) تھے۔

امام جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف الزلیعی الحنفی (المتوفی ۱۱۳۵ھ) نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ معلمین کو وظیفہ دیا کرتے تھے (نصب الرایہ ج ۴ ص ۱۳۱)۔ حضرات فقہاء کرام کے وظائف کے متعلق علامہ ابن جوزی نے تفصیلات نقل کی ہیں اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ کس فقیہ کو کس شہر میں تعلیم فقہ پر مامور کیا گیا تھا (سیرت العمرین ص ۱۶۸)۔ اور نظام العالم والامم ج ۲ ص ۱۵۱ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قضاة (یعنی شرعی طور پر جھگڑوں میں فیصلہ کرنے والے قاضیوں اور ججوں) کے لئے بھی وظائف اور تنخواہیں مقرر کی تھیں۔ اور کتاب الخراج قاضی ابی یوسفؒ میں اس کی مزید تشریح موجود ہے اسی میں ملاحظہ فرمائیں۔

امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ (المتوفی ۲۲۲ھ) رقم طراز ہیں کہ:

ان عمر بن الخطاب کتب الی بعض عماله ان اعط الناس علی تعلم القرآن (کتاب الاموال ص ۲۶) پڑھنے والوں کا وظیفہ مقرر کرو۔

اس پر بعض عمال نے یہ لکھا کہ بعض لوگوں نے قرآن کریم سیکھنے کی رغبت اور شوق کے بغیر محض وظیفہ حاصل کرنے کی خاطر طالب علم بننا اختیار کر لیا ہے، مگر حضرت عمرؓ نے اس کے باوجود ان لوگوں کا وظیفہ بند نہیں کیا۔ اور علامہ زلیعیؒ یا حوالہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

ان عمر بن الخطاب کتب الی بعض عماله ان اعط الناس علی تعلیم القرآن (نصب الرایہ ج ۴ ص ۱۳۱) حضرت عمرؓ نے اپنے بعض عاملوں کو لکھا کہ جو لوگ قرآن کریم کی تعلیم دیتے اور پڑھاتے ہیں ان کو وظیفہ دو۔

خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت یزید بن ابی مالکؒ اور حضرت حارث بن مجذاشعریؒ کو بھیجا کہ وہ دیہات میں لوگوں کو دین اور فقہ سکھائیں اور ان کے لئے روزانہ مقرر کیا۔ یزید بن ابی مالکؒ نے تو قبول کر لیا مگر حارثؒ نے وظیفہ لینے سے انکار کر دیا (کتاب الاموال ص ۲۶) بظاہر ان کی مالی حالت اچھی اور مضبوط تھی اس لئے انہوں نے بلا معاوضہ ہی یہ خدمت انجام دی جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ بیت المال سے وظائف لیا کرتے تھے لیکن حضرت عثمانؓ چونکہ کافی مال دار اور غنی تھے اس لئے انہوں نے

زمانہ نماز میں اپنی تہا طربیت المال پر بالکل بوجھ نہیں ڈالا۔

قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی المالکی (المتوفی ۳۸۳ھ) اس مسئلہ پر بحث اور اختلاف نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ اذان، نماز، قضا اور تمام اعمال و نیبہ پر اجرت لینا جائز ہے، کیونکہ امیر المؤمنین اور خلیفہ ان تمام امور پر اجرت لیتا ہے (بحوالہ نیل الاوطار ج ۲ ص ۱۸۱ و تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۱۸۱)۔ حضرت امام نووی الشافعی فرماتے ہیں کہ حدیث واضح بوالی بسمیہ (الحدیث) میں تصریح ہے کہ رقیہ دم اور جھاڑ پھونک پر سورہ فاتحہ اور ذکر پڑھ کر اجرت لینا جائز ہے اور یہ بالکل حلال ہے اس میں کوئی کدہت نہیں۔ اور اسی طرح تعلیم قرآن کریم پر بھی اجرت لینا جائز ہے۔ اور یہی حضرت امام شافعی، حضرت امام مالک، حضرت امام احمد، حضرت امام اسحاق، حضرت امام ابو ثور اور دیگر حضرات سلف صالحین اور ان کے بعد آنے والے حضرات کا مسلک ہے۔ اور حضرت امام ابو حنیفہ نے تعلیم قرآن کریم پر اجرت لینا منع کیا ہے البتہ رقیہ پر اجرت لینے کے جواز کے وہ بھی قائل ہیں (شرح مسلم ج ۲ ص ۱۲۲)۔ ان تمام ٹھوس حوالوں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ امام مسجد، مؤذن، قرآن کریم کی تعلیم دینے والا معلم اور قاری، فقہ اور دین کی تعلیم دینے والا مدرس اور اسی طرح فصل خصوصیات کرنے والا قاضی اور حج و طیفہ اجرت اور تنخواہ لے سکتے ہیں اور حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ جیسے حضرات خلفاء راشدین کی طرف سے یہ وظائف اور تنخواہیں ان کے لئے مقرر کی گئی تھیں اور اسلامی مملکت میں بیت المال اس بوجھ کا متحمل تھا۔ جہاں بیت المال نہ ہو (جیسا کہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے اس پرفتن دور میں نہیں ہے) تو وہاں اہل اسلام پر لازم ہے کہ وہ یہ بوجھ اٹھائیں تاکہ تبلیغ دین کا سلسلہ جاری رہے اور اس طریقہ سے دین کا احیاء ہوتا رہے ورنہ ناموافق ہواؤں میں دین کا یہ چراغ بجھ جائے گا۔ خدا تعالیٰ اس کو روشن رکھے اور نیکے نردے بے دینی کی آندھیاں تو ہر طرف سے اٹھ رہی ہیں۔

ہواؤں کا رخ بتا رہا ہے ضرر طوفان آ رہا ہے نگاہ رکنا سفینہ والو اٹھی ہیں موجیں کدھر سے پہلے

مسئلہ اجرت اور حضرت امام ابو حنیفہ | حضرت امام نووی کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے اور دیگر بہت سے حضرات فقہاء کرام نے امام الامہ حضرت ابو حنیفہ نعمان بن ثابت (المتوفی ۱۵۰ھ) سے تعلیم قرآن کریم پر اجرت

لینا مکروہ اور ممنوع نقل کیا ہے۔ انہوں نے کمال ورع اور تقویٰ کی بنا پر ان دینی امور پر اجرت لینا منع کیا ہے یا مال دار اور غنی لوگوں کے لئے انہوں نے اجرت لینا مکروہ کہا ہے یا اس لئے کہ ان دینی کاموں پر اجرت لینے کو مقصود بالذات سمجھ کر دنیا بٹورنے کا ذریعہ ہی نہ بنا لیا جائے؟ اور یا اس لئے کہ خیر القرون میں نادار اور مفلس خدام دین کو بیت المال سے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے ملتے، اس لئے ان لوگوں کو الگ اجرت اور تنخواہ لینا مکروہ سمجھا ہے الغرض حضرت امام صاحب کے اس فتویٰ کی بنیاد کئی امور پر ہو سکتی ہے اور انہی کے فتویٰ پر صا دکتے ہوئے حضرات متقدمین فقہاء احناف نے اس اجرت کو مکروہ فرمایا۔ لیکن جب بیت المال کا نظام ورہم برہم ہو گیا تو حضرات فقہاء احناف میں متاخرین حضرات کو زمانہ کی اہم ضرورت کے بارے میں سوچنا پڑا۔ اور پھر انہوں نے متفقہ طور پر جواز کا فتویٰ دیا۔ چنانچہ امام قاضی خان انجمنی فرماتے ہیں کہ:

انما کرہ المتقدمون الاستیجار لتعلیم القرآن و کرہوا اخذ الاجر علی ذلك لانه كان للمعلمین عطیات فی بیت المال فی ذلك الزمان وكان لهم زیادة رغبة فی امر الدین و اقامة الحسبة و فی زماننا انقطعت عطیاتهم و انتقصت رغائب الناس فی امر الآخرة فلو اشتغروا بالتعلیم بالحاجة الی مصالح المعاش لاختل معاشهم قلنا بصحة الاجارة و وجوب الاجرة للمعلم بحیث لو امتنع الوالد عن اعطاء الاجر جُس فیہ اه

بلاشبہ حضرات متقدمین نے تعلیم قرآن کریم پر کسی کو اجرت دیکر ملازم رکھنا مکروہ سمجھا ہے اور اس پر اجرت لینا بھی مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے لئے بیت المال میں عطیات مقرر ہوتے تھے نیز امور دین اور بشری فی اللہ کام کرنے میں ان حضرات کی رغبت زیادہ تھی، اور ہمارے زمانہ میں عطیات بھی منقطع ہو چکے ہیں اور آخرت کے معاملہ میں لوگوں کی رغبتیں بھی کم ہو چکی ہیں۔ سو اگر ایسے لوگ ناداری کی حالت میں تعلیم کا شغل جاری رکھتے ہوئے روزی کمانے میں مصروف ہوتے تو ان کی کمائی میں سخت خلل پڑے گا۔ اس لئے ہم نے یہ کہا کہ یہ اجارہ صحیح ہے اور معلم کے لئے اجرت واجب ہے۔

اب اگر تعلیم پانے والے شاگرد کا والد اور موجودہ اصطلاح (فتاویٰ قاضی خان ج ۳ ص ۲۳ طبع نو لکھنؤ)

میں مدرسہ، ادارہ اور منہج معلم کو تنخواہ دینے سے گریز کرے تو اسے گرفتار کیا جائے گا۔

حضرات فقہاء احناف میں قبیحہ النفس ہونے کے لحاظ سے جو مقام امام قاضی خان کا ہے، وہ اہل علم

حضرات سے مخفی نہیں ہے۔

علامہ ابن النجیم الحنفی (الملقب بابی حنیفۃ الثانی) فرماتے ہیں :

اماعلیٰ المختار للفتویٰ فی زماننا فیجوز اخذ الاجر بہر حال ہمارے زمانہ میں فتویٰ کے لئے مختار قول یہ ہے کہ
للإمام والمؤذن والمعلم والمفتی اھ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۵۲ امام اور مؤذن اور معلم اور مفتی کو اجرت لینا جائز ہے۔

اور احب ہدایہ بھی یہی تصریح فرماتے ہیں کہ اب فتویٰ جواز پر ہے (ہدایہ ج ۴ ص ۱۵۴)۔ اور اسی طرح

علامہ بدرالدین العینی الحنفی صرح فرماتے ہیں (ملاحظہ ہو بنیائہ شرح ہدایہ ج ۳ ص ۶۵۵)۔

حضرات فقہاء کرام کی ان واضح تصریحات کے بعد مطلقاً حاجت اور ضرورت نہیں کہ ہم اجرت لینے کی ممانعت کے دلائل کا تذکرہ کر کے پھر ان کے تفصیلی جوابات عرض کریں۔ صرف اجمالی طور پر یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ جن بعض آیات اور احادیث سے عدم جواز اجرت برسم قرآن کریم پر استدلال کیا گیا ہے وہ ممانعت میں

نص اور متعین المعنی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو محال تھا کہ حضرات خلفاء راشدینؓ اور حضرات ائمہ ثلاثہؓ اور جمہور علماء کرام اور متاخرین حضرات فقہاء احناف اس کے خلاف فتویٰ صادر کرتے کیونکہ قرآن کریم کی وہ آیات اور احادیث ان کے پیش نظر بھی تھیں اور احادیث اس سلسلہ کی اکثر و بیشتر ضعیف ہیں۔ اور اگر بعض صحیح

ہیں تو حضرت امام بیہقیؒ وغیرہ نے ان کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے (ملاحظہ ہو سراج المنیر ج ۳ ص ۳۲۲ للعزیزی)

قائدہ : کسی بیمار اور مصیبت زدہ وغیرہ پر قرآن کریم پڑھ کر یا تعویذ لکھ کر اجرت لینا جائز ہے۔ صحیح

بخاری ج ۲ ص ۸۵۲ وغیرہ کی یہ روایت ان احق ما اخذتم علیہ اجر کتاب اللہ (او کما قال کہ زیادہ مناسب

وہ چیز جس پر تم اجرت لو، کتاب اللہ ہے) اس کی دلیل ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس سے رقیہ اور جھاڑ پھونک

وغیرہ پر اجرت لینا مراد ہے، ایصالِ ثواب پر اجرت لینا مراد نہیں ہے۔

پننانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :

المراد الرقیة لا التلاوة (فتاویٰ ج ۲ ص ۱۹۸)۔ اس سے مراد جھاڑ پھونک ہے۔ تلاوت نہیں ہے۔

علامہ عزیزیؒ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ جھاڑ پھونک پر قرآن کریم کی تلاوت پر اجرت لینا جائز ہے۔

(السراج المنیر ج ۱ ص ۲۸۵)

ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تعیین

میت کے لئے دعا اور استغفار کرنا اور صدقہ و خیرات دینا اور بلا اُجرت کے قرآن کریم پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا، اسی طرح نفل نماز و روزہ اور حج وغیرہ سے میت کو ثواب پہنچانا جائز اور صحیح ہے۔ لیکن ایصالِ ثواب کیلئے شریعتِ حقہ نے دنوں اور تاریخوں کی کوئی تعیین و تخصیص نہیں کی ہے۔ اور پہلے باحوالہ یہ گزر چکا ہے کہ اپنی طرف سے ایسی تعیین کرنا بدعت ہے۔ دلائل اربعہ میں سے کوئی دلیل اس پر دال نہیں ہے کہ ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تعیین ضروری ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ رسم مسلمانوں نے اہل ہنود سے لی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تعیین ہے۔ چنانچہ مشہور مؤرخ علامہ بیرونی (المتوفی ۴۵۰ھ) لکھتے ہیں کہ اہل ہنود کے نزدیک جو حقوق میت کے وارث پر عائد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ضیافت کرنا اور یومِ وفات سے گیارہویں اور پندرہویں روز کھانا کھلانا، اس میں ہر ماہ کی چھٹی تاریخ کو فضیلت ہے۔ اسی طرح اختتامِ سال پر بھی کھانا کھلانا ضروری ہے۔ نو دن تک اپنے گھر کے سامنے طعام پختہ و کوزہ آب کھیں ورنہ میت کی رُوح ناراض ہوگی اور بچوک و پیاس کی حالت میں گھر کے ارد گرد پھرتی رہے گی۔ پھر عین دسویں دن میت کے نام پر بہت سا کھانا تیار کر کے دیا جائے اور آپ نٹک دیا جائے اور اسی طرح گیارہویں تاریخ کو بھی۔ نیز لکھا ہے کہ ماہِ پوس میں وہ حلوا پکا کر دیتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ برہمن کے کھانے پینے کے برتن بالکل علیحدہ ہوں (کتاب الہند ص ۲ و ص ۲۸۲ محصلہ)۔ اور یہی کچھ برائے نام مسلمان کرتے ہیں کہ حلوا اور پانی بھی سامنے رکھا جاتا ہے اور مٹلاجی کے برتن بھی الگ ہوتے ہیں اور دنوں کی تعیین بھی کی جاتی ہے خصوصاً دسویں گیارہویں اور اختتامِ سال کے بعد سالانہ عرسِ مشہور نو مسلم عالم (جو پہلے پنڈت تھے) مولانا عبید اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ — ”برہمن کے مرنے کے بعد گیارہواں دن اور کھتری کے مرنے کے بعد تیرہواں دن اور دلش یعنی بننے وغیرہ کے مرنے کے بعد پندرہواں یا سولہواں دن اور شور یعنی بالہی وغیرہ کے مرنے کے بعد تیسواں یا اکتیسواں دن مقرر ہے۔ ازاں جملہ ایک چھ ماہی کا دن ہے یعنی مرنے کے بعد چھ مہینے، ازاں جملہ برسی کا دن ہے اور ایک دن گائے کو بھی کسلاتے ہیں۔ ازاں جملہ ایک دن سدھ کا ہے مرنے کے مہینے سے چار برس

پہچھے، ازاں جملہ اسوج کے مہینے کے نصف اول میں ہر سال اپنے بزرگوں کو ثواب پہنچاتے ہیں لیکن جس تاریخ میں کوئی مرا، اُس تاریخ میں ثواب پہنچانا ضرور چاہتے ہیں اور کھانے کے ثواب پہنچانے کا نام سرادھ ہے، اور جب سرادھ کا کھانا تیار ہو جائے تو اول اس پر پنڈت کو بلوا کر کچھ بید پڑھواتے ہیں۔ جو پنڈت اس کھانے پر بید پڑھتا ہے وہ ان کی زبان میں ابھشٹرن کہلاتا ہے، اور اسی طرح اور بھی دن مقرر ہیں۔
(بلفظ تحفۃ الہند ص ۹۱)۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب (المتوفی ۱۳۲۶ھ) لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں خاص یہ رسم سیوم کی ہے۔ اور کسی ولایت میں کوئی جانتا بھی نہیں سو یہ ہنود کے تیجہ کو دیکھ کر وضع ہوا ہے (ابراہین القاطعہ ص ۱۱۱) اور یہی کچھ کلمہ گو مسلمان کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ پنڈت کی جگہ ختمی ملانے لے لی ہے اور کھانے پر بید کی جگہ قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔ افسوس اور صد افسوس کہ ان تمام غیر اسلامی رسموں نے اسلامی شکل اختیار کر لی ہے اور اب اس پر تنقید کرنا گویا اسلام پر تنقید کرنا ہے اور یہ سب کچھ ہندوستان میں آکر ہوا
فوا سفا! ع وہ بدلا گیا آ کے ہندوستان میں

میت کے گھر اجتماع اور کھانا پکے کا بیان

حدیث اور فقہ کی عبارات اس پر شاہد ہیں کہ جب کسی کی وفات ہو جائے تو اس کے گھر والے چونکہ صدمہ میں مبتلا ہوتے ہیں اس لئے اہل محلہ اور رشتہ دار اہل میت کا کھانا تیار کریں اور جو نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکا ہو وہ تعزیت بھی کر سکتا ہے۔ لیکن میت کے گھر اجتماع اور اہل میت کا لوگوں کیلئے کھانا تیار کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے اور بہت سے علاقے اس قبیح حرکت کا شکار ہو کر مقروض ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات سو پر قرض لیا جاتا ہے اور اس طرح وارثوں کا اور خصوصاً یتیموں کا مال برباد کیا جاتا ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہ (المتوفی ۱۳۵ھ) فرماتے ہیں کہ:

کُتَّانَرِي الْجَمَاعَةِ إِلَى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَصَنَعَةُ
الطَّعَامِ مِنَ النِّيَاحَةِ (ابن ماجہ ص ۱۱۱ و مسند احمد ص ۲۰۲)

ہم (یعنی حضرات صحابہ کرام) میت کے گھر جمع ہونے کو اور
میت کے گھر کھانا تیار کرنے کو نوحہ سمجھتے تھے۔

اور منتقی الانخبار ص ۱۲۲ میں وصنعة الطعام بعد دفنہ من النياحة کے الفاظ آئے ہیں۔

مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ میت پر آواز کے ساتھ رونا، بین اور نوحہ کرنا اہل جاہلیت کا کام ہے اور نوحہ کرنا جمہور سلف و خلف کے نزدیک حرام ہے۔ اسی طرح میت کے گھر کا کھانا بھی سمجھا جائے۔ یہ روایت دو طریق سے مروی ہے۔ علامہ ہاشمیؒ ایک سند کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ بخاری کی شرط پر صحیح ہے اور دوسری کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۰۰)۔ حافظ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے (فتح القدير ج ۱ ص ۱۲۷)۔ علامہ حلبیؒ لکھتے ہیں۔ باسناد صحیح (کبیری ص ۱۰۰)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کے گھر اجتماع کرنا اور وہاں کھانا تناول کرنا حضرات صحابہ کرام کے نزدیک نوحہ جیسا ایک جرم تھا اور اس پر انکلا اجماع و اتفاق رہا ہے۔ ضرورت تو نہیں مگر حضرات فقہاء کرام کی عبارات بھی ملاحظہ کر لیجئے تاکہ یہ مسئلہ بھی بین طور پر سامنے آجائے۔

علامہ ابن امیر الحاج المالکی (المتوفی ۳۲۰ھ) لکھتے ہیں کہ :

اما اصلاح اهل الميت طعاماً و جمع الناس فلم
ينقل فيه شيء وهو بدعة غير مستحب (مدخل ج ۳ ص ۲۷۵)

اہل میت کا کھانا تیار کرنا اور لوگوں کا جمع ہونا اس میں
کوئی چیز منقول نہیں ہے بلکہ یہ بدعت غیر مستحب ہے۔

نیز لکھتے ہیں کہ :

مما احذثہ بعضهم من فعل الثالث للميت
وعملهم الاطعمة فيه حتى صار عندهم
كانه امر معمول به (مدخل ج ۳ ص ۲۷۵)

بعض لوگوں نے یہ بدعت نکالی ہے کہ میت کے رتیجہ
پر طعام تیار کرتے ہیں، اور یہ ان کے نزدیک معمول
کام بن گیا ہے۔

امام ابن حجر مکی شافعیؒ سے سوال کیا گیا کہ :

عما يعمل يوم ثالث من موته من تهئية اكل و
اطعامه للفقراء وغيرهم وعما يعمل يوم السابع الخ

میت کے تیسرے دن فقراء وغیرہ کیلئے جو کھانا تیار کیا جاتا ہے
اور اسی طرح ساتویں دن، اس کا کیا حکم ہے ؟

جواب میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ :

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ نوحہ کی حرمت پر اجماع ہے (شرح مسلم ج ۱ ص ۱۰۰)

جميع ما يفعل منها ذكر في السؤال من
البدع المذمومة (فتاویٰ کبریٰ ج ۲ ص ۷۷)

سوال میں جتنی چیزیں ذکر کی گئی ہیں، وہ سب کی سب
بدعات مذمومہ ہیں۔

علامہ محمد بن محمد بن حنبلی (المتوفی ۲۴۱ھ تسلیتہ المصائب ص ۹۹ میں) اور امام شمس الدین
بن قدامہ حنبلی (المتوفی ۶۸۲ھ شرح متنح لکبیر ج ۲ ص ۴۲ میں) اور امام موفق الدین بن قدامہ حنبلی
(المتوفی ۵۲۰ھ) لکھتے ہیں، واللفظ لہ :

فاما صنع اهل الميت طعاما للناس
فمكروه لان فيه زيادة على مصيبتهم و
شغلا لهم الى شغلهم وتشبيها بصنع
اهل الجاهلية (مغنی ج ۲ ص ۴۳)

کہ اہل میت جو لوگوں کے لئے کھانا تیار کرتے ہیں وہ مکروہ
ہے کیونکہ اس میں اہل میت کو مزید تکلیف، اور غل میں
مبتلا کرنا ہے۔ نیز اس سے مشرکین اہل جاہلیت کے ساتھ
مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔

مذهبننا و مذهب غیرونا كالشافعية
والحنابلة الخ (ج ۱ ص ۸۴)

ہمارا اور حضرات شوافع اور حضرات حنابلہ کا یہی
مذہب ہے۔

چونکہ ہمیں ایک ایسے طبقے سے واسطہ پڑ چکا ہے جو خود کو حنفی کہلاتا ہے اسلئے ہم فقہ حنفی کی چند عیارتیں
پیش کرتے ہیں تاکہ ان کو مسلم حضرات فقہاء احناف کے نظریہ کو سامنے رکھ کر غور و فکر کا موقع مل سکے۔

فقہاء احناف کثر اللہ تعالیٰ سوادہم کے نزدیک میت کے جس طرح دوسرے مسالک کے
گھر سے طعام کھانا تیجہ، ساتواں اور چالیسواں وغیرہ کرنا۔ حضرات فقہاء کرام نے ان بدعات
کا انکار کیا ہے، اسی طرح بلکہ ان سے بڑھ کر حضرات فقہاء احناف نے ان کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ
طاہر بن احمد الحنفی لکھتے ہیں کہ :

ولا يباح اتخاذ الضيافة عند ثلاثة ايام لان
الضيافة يتخذ عند السرور (خلافتاویٰ ج ۲ ص ۳۴)

کہ اہل میت کی طرف سے تین دن تک ضیافت مباح نہیں
ہے کیونکہ ضیافت خوشی کے موقع پر ہوا کرتی ہے۔

صوبہ سرحد اور اسی طرح بعض دیگر علاقوں میں یہ بدعت رائج ہے کہ میت کو دفن کر چکنے کے بعد پہلی رات

عموماً سب گاؤں کی بلا امتیاز روٹی پنکائی جاتی ہے۔ جس کو وہ لوگ اپنی زبان میں نماشاں، ٹھومہ اور ٹٹھی وغیرہ کہتے ہیں۔ اس میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دوگوں کو پاول گھی اور کھانڈ سے تواضع کی جاتی ہے۔ اس عبارت میں اسی کھانے کو حضرات فقہار کرام نے غیر مباح بھی کہا ہے اور مکروہ و بدعت مستقیمہ بھی۔ صد افسوس ہے کہ بڑے بڑے علماء بروار مولوی بھی اس قبیح ترین بدعت میں مبتلا ہیں۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا ومن جمیع البدعات۔

امام قاضی خان لکھتے ہیں :

ویکرہ اتخاذ الضیافة فی ایام المصیبة لانہا ایام
تاسف فلا یلیق بها ما کان للسر (فتاویٰ غانیہ ص ۸۷)

یعنی مصیبت کے دنوں میں ضیافت کرنا مکروہ ہے کیونکہ جو
کام خوشی کے وقت ہو وہ غمی کے مناسب نہیں ہے۔

اسی کے قریب قریب عبارت فتاویٰ سرابجیہ ص ۵۷ میں ہے۔

حافظ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ :

ویکرہ اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل
المیت لانه شرع فی السر لا فی الشرور
وہی بدعة مستقیمة (فتح القدیر ص ۱۷۷)

میت کے گھر کھانا تیار کرنا مکروہ ہے کیونکہ طعام کھانا تو خوشی
کے موقع پر ہوتا ہے نہ کہ غمی میں، اور یہ نہایت ہی بڑی
اور قبیح بدعت ہے۔

اور علامہ قہستانی لکھتے ہیں کہ :

ویکرہ اتخاذ الضیافة فی ہذا الایام وکذا
اکلھا کما فی حیرة الفتاویٰ (جامع الرموز ص ۲۳)

ان دنوں میں میت کے گھر کھانا تیار کرنا اور کھانا دونوں مکروہ
ہیں جیسا کہ حیرة الفتاویٰ میں مذکور ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ :

ولایباح اتخاذ الطعام ثلاثة ایام کذا فی
التتارخانیہ۔ (عالمگیری ص ۱۶)

تین دن تک میت کے گھر میں کھانا تیار کرنا مکروہ ہے
ایسا ہی فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے۔

اور امام حافظ الدین محمد بن شہاب کورمی الحنفی لکھتے ہیں کہ :

ویکرہ اتخاذ الضیافة ثلاثة ایام واکلھا
تین دن تک ضیافت مکروہ ہے اور اسی طرح اس کا کھانا

بھی کیونکہ ضیافت تو خوشی کے موقع پر ہوتی ہے اور پہلے دوسرے اور تیسرے دن طعام تیار کرنا بھی مکروہ ہے اور اسی طرح ہفتہ کے بعد اور عیدوں کے موقع پر بھی اور اسی طرح موسم بموسم قبروں کی طرف طعام لے جانا بھی مکروہ ہے اور قرأت قرآن کے لئے اور صلح اور قرار کو جمع کر کے تم قرآن کے لئے دعوت کرنا بھی مکروہ ہے و علیٰ ہذا القیاس سورۃ انعام یا سورۃ اخلاص کی قرأت کے لئے طعام تیار کرنا بھی مکروہ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ قرأت قرآن کے وقت کھانے کے لئے طعام تیار کرنا مکروہ ہے۔

لانہا مشروعة للسرور ویکرہ اتخاذ اطعام فی الیوم الاول والثالث و بعد الاسبوع والاعیاد ونقل اطعام الی القبر فی المواسم واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن و جمع الصلحاء والقراء للختم او لقراءة سورۃ الانعام او الاخلاص فالحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لاجل الاحل ینکرہ۔ (فتاویٰ بزازیہ ج ۴ ص ۸۱۔ طبع مصر)

اسی مضمون کی عبارت شامی (ج ۱ ص ۸۴ طبع مصر) میں بھی ہے اور علامہ علی متقی کا یہ حوالہ کہ انہذا الاجتماع فی الیوم الثالث خصوصاً لیس فیہ فرضیۃ الا پہلے نقل ہو چکا ہے۔ ملاحظہ ہو: ص ۱۶ امام نووی شرح منہاج میں لکھتے ہیں کہ:

قبر پر تیسرے دن اجتماع کرنا اور گلاب اور اگر کی بتیاں تقسیم کرنا اور مخصوص دلوں کے اندر روٹی کھلانا، مثلاً تیجہ، پانچواں، نواں، دسواں، بیسواں اور چالیسواں دن اور چھٹا مہینہ اور سال کے بعد، یہ سب کے سب امور بدعت ممنوعہ ہیں۔

الاجتماع علی مقبرۃ فی الیوم الثالث وتقسیم الورد والعود والطعام فی الایام المنصوصۃ کالثالث والخامس والتاسع والعاشر والعشرین والرابعین والشہر السادس والستۃ بدعة ممنوعۃ (بحوالہ انوار ساطعہ ص ۱۵۱)

حضرت ملا علی نقاری، حضرت عمام بن کلیب کی روایت کو نقل کرتے وقت یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

ہمارے مذہب (حنفی) کے حضرات فقہار کرام نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ میت کے پہلے اور تیسرے دن اور اسی طرح ہفتہ کے بعد طعام تیار کرنا مکروہ ہے۔

قرر اصحاب مذہبنا من انه ینکرہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث و بعد الاسبوع۔ (مرقات ج ۵ ص ۲۸۲)

ان عبارات میں اس امر کی پوری صراحت موجود ہے کہ میت کی وجہ سے دنوں کی تخصیص کم کے کھانا پکانا (اور خصوصاً تیسرے، دسویں اور چالیسویں وغیرہ دنوں میں بدعت اور مکروہ ہے اور ایسے کھانے سے بہر حال پرہیز کرنا چاہیے۔ چنانچہ مولانا لکھنوی لکھتے ہیں :

"شیخ عبدالحق محدث دہلوی در جامع البرکات نے نو لیس دنوں کے بعد سالے یا ششماہی یا چہل روز دریں دیار پزند و در میان برادران بخشش کنند و آں را بھاجی میگویند چہرے داخل اعتبار نیست بہتر آنست کہ نہ خوردند۔ انتہی (مجموعہ فتاویٰ ج ۳ ص ۳۷)۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ :

"و عادت نبوی کہ برائے میت جمع شوند و قرآن خوانند و ختمات خوانند بر سر گور و نہ غیر آن و ایں مجموعہ بدعت است نعم برائے تعزیت اہل میت و جمع تسلیہ و صبر فرمودن ایساں راستت و مستحب است اما ایں اجتماع مخصوص روز سوم و از تکاپ تکلفات دیگر و صرف اموال بے وصیت از حق یتامی بدعت است و حرام۔" (مدارج النبوۃ ج ۱ ص ۱۲۲ طبع نو لکھنور)

شیخ صاحب موصوف نے شرح سفر السعادت ص ۱۲۳ اور اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۵۷ میں بھی اسی طرح لکھا ہے اور شیخ الاسلام کشف الغطاء میں لکھتے ہیں کہ :

"آنچہ متعارف شدہ از پختن اہل مصیبت طعام را در سوم و قسمت نمودن آن میان اہل تعزیت و اقران غیر مباح و نامشروع است و تصریح کردہ بدال در خزائن چہ شریعت موت نزد سرور است و نزد شرور۔"

اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی لکھتے ہیں کہ :

"بعد مردن من رسوم و نیوی مثل دہم و ہتم و چہلم و ششماہی و برسینی بیچ نکند۔" (وصیت نامہ مع مالابندیم) اور حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب نقشبندی (المتوفی ۱۰۳۷ھ) لکھتے ہیں کہ :

(سوال ششم) آنکہ طعام بروح میت بروز سوم و دہم و گل دادن روز سوم از کجاست؟ (مخدوما

طعام دادن لہ تعالیٰ بے رسم و ربا و ثواب آں را بمیت گزارانیدن بسیار خوب است و عبادت بزرگ اما

تعیین وقت اصل معتمد علیہ ظاہری نشو و روز سوم گل دادن بگرداں بدعت است۔ (مکتوبات، مکتوب ۵۱۱)
حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

”دیگر از عاداتِ شنیعہ ما مردم اسراف است در ماتمہا و سیوم و چہلم و ششماہی و قاتحہ سالیانہ
و این ہمہ را در عرب اول وجود نبود مصلحت آن است کہ غیر تعزیت و ارشادان میت تا سہ روز و اطعام
شال یک شب در روز رسمے نباشد۔“ (تفہیمات ج ۲ ص ۲۲۷ و وصیت نامہ مثلاً)

اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت (المتوفی ۸۰ھ) کے ملفوظات میں ہے کہ:
”اس زمانہ میں سیوم کے روز میت کی زیارت کے واسطے شربت و برگ و میوہ لے جاتے ہیں اور
کھاتے ہیں۔ اور فرمایا کہ صندوق لے جاتے ہیں اور سپارہ خوانی کرتے ہیں یہ مکروہ ہے (الدر المنظوم ص ۸۳)
اور علامہ محی الدین برکلی نقشبندی الحنفی (المتوفی ۹۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

”ان بدعات میں سے ایک یہ ہے کہ موت کے دن یا اس کے بعد ضیافتِ طعام کی وصیت کرنا اور
قرآن و کلمہ پڑھنے والوں کو پیسے دینا یا قبر پر چالیس روز تک یا کم و بیش ایام تک آدمی بٹھانا یا قبر پر قبہ
بنانے کی وصیت کرنا یہ سب امور منکرہ ہیں۔“ (طریقہ محمدی صفحہ آخری)

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مرید خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی حشتی (المتوفی فی حدود
۸۰ھ) قبور کی زیارت کے لئے بھی از خود دنوں کی تعیین (مثلاً تیسرے یا ساتویں روز) کو بدعت شمار
کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میدان زیارت سنت است لیکن زیارت روز و شب
معہود سیوم ہفتے داں بدعتے میکن نذر
(تحفہ نصاب) اور حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی (المتوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں کہ:

”مقرر کردن روز سوم و غیرہ بالتخصیص و اور اضوری انگاشتن در شریعت محمدیہ ثابت نیست
صاحب نصاب الاحتمساب (مولانا ضیاء الدین عمر بن محمد بن عوض سنہامی الحنفی معاصر حضرت شیخ
نظام الدین اولیاء المتوفی ۷۲۵ھ) ان را مکروہ نوشتہ و راہ تخصیص بگذارند و ہر روزیکہ خواہند ثواب

بروحِ میّت رسانند۔ (مجموعہ فتاویٰ ج ۳ ص ۷۷)۔

قارئین کرام! آپ نے جماعتِ احناف کثر اللہ تعالیٰ سوادِ ہم کے ذمہ دار حضرات فقہاء کرام اور حضرات صوفیاء عظام کی عبارتیں ملاحظہ کر لی ہیں کہ وہ میّت کے گھر کھانا تناول کرنے، سوم، دہم، چہلم اور برسی وغیرہ کو بدعت اور مکروہ (بلکہ بعض حرام) کہتے ہیں۔ مگر صد افسوس ہے کہ فریقِ مخالف کی گنگا ہی اُلٹی ہے۔ جو حضرات یہ بدعات نہیں کرتے، ان کو وہ وہابی وغیرہ کے خطابات سے نوازتے ہیں، اور عوام الناس کو ان کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ فوا اسفا!

لطیفہ: فریقِ مخالف کے اعلیٰ حضرت نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ۔ حتی الامکان اتباعِ شریعت نہ چھوڑو، اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے، اُس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ اللہ توفیق دے۔ بلفظہ (وصایا شریف ص ۸)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا دین اور مذہب شریعتِ اسلامی سے جدا ہے اور اس دین پر جو ان کی کتابوں سے ظاہر ہے، مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ شریعتِ حقّ کا اتباع تو حتی الامکان بتایا مگر ان کا مذہب اور دین اپنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! اور بات بھی صحیح ہے کیونکہ عقائد سے لے کر اعمال تک اور عبادات سے اخلاق تک خان صاحب کا دین و مذہب شریعتِ اسلامی سے بالکل جدا ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، یا رزندہ صحبت باقی! لیکن فاتحہ کے سلسلہ میں خان صاحب کے اتباع سے گزارش ہے کہ ان کی وصیتِ شریفیہ پر عمل کر کے ثوابِ دارین حاصل کریں اور اس گرانی اور مہنگائی میں ان لذیذ چیزوں کا خوب لطف اٹھائیں۔

خان صاحب لکھتے ہیں کہ:

”اعزہ سے اگر لطیبِ خاطر ممکن ہو تو فاتحہ میں ہفتہ (میں) دو تین بار ان اشیاء سے بھی کچھ بھیج دیا کریں۔ دودھ کا برف، خانہ ساز اگر چہ بھینس کے دودھ کا ہو، مرغ کی بریانی، مرغ پلاؤ خواہ بکری کا، شامی کیاب، پرائے اور بالائی، فیرینی، اُرد کی دال مع ادک و لوازم، گوشت بھری کچوریاں، سیب کا پانی، انار کا پانی، سوڈے کی بوتل، دودھ کا برف، اگر روزانہ ایک چیز ہو سکے یوں کر دیا جائے مناسب

جانو، مگر بطیب خاطر۔ میرے لکھنے پر مجبوراً نہ ہو۔ انتہی بلفظہ (وصایا شریف ص ۱۱)

فریق مخالف کو اعلیٰ حضرت کی اس زریں وصیت پر عمل پیرا ہو کر ثواب دارین حاصل کرنا چاہیے۔
مولوی محمد عمر صاحب نے اپنی کتاب مقیاس حقیقت میں اس مضمون کی مستقل سُرخیاں قائم کر کے
امتِ محمدیہ پر کرم فرمائی کی ہے: فضیلتِ دودھ، فضیلتِ حلوا و شہد، فضیلتِ گوشت اور پراٹھا
وغیرہ، پھر کیوں عوام الناس اس پر عمل نہ کریں کہ ہم حرام و ہم ثواب۔ مگر مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے
فضیلتِ جہاد پر کوئی سُرخی قائم نہیں کی۔ لیکن یہ بیچارے جہاد تو کیا کریں گے۔ تحریکِ ختمِ نبوت میں ان کی
اکثریتِ عامۃ المسلمین کے سامنے بے نقاب ہو چکی ہے۔ یہ صرف کھانے پینے کے مجاہد اور شیریں جہاد اور
حق گوئی سے ان کی کیا نسبت؟

تجھے طعام سے ممکن نہیں فراغ کہ تو طعام خواہ ہے مگر صاحبِ جہاد نہیں (اقبال تیسرا)
اگر فریقِ مخالف خان صاحب کی سابق وصیت پر عمل نہ کر سکے اور مختلف اشیاء تیار کرنے اور مہیا
کرنے سے عاجز ہو تو ان کے دوسرے فتوے پر عمل کرے تاکہ اس کی تلافی ہو جائے، اور نہیں تو کم از کم بڑھیا
وادی کے سوم پر ہی ایسا کر لیا کریں تاکہ اس گرانی کے وقت پیاری نانی بھی ساتھ ہی یاد آجائے۔
خان صاحب لکھتے ہیں: "مسئلہ: میت کے سوم کا کس قدر وزن ہونا چاہیے۔ اگر چھوٹاروں
پر فاتحہ و لادھی جاتے تو ان کا کس قدر وزن ہو؟ الجواب: کوئی وزن شرعاً مقرر نہیں، اتنے ہوں جس
میں ستر ہزار عدد پورا ہو جائے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ انتہی بلفظہ (عرفانِ شریعت حصہ اول ص ۱۱)

اگر شریعت نے وزن مقرر نہیں کیا تو خان صاحب کو عرفانِ شریعت کا یہ زریں نسخہ کہاں سے
حاصل ہوا ہے؟ سچ فرمایا انہوں نے کہ ان کا مذہب و دین ان کی کتابوں ہی سے ظاہر ہوگا اور جس پر قائم
رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ اگر فی چھوٹا ہارہ ایک تولہ ہو تو ستر ہزار کا وزن اکیس من اور سینتیس سیر
ہوگا، اور اگر چھ ماشہ فی چھوٹا ہارہ وزن ہو تو ستر ہزار کا وزن دس من اور ساڑھے سینتیس ہوگا اور قابل
استعمال چھوٹا ہارہ چھ ماشہ سے کیا کم ہوگا؟ اگر چھ روپے سیر بھی چھوٹا ہارے ہوں تو دس من اور ۳ سیر کی
قیمت تقریباً چوبیس سو روپیہ سے اوپر ہوگی۔ ایسے دو سوم تو کیا ایک بھی اس زمانہ میں اچھے خاصے

چودھریوں اور نوابوں کو بھی نانی یاد کرادے گا اور دادی جی تو مفت میں یاد آجائیں گی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو اعتراضات فریق مخالف کی طرف سے کئے جاتے ہیں، ہم ان کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی عرض کر دیں تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔

فریق مخالف کا پہلا اعتراض | فریق مخالف کا کہنا ہے کہ میت کے گھر سے کھانا ناجائز اور مکروہ نہیں ہے کیونکہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۴۷ میں ایک حدیث آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب ایک میت کو دفن کیا اور اس سے فارغ ہوئے تو:

استقبلہ داعی امراتہ: میت کی بیوی کا ایک قاصد آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کھانے کی دعوت دینے آیا۔ علامہ حلبی (کبریٰ ص ۶۰۹ اور صغیری ص ۳۱۱) اور ملا علی نقی القاری (مرقات ج ۵ ص ۲۸۲) لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ میت کے گھر سے کھانا درست ہے۔ ورنہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہرگز نہ کھاتے۔ (انوار ساطعہ ص ۱۰۹ محصلہ)۔

الجواب: اس روایت سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ امراتہ کا نسخہ صاحب مشکوٰۃ کا وہم یا کسی کاتب کی غلطی ہے۔ اصل الفاظ داعی امراتہ ہیں کہ کسی عورت کے قاصد نے آپ کو دعوت دی تھی۔ باقی داعی امراتہ (کہ میت کی بیوی کے داعی نے دعوت دی) یہ غلط ہے۔ چنانچہ یہی روایت ابو داؤد ج ۲ ص ۱۱۱، مشکل الآثار ج ۲ ص ۱۳۱، معاصر ص ۱۶۹، شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۳۲، دارقطنی ج ۲ ص ۵۲۵، مسند احمد ج ۵ ص ۲۹۳، سنن الکبریٰ ج ۶ ص ۹، عقود الجواہر المنیضہ ج ۲ ص ۱۱۱، خصائص الکبریٰ ج ۲ ص ۱۳۱، مستدرک حاکم ج ۲ ص ۲۳۲، محلی بن حزم ج ۱ ص ۱۵۱، عون المعبود ج ۳ ص ۲۴۹ اور بدل المجهود ج ۲ ص ۱۳۱ وغیرہ کتابوں میں موجود ہے لیکن ان تمام میں امراتہ کے الفاظ ہیں اور یہی صحیح ہے امراتہ کی ضمیر کے ساتھ جو میت کی طرف راجع ہے، غلط ہے۔

وثانیاً جن حضرات نے امراتہ کے الفاظ کو پیش نظر رکھا ہے انہوں نے دیگر جوابات دیئے ہیں

لے مولوی عبد السمیع صاحب کا اس امراتہ والی روایت کو مرفوع قرار دے کر حضرت جریرؓ کی کتافعد (الحدیث) کو موقوف کہہ کر اس کو رد کرنا (دیکھئے انوار ساطعہ ص ۱۱۱) فن حدیث سے بالکل بے خبری ہے۔

کسی نے کہا کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ اور۔ بعض نے رکیک تاویلات کے تحت میث کے ہاں سے کھانا تناول کرنے کو درست کہا۔ اور فریق مخالف کے اعلیٰ حضرت خان صاحب بریلوی نے یہ جواب دیا کہ اس عورت نے آپ کو پہلے دعوت دی تھی، وقت موعود پر تقدیراً اس کا خاوند فوت ہو گیا۔ بنا بریں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وہاں کھانا تناول کرنا وفات کی وجہ سے نہ تھا بلکہ سابق وعدہ کی بنا پر تھا۔ اور خان صاحب نے ملا علی نقاری اور علامہ حلبی کی تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے (دیکھئے احکام شریعت حصہ سوم از ص ۱۹ تا ص ۱۹۷) راقم الحروف کے نزدیک پہلا جواب ہی متعین ہے کہ میث کے گھر کھانا تناول ہی نہیں کیا گیا۔ اصل الفاظ ہی امرأۃ ہیں نہ کہ امواتہ۔

اور جن حضرات نے اس روایت سے استدلال کیا ہے ان کا مدار ہی لفظ امواتہ ہے۔ علاوہ بر میں جب حضرت ملا علی نقاری نے اصل حقیقت کا جائزہ لیا تو اپنی آخری تصنیف میں اس سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے شرح نقایہ ج ۱ ص ۱۰۷ میں صاف تحریر فرمایا ہے کہ میث کے ہاں کھانا تناول کرنا مکروہ اور بدعت مستحبہ ہے۔

خان صاحب بریلوی نے حضرت ملا علی نقاری اور علامہ حلبی کی عبارت کے مفصل جوابات دینے کے بعد کیا خوب ارشاد فرمایا کہ: اگر فاضل حلبی اور ملا علی نقاری ہمارے دیار کا رسم و رواج دیکھتے تو غمی کی ان دعوتوں پر حرمت قطعی کا حکم لگاتے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی اجازت دینے میں شیطان مردود کے لئے ایک دروازہ کھول دینا ہے اور مسلمانوں اور بالخصوص نادار مسلمانوں کو سخت مصیبت میں ڈال دینا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ہم کو صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھے والحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا محمد و آلہ اجمعین۔ (احکام شریعت حصہ سوم ص ۱۹۷۔ مترجماً)۔

دوسرا اعتراض مولوی عبد السمیع صاحب اور مفتی احمد یار صاحب وغیرہ کہتے ہیں کہ ان عبارات میں تیجہ، دسواں اور چالیسواں وغیرہ کرنے کی جو ممانعت آئی ہے وہ اپنے مہانوں اور رشتہ داروں کی ضیافت کی وجہ سے ہے۔ فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر فقہار کیلئے کھا لیا گیا تو اچھا ہے۔ نیز شاہ ولی اللہ صاحب

گرام کارشاد ہے اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں۔

مولوی احمد رضا خان صاحب دوسرے تیسرے اور چالیسویں دن کے اجتماع اور عورتوں کے کھانے پینے اور چھالیا وغیرہ کے اہتمام کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

اولاً یہ دعوت خود ناجائز و بدعت شنیعہ و قبیحہ ہے۔ امام احمد اپنے مسند اور ابن ماجہ سنن میں سب سے

صحیح حضرت جریر بن عبد اللہ بن جلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کنافعد الاجتماع الی اهل المیت و صنعهم

الطعام من النیاحۃ۔ ہم گروہ صحابہ اہل میت کے یہاں جمع ہونے اور ان کے کھانا تیار کرانے کو مرنے کی

نیاحت شمار کرتے تھے، جس کی حرمت پر متواتر حدیثیں ناطق۔ الی ان قال امام بزازی رحمہ اللہ و جزی میں

فرماتے ہیں یکرۃ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول و الثالث و بعد الاسبوع یعنی میت کے پہلے یا تیسرے

دن یا ہفتے کے بعد جو کھانے تیار کرانے جاتے ہیں سب مکروہ و ممنوع ہیں (بلفظ احکام شریعت حصہ سوم ص ۱۹۲)

نیز مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں کہ "شریعت میں ثواب پہنچانا ہے، دوسرے دن ہونخواہ تیسرے دن

باقی یہ تعیین عرفی ہیں جب چاہیں کریں، انہیں دنوں کی گنتی ضروری جاننا جہالت ہے و بدعت۔ (مجموعہ

فتاویٰ قلمی مؤلفہ احمد رضا خان صاحب ج ۴ ص ۳۱، کتاب الخطر والاباحتہ)۔

نیز خان صاحب لکھتے ہیں کہ اگر یہ سمجھتا ہے کہ ثواب تیسرے دن پہنچتا ہے یا اس دن زیادہ پہنچے گا اور روز

کم، تو یہ عقیدہ بھی اس کا غلط ہے (الحجۃ الفاکحہ ص ۱۱)۔

اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کا مسئلہ حق ہے مگر ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تخصیص اور

تعیین ضروری جاننا گویا عملی ہی کیوں نہ ہو، جہالت اور بدعت ہے۔

تیسرا اعتراض | فریق مخالف کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ہوئی تو تیسرے دن حضرت ابو ذر نے کھجوریں، دودھ اور بچو کی روٹی آنحضرت صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے رکھی اور آپ نے ان پر سورۃ فاتحہ اور قل ہو اللہ پڑھ کر دعا فرمائی اور حضرت ابو ذر

سے فرمایا کہ اس کو لوگوں میں تقسیم کر دو اور فرمایا کہ ان اشیاء کا ثواب میرے نعتِ جگر ابراہیم کو پہنچے۔ اس روایت

سے ایک تو تیجہ کا ثبوت ہوا، اور دوسرا کھانا سامنے رکھ کر اس پر تم کہنے کا ثبوت ہوا۔ فریق مخالف کا بیان ہے

کہ یہ روایت حضرت ملا علی نقاری نے کتاب اوز جندی میں تحریر فرمائی ہے۔

الجواب : مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں کہ :

کہ کتاب اوز جندی از تصانیف ملا علی نقاری است
و نہ روایت مذکور صحیح و معتبر است ، بلکہ موضوع و
باطل براں اعتماد نشاید در کتب حدیث نشانے
از ہنچو روایت یافتہ کے شود۔
کہ نہ تو کتاب اوز جندی حضرت ملا علی نقاری کی تصنیف
میں سے ہے اور نہ یہ روایت صحیح اور معتبر ہے بلکہ یہ موضوع
اور باطل روایت ہے۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔
حدیث کی کسی کتاب میں اس قسم کی روایت کا کوئی
نشان موجود نہیں ہے۔

(مجموعہ فتاویٰ، ج ۲ ص ۷۷)

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ "انوارِ ساطعہ ص ۱۲۵ اور حاشیہ خزانہ الروایات میں ہے، کہ
حضور علیہ السلام نے امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے تیسرے اور ساتویں اور چالیسویں دن اور چھٹے ماہ
اور سال بھر بعد صدقہ دیا۔ یہ تیجہ ششماہی اور برسی کی اصل ہے (بلفظہ جاری الحق ص ۲۵)۔

مگر مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی موضوع اور جعلی روایات سے مسائل حل نہیں ہوتے۔
حدیث جب پیش ہو تو صحیح سند کے ساتھ ہو یا معتبر حضرات محدثین کرام سے اس کی تصحیح ہونی چاہیے
محض روایت یا حدیث کا نام لے لینا کفایت نہیں کرتا۔

قائدہ : عوام الناس میں جمعرات کے دن صدقہ و خیرات کرنے کی بھی ایک رسم جاری ہے۔ لیکن
اس کی بھی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ خان صاحب بریلوی سے کسی نے یوں سوال کیا کہ بعض لوگ
کہتے ہیں کہ فلاں درخت پر شہید مرد ہیں اور فلاں طاق میں شہید مرد رہتے ہیں۔ اُس درخت اور اُس
طاق کے پاس جا کہ جمعرات کو فاتحہ شیرینی اور چاول وغیرہ پر دلاتے ہیں الخ۔ خان صاحب لکھتے ہیں :

الجواب : یہ سب واہیات و خرافات اور جاہلانہ حماقات و بطالات ہیں، ان کا ازالہ لازم

ما انزل اللہ بہا من سلطان۔ (بلفظہ احکام شریعت حصہ اول ص ۷۷)۔

کھانا سامنے رکھ کر اُس پر ختم دینا

صحیح احادیث سے یہ امر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کھانے پر بسم اللہ بھی پڑھی ہے اور بطور برکت اور دُعا کے مختلف کھانے کی چیزوں پر قرأت بھی کی ہے۔ اور چیزوں میں اضافہ کیلئے بھی اشیا کو سامنے رکھ کر اُن پر دعائیں پڑھی ہیں۔ یہ تمام امور محل نزاع سے خارج ہیں جہگہگہ صرف اس امر کا ہے کہ میت کے لئے ایصالِ ثواب کے طور پر جو کھانا دیا جاتا ہے اُس پر بھی کچھ پڑھنا صحیح ہے؟ اور کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اور حضرات صحابہ کرام نے ایسا کیا ہے؟ اس کا آسان اور صحیح جواب صرف یہ ہے کہ ایسا کرنا ہرگز ثابت نہیں ہے بلکہ یہ بدعت ہے۔ چنانچہ فتاویٰ سمرقندیہ میں ہے کہ:

قراءة الفاتحة والاخلاص والكافرون سورة فاتحة اور اخلص اور کافروں کا طعام پر علی الطعام بدعة۔ (الجنہ ۱۵۵)۔ پڑھنا بدعت ہے۔

مولانا عبدالحی صاحب کے فتاویٰ میں ہے:

سوال: فاتحہ مروجہ حال یعنی طعام را رو برد نہادہ دست برداشته چیزے خواندن چہ حکم دارد؟
 جواب: ایں طور مخصوص نہ در زمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بودہ در زمان خلفاء بلکہ وجود آں در قرون ثلاثہ کہ مشہود لہا بالخیر اند منتقول نشدہ و حالاً در حریم شریفین زاد ہما اللہ شرفاً و عادتاً خواص نیست و اگر کسی ایں طور مخصوص بعمل آورد آں طعام حرام نمی شود بخوردش مضائقہ نیست ایں راضری دانستن مذموم است الخ (مجموعہ فتاویٰ ج ۳ ص ۷۷)
 اور مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں کہ:

”وقت فاتحہ کھانے کا قاری کے پیش نظر ہونا اگرچہ بیکار بات ہے مگر اس کے سبب سے حصولِ ثواب یا جوازِ فاتحہ میں کچھ نخل نہیں۔“ (الحجۃ الفاتحہ ص ۱۱)

مشہور بریلوی عالم مولوی محمد صالح صاحب کھانا سامنے رکھ کر اُس پر پڑھنے کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

”یہ رسم سوائے ہندوستان کے اور کسی اسلامی ممالک میں رائج نہیں۔“ (انتہیٰ بنقظہ تحفۃ الاحباب ص ۱۲۲)

جب یہ امر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ بلکہ خیر القرون سے ثابت نہیں ہے اور حضرات فقہاء کرام اس کو بدعت کہتے ہیں اور بقول خان صاحب بریلوی یہ بے کار بات ہے اور بقول مولوی محمد صالح صاحب ہندوستان کے بغیر کسی اسلامی ملک میں یہ رسم جاری اور رائج نہیں، تو اس کو ضروری سمجھنا اور اہل سنت اور حقیقت کی علامت قرار دینا اور نہ کرنے والوں کو وہابی کہنا اور ملتا کرنا، یہ کہاں کا انصاف اور دیانت ہے؟ بلکہ قرین قیاس و انصاف یہی بات ہے کہ ہندوستان میں یہ رسم ہندوؤں سے ماخوذ ہے۔ وہ کھانے پر بید پڑھتے تھے، اور کلمہ گو مسلمان قرآن پڑھتے ہیں۔ وہاں پنڈت یہ کام کرتے تھے اور یہاں حافظ جی اور میاں جی یہ کارروائی کرتے ہیں۔

مفتی احمد یار خان لکھتے ہیں کہ کھانے کو سامنے رکھ کر دعا کی تو کوئی خرابی ہے۔ اسی طرح قبر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا پڑھتے ہیں۔ (جہاں الحق ص ۲۵۴)۔

مگر اس پر مطلقاً غور نہ کیا کہ جنازہ اور قبر کو سامنے رکھ کر دعا کرنے کا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ سے ثبوت ہے۔ لیکن ایصالِ ثواب کے لئے کھانا سامنے رکھ کر اس پر کچھ پڑھنے کا ہرگز ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ بدعت ہے اور بقول خان صاحب بیکار بات ہے۔ اور بدعت بے کار اور لایعنی کام میں ضرور حرج ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ بیکار امر اور فعل عبث حرام ہوتا ہے۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا یہ حوالہ نقل ہو چکا ہے کہ "وہر چیز کہ برآں ترغیب صاحب شرع و تعیین وقت نباشد آں فعل عبث است و مخالف سنت خیر الانام و مخالف سنت حرام، پس ہرگز روا نہ باشد"۔ (فتاویٰ عزیز ج ۱ ص ۹۱)۔

چٹائی اور پھوڑی بچھانا

جب کسی کا کوئی عزیز و قریب فوت ہو جائے تو اس کی تعزیت کرنا اور صبر کی تلقین کرنا مسنون امر ہے مگر صرف اسی حد تک جس تک شریعت حقہ سے ثابت ہے۔ مسجد میں ہو یا گھر میں، تین دن تک تعزیت کی اجازت ہے۔ لیکن گلیوں اور کوچوں میں اور گھروں کے سامنے بیٹھنا اور چٹائیاں اور دریاں

وغیرہ بچھا کر حَقَّہ سُلگا کر بیٹھ جانا یہ تمام امور بدعات ہیں۔ ان سے اجتناب اشد ضروری ہے۔ چنانچہ امام فخر الدین عثمان بن علی الزلیعی الحنفی (المتوفی ۷۲۷ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا بأس بالجلوس لها الى ثلاثة ايام
من غير ارتكاب محظور من فرش البسط
والاطعمه من اهل الميتم لانها تتخذ
عند السرور۔ (تبیین الحقائق ج ۲ طبع مصر)
اور فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ:

ولا بأس لاهل المصيبة ان يجلسوا في
البیت او المسجد ثلاثة ايام والناس يأتونهم
ويصرونهم ويكروا الجلوس على باب الدار
وما يفعل في بلاد العجم من فرش البسط
والقيام على قوارع الطريق من اقم القبائح۔
(عالمگیری ج ۱ طبع مصر)
اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ:

”نشستن بر در، یا بر راہ برائے عزائم مکروہ است اشد کراہت از جہت بودن آن عمل جاہلیت (الی
ان قال) کہ تعزیت کہ بایں کیفیت کہ الآن متعارف است در ایام متعددہ کنند نبود۔ (شرح سفر السعادت ص ۲۳)
ان عبارات سے بخوبی یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ تعزیت کے لئے جو طریقہ آج کل اختیار کیا جاتا ہے کہ
گلیوں میں اور دروازوں پر چٹائیاں اور دریاں بچھا کر تعزیت کے لئے بیٹھتے ہیں۔ یہ قبیح ترین حرکت ہے
اور اشد مکروہ ہے کیونکہ اہل جاہلیت کی رسم ہے اور حضرات سلف صاحبین میں یہ طریقہ ہرگز رائج نہ تھا۔
علاوہ بریں جو لوگ نماز جنازہ میں شریک ہوتے ہوں، ان کے لئے تعزیت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جنازہ
بیٹھنے کی وجہ سے میت کا حق ادا ہو گیا، الا یہ کہ کوئی بزرگ ہستی اور صاحب اثر شخصیت ہو جو اہل میت کو

صبر کی تلقین کرنے کی غرض سے دوبارہ حاضر ہو تو الگ بات ہے۔

مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاس حقیقت ۱۵۱۶ میں جس روایت سے پھوڑی کا ثبوت پیش کیا ہے، وہ صرف مولوی محمد عمر صاحب کا ہی کام ہے۔ اس روایت میں اشارۃً بھی پھوڑی کا ذکر نہیں ہے اور نہ اس کا پھوڑی سے دور کا واسطہ ہے۔ محض تعزیت کی روایت سے مولوی محمد عمر صاحب کا پھوڑی پر ثبوت مہیا کرنا سراسر باطل ہے۔

فائدہ : میت کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بھی جائز ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے رفع یدیدہ ثم قال اللھم اغفر لعبد ابی عامر بنخاری ج ۲ ص ۱۹۱ و مسلم ج ۲ ص ۱۸۱ حضرت عبید ابو عامر کے لئے ان کی وفات کی خبر سن کر ہاتھ اٹھا کر ان کے لئے دعا مانگی تھی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب (المتوفی ۱۲۶۲ھ) فرماتے ہیں کہ تعزیت کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ظاہراً جائز ہے (مسائل اربعین ص ۳) اور قریب یہی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے (دیکھئے مسلم ج ۱ ص ۱۳۱ و اصابہ فی تذکرۃ الصحابہ ج ۲ ص ۲۱۸)۔

حیلہ اسقاط

یہ بات تو پہلے بوضاحت بیان کی گئی ہے کہ میت کے لئے صدقہ اور خیرات کرنا اس کے ساتھ ایک بہت ہی عمدہ حسن سلوک اور ہمدردی ہے اور نصوص شرعیہ سے اس کا ثبوت ہے اور اہل السنۃ والجماعت کا اس پر اتفاق ہے، مگر ایصالِ ثواب کا طریقہ وہی معتبر ہو گا جو دلائل شرعیہ سے ثابت ہے۔ اگر کسی عاقل اور بالغ کے ذمہ کچھ نمازیں باقی ہوں اور اس حالت میں اس کی وفات ہو جائے تو حضرات فقہار کرام نے روزہ پر قیاس کرتے ہوئے اس کے لئے فدیہ تجویز کیا ہے۔ مگر اس میں صرف قیاس ہی نہیں بلکہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ کی روایتیں بھی موجود ہیں گو بظاہر موقوف ہیں مگر حکماً مرفوع ہیں۔

عن ابن عباس قال لا یصل احد عن احد ولا حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کی یصوم احد عن احد ولكن یطعم عنہ (مشکل الآثار ص ۱۲۱) طرف سے نماز پڑھے اور روزہ رکھے۔ مگر ہاں اس

سنن الکبریٰ ص ۲۵۴ بحوالہ النقی ص ۲۵۴ مع السنن والنزیلی ص ۲۶۳ کی طرف سے فدیہ دے دے۔

علامہ ماروینی لکھتے ہیں کہ اس کی سند علی شرط اشعین صحیح ہے (الجوهری ج ۲ ص ۲۵۴) اور حافظ ابن حجر لکھتے

ہیں کہ اسناد صحیح (الدرایہ ص ۱۷۷)۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کی طرف سے

وعن ابن عمرؓ قال لا یصلین احد عن احد

نہ نماز پڑھ سکتا ہے اور نہ روزہ رکھ سکتا ہے اور لیکن

ولا یصومن احد عن احد ولکن ان

اگر تم کچھ کنا چاہتے ہو تو اس کی طرف سے صدقہ یا ہدیہ

کنت فاعلاً تصدقت عنه او اهدیت

اور فدیہ دے دو۔

عنه۔ (ایضاً)۔

ہر روزہ کا بدلہ نصف صاع گندم ہے، صاع دو سو ستر تولہ کا ہوتا ہے علامہ سندھی (المستوفی ص ۱۷۷) فرماتے

ہیں صاع کوئی ہست ہے مروجہ صاع دو صد و ہفتاد تولہ مستقیم

صاع تقریباً ساڑھے تین سیر کا ہوا اور نصف صاع تقریباً پونے دو سیر کا۔ ہر آدمی کو اپنی نمازوں اور

روزوں کا حساب کر کے حسب تصریح حضرات فقہاء کرام وصییت کرنی چاہیے (دیکھئے خانہ ج اصل ۱ و

جامع الرموز ج اصل ۱ و نور الايضاح ص ۱۷۷)۔ اور اگر بغیر وصییت کے وارث نے بطور تیسرے فدیہ دیا،

تب بھی جائز ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ثواب پہنچے گا۔ مگر وارثوں پر یہ فدیہ لازم نہ ہوگا۔ اور ہر نماز کا بدلہ

بھی نصف صاع ہوگا اور وتر کے لئے مستقل نصف صاع ہوگا۔ پانچ نمازوں کا اندازہ بمع وتر ساڑھے دس

سیر گندم ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کے ذمہ نماز اور روزہ وغیرہ کے حقوق نہیں تو اس کے لئے فدیہ کی ضرورت

ہی نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص مال دار ہے اور اس کے ترکہ سے وارثوں کی حق تلفی کے بغیر ثلث سے

فدیہ دیا جاسکتا ہے تو دیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص فقیر اور غریب ہے اور اس کے ذمہ نماز اور روزہ وغیرہ

حقوق ہیں اور اس کے ثلث ترکہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ سب نمازوں اور روزوں کا فدیہ ادا ہو سکے

تو حضرات فقہاء کرام نے اس کے لئے یہ حیلہ تجویز کیا ہے کہ جتنی مقدار میں گندم یا اس کی رقم کا اس کا ترکہ

متمم ہے تو وہ گندم یا رقم میت کا وارث کسی فقیر کو دے دے۔ پھر فقیر وارث میت کو ہبہ کرے، پھر

وارث فقیر کو دے دے۔ سب سے پہلے اتنی بار یہ معاملہ ہوتا رہے جتنی میں نمازوں اور روزوں کا اندازہ پورا ہو جائے

یہی صورت فقہ حنفی کی متعدد کتابوں میں لکھی ہے۔ (مثلاً دیکھئے کبیری ۵۳۵، شامی ج ۱ ص ۲۹۲، اور نور الایضاح ص ۱ وغیرہ)۔ اور حضرات فقہاء احناف نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگر یہ فدیہ نماز کا عوض بن سکا تو فہما، ورنہ صدقہ کا ثواب تو میت کو حاصل ہوگا (دیکھئے نور الانوار ص ۱ وغیرہ)۔ اس ساری بحث کو پیش نظر رکھ کر ذیل کے امور بخوبی اس سے ظاہر ہوتے ہیں۔

- ① نمازوں اور روزوں کا صحیح حساب اور تخمینہ لگایا جائیگا۔ محض رسمی طور پر فدیہ کا کوئی معنی نہیں۔
- ② اور اپنے وارثوں کو اسکی وصیت کی جائے کہ میری طرف سے میرے ثلث ترکہ میں سے اتنا فدیہ دے دیتا۔
- ③ جس کے ذمہ نماز اور روزہ وغیرہ نہیں، اس کے لئے اس معہود فدیہ کا کوئی معنی نہیں ہے۔ بایں طور کہ اُس نے اپنی زندگی میں نماز اور روزہ کی پابندی کی ہے، اور بہت سے خدا کے بندے آج بھی ایسے موجود ہیں، یا نابالغ بچے اور مجنون اور پاگل وغیرہ ہیں، ان کے لئے اس فدیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بشرطیکہ بلوغت سے تامرگ جنون رہا ہو۔

④ اگر کوئی فقیر ہے اور اس کا ترکہ تمام روزوں اور نمازوں کی ادائیگی کا متحمل نہیں، تو صرف اُس کے لئے حضرات فقہاء کرام نے حیلہ تجویز کیا ہے۔ خانوں، سرداروں، وڈیروں، امیروں اور نوابوں کے لئے یہ حیلہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

⑤ یہ فدیہ صرف حقوق اللہ مثلاً نماز اور روزہ وغیرہ کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ حقوق العباد تو حقوق ادا کرنے ہی کی صورت میں ادا ہو سکتے ہیں اور بس، یا صاحب حق بطیب خاطر خود معاف کر دے جب آخری مرتبہ حیلہ کی صورت میں میت کے ذمہ جو نمازیں اور روزے تھے وہ ادا ہو گئے، تو وہ گنہگار اور رقم اس فقیر کی ملک ہو گئی جس نے قبول کر لی، پھر اس سے واپس لے کر وارثوں کو اس کی تقسیم کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے۔ پہلے تو با مجبوری بشکل حیلہ فقیر سے واپس ہوتی رہی مگر اب کیا ضرورت پیش آئی ہے کہ اُس فقیر سے واپس لے کر اُس کو میت کے وارث خود تقسیم کریں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

الذی یعود فی ہبتہ کالکلب یعود فی قیدہ
 جو شخص ہبہ کر کے پھر اس کو واپس لیتا ہے تو اسکی مثال
 اوکما قال۔ (بخاری ج ۱ ص ۲۵۷ و مسلم ج ۲ ص ۳)۔
 ایسی ہی ہے جیسے کتا قے کر کے خود چاٹ لیتا ہے۔

صوبہ سرحد اور بعض دوسرے علاقوں میں یہ دستور ہے کہ حیلہ اسقاط کے لئے ایک خاص باکرامت گٹھڑی ہوتی ہے جس میں قرآن کریم کے علاوہ کچھ ریزہ کاری اور گڑ شریف بھی شامل ہوتا ہے اور پھر اس کو ایک دائرہ کے اندر گھمایا جاتا ہے اور ایک مخصوص دُعا سے شروع کر کے کہ کل حق من حقوق اللہ تعالیٰ بعضہا ادی الخ وہ گٹھڑی اصحابِ دائرہ کو دی جاتی ہے جن میں اکثر بڑے بڑے خان، نواب اور امیر ملاً بھی شامل ہوتے ہیں، اور وہ یہ کہتے ہوئے کہ قبلت بالطریقیۃ المذکورۃ و وہبتک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ حضرات فقہار کرام کی ان عبارتوں میں نہ تو قرآن کریم کا کہیں ذکر ہے اور نہ گڑ شریف کا۔ خدا معلوم یہ حیلہ در حیلہ کا ثبوت کہاں سے نکلا ہے؟ اور اس گٹھڑی میں جو رقم ہوتی ہے وہ بھی محض اپنی عزت اور ناک کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ اس کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میت کی نمازوں اور روزوں کا حساب کیا ہے؟ اور کتنی بار چکر دینے سے وہ حساب بے باق ہوگا؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جس حیلہ اسقاط کا جواز حضرات فقہار کرام سے ملتا ہے اور جن لوگوں کے لئے ملتا ہے اور جن حالات میں ملتا ہے وہ تقریباً تقریباً آج مفقود ہیں اور محض دنیا کمانے کا ایک مذموم حیلہ بن کر رہ گیا ہے اور مشکل ایک دو فیصدی حیلے ایسے ہوتے ہوں گے جو حضرات فقہار کرام کے بیان کردہ حیلہ کے عین مطابق ہوں گے۔ حضرت مولانا گنگوہی نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا کہ:

”حیلہ اسقاط کا مفلس کے واسطے علمائے وضع کیا تھا۔ اب یہ حیلہ تحصیل چند فلس کا ملائوں کے واسطے مقرر ہو گیا ہے، حق تعالیٰ نیت سے واقف ہے، وہاں حیلہ کارگر نہیں مفلس کے واسطے بشرطِ صحت نیت و رشک کے کیا عجب ہے کہ مفید ہو، ورنہ لغو اور حیلہ تحصیل دنیا و زنیہ کلمہ فقط واللہ اعلم۔ رشید احمد عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۱۱)۔ اور دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ ”حقوق مالیہ تو اول کے حقوق سے ادا ہو سکتے ہیں، اور حقوق بدنیہ جیسے نماز روزہ، تو اگر ہر نماز اور ہر روزہ کے بدلے نصف صاع گہوں اور ایک صاع جو ادا کرنے سے امید ادا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ باقی رہا یہ اسقاطِ مروّجہ، محض لغو اور بے ہودہ حیلہ ہے، اور اس کا خیر القرون میں کچھ اثر نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔“ رشید احمد عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۱۱)۔

بعض فقہاء نے تو اس میں غلطی سے ایسا غلو کیا کہ صاف لکھ دیا کہ:

وان لم يملك شيئاً استقرض وارثه۔ اگر مردہ کسی چیز کا مالک نہ ہو تو اس کا وارث
(جامع الرموز ج ۱ ص ۱۶۱) قرض لے کر فدیہ ادا کرے۔

مولوی محمد صالح صاحب بریلوی لکھتے ہیں کہ ”اگر وصیت کی جائداد کچھ بھی نہ ہو تو وارث پر لازم ہے
کہ قرض لے کر ادا کرے۔“ انتہی بلیقظہ (تحفۃ الاحیاء ص ۸۹)۔

حالاتیکر یہ حضرات فقہاء احناف کے مسلک کے بالکل خلاف ہے۔ چنانچہ امام قاضی خانؒ
تحریر فرماتے ہیں کہ :-

وعليه ان يوصى بالفدية ويعتبر ذلك
من ثلث مال عندنا وان لم يوص
تبرع الورثة عنه جاز ولا يلزمهم
من غير ايصاء عندنا خلاف للشافعي۔
(قاضی خان ج ۱ ص ۹۶)

وصیت پر فدیہ کی وصیت لازم ہے لیکن ہمارے نزدیک
یہ وصیت ثلث مال سے ہی ہوگی۔ اگر وصیت نے وصیت
نہ کی اور وارثوں نے بطور تبرع کے اس کی طرف سے فدیہ ادا
کر دیا تو جائز ہے مگر ہمارے نزدیک بغیر وصیت کے وارثوں
پر یہ لازم نہیں ہے، بخلاف حضرت امام شافعیؒ کے۔

جب وصیت کے اپنے ترکہ میں ثلث مال سے فدیہ بھی بغیر وصیت کے وارثوں پر لازم نہیں ہے تو بصورت
عدم ملک کے وارث کا قرض لے کر فدیہ ادا کرنے کا کیا مطلب ہوگا؟

حقیقت یہ ہے کہ اس غلط جیلہ استقاط کے طریقہ نے بعض علاقوں میں بہت سے لوگوں کو بہت ہی
زیادہ پریشان کر رکھا ہے اور ملامتیں اپنے چند ٹکوں کے لئے طرح طرح کے جیلے اور بہانے اور جھگڑتیں اور
فوائد و منافع تراش تراش کر سادہ لوح مسلمانوں سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب حضرت مولانا گنگوہیؒ کی سابق عبارت پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”مفلس کی قید مولوی رشید احمد صاحب نے اپنے گھر سے لگائی ہے الخ۔“ (جہاد الحق ص ۳)۔

مگر مفتی صاحب خود اپنا لکھا فراموش کر گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ”اب اگر کسی کے ذمہ دس بیس

سال کی نمازیں ہیں تو صدقاً من غلہ خیرات کرنا ہوگا۔ شاید کوئی بڑا دین دار مال دار تو یہ کر سکے مگر غریب سے

ناممکن۔ ان کے لئے یہ طریقہ ہے کہ ولی میت بقدر طاقت گندم الخ (جبار الحق ص ۳۶۵) مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ آپ نے غر بار کی قید اپنے گھر سے کیوں لگائی ہے؟ کیا سچ کہا گیا ہے سے

غیر کی آنکھوں کا تنکا تجھ کو آتا ہے نظر دیکھ اپنی آنکھ کا غافل ذرا شہتیر بھی لطیفہ : مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ وہابی دیوبندی جس طرح کہ زندہ مسلمانوں کے دشمن ہیں، اسی طرح مُردوں کے بھی دشمن ہیں کہ نفع پہنچانے سے لوگوں کو روکتے ہیں، اور مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بلفظ (جبار الحق ص ۳۶۵)۔

مفتی صاحب ذرا اپنے گم بیان میں منہ ڈال کر یہ فرمائیں کہ وہابی دیوبندی تو خیر بقول شما دشمن ہوئے مگر آپ لوگوں نے اپنے پیٹ کو ایسا سر پر اٹھا لیا ہے کہ زندہ مسلمانوں کو بھی خیر خواہ بن کر ٹوٹ کر کھا گئے اور مُردہ مسلمانوں کو بھی خیر سے نہ چھوڑا کبھی تیرا اور ساتواں کی صورت میں اور کبھی گیارہویں اور چالیسویں کی شکل میں اور کبھی عرس میلاد وغیرہ کے رنگ میں جو تک بن کر سادہ مسلمانوں کو چوس لیا ہے، اور نہ تو زندگی میں، اور نہ بعد از زندگی کسی طرح ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بہی خواہ اور خیر خواہ آخر ایسے ہی درکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "بے شک بہت سے مولوی اور پیر لوگوں کے اموال ناجائز طریقہ سے کھاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین سے روکتے ہیں" اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيُصَدِّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الایۃ)۔ وہ سیدھا سادہ خدا تعالیٰ کا دین جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے ذریعہ ہم تک پہنچا تھا۔ اُس پر مفتی صاحب اور ان کی جماعت نے زرا ندوزی کی بدعات کے سینکڑوں غلاف چڑھا دیئے ہیں اور صحیح دین جس کو اس دور میں اصل شکل میں صرف اکابرین علماء دیوبند ہی پیش کرتے ہیں اُس سے مفتی صاحب وغیرہ روکتے ہیں فوا اسفا!

دورانِ قرآن

میت کے لئے ایصالِ ثواب کا مسئلہ اور تادارِ مفلس کے لئے حیلہ اسقاط کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا ازلی کلام اور ظاہری و باطنی، جسمانی اور روحانی بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ قرآنِ کریم، صحیح احادیث اور اجماعِ امت سے ایصالِ ثواب کا طریقہ ثابت ہے لیکن اس کا ثبوت کسی صحیح دلیل سے نہیں ہو سکا کہ جنازہ کے بعد میت پر قرآنِ کریم کو پھیر جائے۔ تمام احادیث کا ذخیرہ چھان لیجئے کہیں آپ کو اس کا نام و نشان تک نہیں مل سکے گا۔ شافعیوں اور مالکیوں و حنبلیوں کی معتبر و مستند کتابوں کی ورق گردانی کر لیجئے، کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہوگا۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف و امام محمد کی کتابیں دیکھ لیجئے، کہیں اس کا بیان نہ ہوگا۔ فقہ حنفی کے معتبر و مستند فتاویٰ متون اور شروح کو ملاحظہ کر لیجئے، کہیں اس کا پتہ نہ پاؤ گے۔ کتب ظاہر الروایہ کا مطالعہ کر لیں، کہیں بعض کی جھلک نظر نہ آئے گی۔ حضرات صحابہ کرام اور ائمہ عظام کی سوانح عمریوں ملاحظہ کیجئے، اس کا وجود کہیں نہیں ملے گا، اور موت کوئی ایسی نادر چیز نہیں جس کا کہیں وقوع نہ ہوا ہو۔ پھر کیا وجہ ہے، کہ حضرات صحابہ کرام سے لے کر آج تک اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ان میں سے کسی نے دورانِ قرآن کا حیلہ تجویز کیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرات فقہاء احناف نے کتب فقہ میں اور حافظ ابن قیم نے اغاثۃ اللہیان ج ۱ ص ۳۸۸ میں اس کی تصریح کی ہے کہ ہر ایسا حیلہ جس کی وجہ سے انسان کسی حرام سے بچ سکے یا بغیر البطل حق غیر کے اور بغیر اذخالی شبہ فی الدین کے کسی حلال چیز کا حصول اس سے ہو سکے، تو وہ درست ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ وہ مقام نہیں جس میں ہمیں اپنی طرف سے قیاس و اجتہاد کر کے از خود حیلے تراش تراش کر ایک نیا دین کھڑا کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہو کیونکہ کفن و دفن کے اور ایصالِ ثواب کے اور میت سے ہمدردی کے تمام پہلو جناب رؤف و رحیم اور رحمۃ اللعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک ایک کر کے ہمیں بتائے اور حضرات صحابہ کرام اور اہل خیر القرون نے اپنے عمل سے وہ ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ اگر ایسے مقام پر انہوں نے کوئی حیلہ نہیں کیا تو یقین جانیئے کہ ہمارے لئے بھی اس کے کرنے کی ہرگز ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ سبت کے ایسے ہی ناجائز حیلوں کے سبب ان پر عذاب نازل کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہودیوں کے ایسے ہی نفسانی حیلوں کے پیش نظر قاتل اللہ الیہود (الحدیث) کے سنگین الفاظ سے ان کے حق میں بددعا فرمائی تھی،

(صحیحین) اور اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تہیتہ) کو آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ :

عن ابی ہریرۃ ^{رضی} ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تکتبوا ما اسرکتب الیہود فتستحلوا محارم اللہ بادی الحیل - وهذا

تم ایسی حرکات کا ارتکاب نہ کرو جیسا کہ یہود نے کیا کہ تم معمولی حیلوں سے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھنے لگو۔

اسناد جید - (تفسیر ابن کثیر ^{۲۵۶} ج ۲ و راجع در منشور ^{۱۳۹} ج ۳)

الغرض صوبہ سرحد اور دیگر مختلف علاقوں میں چند ٹکون کی غرض سے قرآن مجید کو جو پھیرا جاتا ہے، اس کا شریعتِ اسلامیہ میں کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ شریعتِ حقہ اس قلیح ترین حرکت سے سخت بیزار ہے اور تمام حق پرست علماء کا یہ اولین فرض ہے کہ اس رسم بد کو فی الفور ختم کر دیں اور اس مصنوعی اور خود ساختہ طریقہ سے (جس میں لفظ دورانِ قرآن ہی اس کے خود ساختہ ہونے کی واضح دلیل ہے کیونکہ قرآن کریم پھرتا نہیں پھیرا جاتا ہے اور اس کے لئے اگر عرب سے یہ رسم نکلتی تو تدویرِ قرآن کا لفظ استعمال کیا جاتا نہ کہ دورانِ قرآن کا) مسلمانوں کو نجات دلا کر ان کے سامنے وہی اسلام پیش کریں جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ اور ائمہ مجتہدین سے ثابت ہے۔ اور اپنی طرف سے ان بدعات کو پیش کر کے اسلام کا نام دینا دینِ اسلام سے اشد ترین دشمنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین!

تصویر کا دوسرا رخ

نہایت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم مجوزینِ دورانِ قرآن کے دلائل بھی قارئینِ کرام کے سامنے عرض کر دیں اور پھر ان پر سنداً و متنناً، روایتاً و درایتاً کلام کریں۔ مجوزین کا کہنا ہے کہ دورانِ قرآن کا ثبوت خلیفہ راشد حضرت عمر بن الخطابؓ سے ہے۔ چنانچہ امام ابواللیث سمرقندی (المتوفی ۳۸۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

حدثنا العباس بن سفیان عن ابن علیۃ
عن ابن عون عن محمد بن عبد اللہ قال قال
عمرؓ ایھا المؤمنون اجعلوا القرآن وسیلۃً
ہم سے عباس بن سفیان نے بیان کیا اور وہ ابن علیہ سے
اور وہ ابن عون سے اور وہ محمد سے اور وہ حضرت ابن عمرؓ
سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے مومنو!

قرآن کو مردوں کی نجات کا ذریعہ بناؤ۔ پس حلقہ بانہو
 اور کہوئے اللہ اس میت کو اس قرآن کی حرمت سے بخش
 دے اور باری باری ایک دوسرے کے ہاتھوں سے قرآن کو
 لیتے رہو حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری ایام میں حبیبہ
 بنت عبد قلاب کی بیوی کے لئے ایسا ہی حیلہ تجویز کیا گیا تھا
 مالی سے عَمَّائِتَسَاء لُون تک جو قرآن مجید کی جزو تھی،
 اس کے ساتھ حیلہ کیا گیا تھا اور یہ طریقہ عہد عثمانی میں مشہور
 ہو چکا تھا البتہ مروان نے عنادا اس پر اعتراض کیا تھا۔ امام
 سمرقندی فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ ہارون الرشید کی خلافت میں
 رائج ہو چکا تھا کہ انہوں نے حیلہ استقاط میں دوران قرآن
 بھی کیا اور اس پر کسی نے انکار نہیں کیا تو اس کی اصل حضرت
 عمرؓ سے ثابت ہے اگرچہ حدیث کی مشہور کتابوں میں اس کا
 ذکر نہیں ہے۔ لیکن تاریخ کی بعض کتابوں میں قوی سند کے
 ساتھ اس کا ذکر ہے چنانچہ مؤرخ صاحب فتوح نے
 کہا ہے کہ ہم سے ابو عاصم نے بیان کیا۔ وہ ابن جریرؒ سے اور
 وہ ابن شہاب زہریؒ سے اور وہ ابو مسلمؒ سے اور وہ حضرت
 ابو موسیٰؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بیس آدمیوں کے
 حلقہ میں نماز جنازہ کے بعد ایک عورت کے لئے جس کا لقب
 حبیبہ تھا اور ایک انصاری کے لئے جس کا نام ہمیں یاد نہیں
 رہا، قرآن کا دوران کیا تھا اور اس سند سے بھی ثابت ہے
 کہ ہم سے سعد نے بیان کیا وہ ابوبؓ سے اور وہ جمیع سے اور

لنجات الموتی فتحلقوا وقولوا اللهم اغفر لهذا
 الامیة بحرمہ القرآن المجید وتناوبوا بایدیکم
 متناویةً وفعل عمرؓ فی اخر الخلفة مثله فی
 زمانہ لامرأة ملقبہ بحیبہ بنت عبد زوجة
 قلاب (وفی نسخة ملاح) بجزء القرآن من مالی
 الی عَمَّ یَتَسَاء لُون وشاع فعله فی زمان خلافة
 عثمان بانکار مروان بعناد وقال الامام
 السمرقندی ثم اشتهر فی خلافة هارون
 الرشید من غیر انکار نکیر دوران القرآن
 لحیلة الاستقاط فاصله ثابت بن عمرؓ وان
 لم یدکر فی الکتب المشہور من الاحادیث و
 ولكنه مذکور فی الکتب من التوارخ بسند
 قوی كما قال المؤرخ صاحب الفتوح اخبرنا
 ابو عاصم عن ابن جریر عن ابن شہاب
 عن ابی سلمة عن ابی موسی قال فعل عمرؓ
 تعاور جزء القرآن فی حلقة عشرین رجلاً
 بعد صلاة الجنائز لامرأة ملقبہ بحیبہ الخ
 ولرجل من قبيلة انصار ما حفظنا اسمه
 وثبت، بهذا السند ایضاً اخبرنا سعد عن
 ایوب عن جمیع عن عبد الرحمن بن ابی بکر
 انه اوجد دوران القرآن عمرؓ والقرآن

شافع للمؤمنین حیاتیاتاً وبعد ممات انتہی وہ عبدالرحمن بن ابی بکر سے روایت کرتے ہیں کہ دورانِ قرآن کا ایجاد حضرت عمرؓ نے کیا اور قرآن مومنوں کیلئے زندگی میں بھی اور بعد از وفات بھی شفاعت کرنے والا ہے۔

الجواب : فن حدیث کے پیش نظر اس سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔ امام ابواللیث اگرچہ ایک بہت بڑے فقیہ ہیں مگر فنِ روایت اور حدیث میں تو حضرات محدثین کرام کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ لہذا ان کی پیش کردہ روایت اسما الرجال کی کتابوں سے پرکھ کر دیکھیں گے کیونکہ یہی وہ فن ہے جو حدیث کا محافظ ہے۔ پہلی سند ہرگز قابلِ استدلال نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ اسمیں عباس بن سفیان مجہول ہے۔ کتب رجال میں اس کا کہیں نام و نشان نہیں مل سکا۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے ہرگز اس کا مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین مجہول شخصیتوں سے لیتے پھریں۔ وثانیاً امام سمرقندی کی وفات ۳۸۳ھ میں ہوئی ہے (مقدمہ حنفانی ص ۱۲۹) اور ابن علیہ کی وفات ۹۳ھ یا ۹۴ھ کو ہوئی ہے (تہذیب ج ۱ ص ۲۷۹)۔ بڑے تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ امام سمرقندی صرف ایک واسطہ سے ابن علیہ سے یہ روایت کرتے ہیں، ورمیان میں ایک سو نو اسی سال کا طویل زمانہ اس کا تحمل نہیں ہے جیسا کہ فن حدیث اور طبقات روایات کو جاننے والوں پر مخفی نہیں ہے۔

دوسری سند مؤرخ صاحب فتوح کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے۔ اولاً صاحب فتوح محمد بن عمر واقدی قابلِ اعتبار ہی نہیں ہے۔ امام بخاری، ابن المبارک، ابن نمیر اور اسمعیل بن زکریا اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں۔ امام ابن معین اس کو ضعیف اور لیس بشی کہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ وہ کذاب تھا۔ محدث بندار کہتے ہیں کہ میں نے اس سے جھوٹا کوئی اور نہیں دیکھا۔ امام اسحاق بن راہویہ اور ابو حاتم کہتے ہیں کہ وہ جعلی حدیثیں بنایا کرتا تھا۔ امام نسائی فرماتے ہیں کہ جن چار مشہور کذابوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جعلی حدیثیں بنا بنا کر مہتان باندھا ہے ان میں ایک واقدی ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ :

کتب الواقدی کُلُّھا کذب۔

واقدی کی تمام کتابیں خالص جھوٹ ہیں۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۶۲ تا ۳۶۳ مصلحاً وبتقطاً)

وثانیاً اس کی سند میں ابن جریج ہیں۔ جو اگرچہ ثقہ تھے مگر تکمیل خواہش کے لئے حیلہ کے قابل تھے۔ چنانچہ

انہوں نے تو بے عورتوں سے نکاح منع کیا تھا اور اس کو جائز سمجھتے تھے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۵۱) علاوہ ازیں امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ ابن جریج، موضوع جعلی اور من گھڑت روایات بھی نقل کر دیا کرتے تھے اور روایت لینے میں ثقہ اور غیر ثقہ کی کوئی تمیز نہیں کرتے تھے۔ (ایضاً)

وثالثاً یہ روایت ابن جریج کی محمد بن شہاب زہری سے ہے، اور امام ابن معین فرماتے ہیں، کہ زہری جریج فی الزہری لیس لشیء، کہ ابن جریج کی امام زہری سے روایت محض یہی ہے۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ ابن جریج حاطب لیل تھے۔ (تہذیب ج ۶ ص ۱۴۰)۔

وربعاً ابن جریج مشہور مدلس تھے (دیکھئے میزان ج ۲ ص ۱۵۱ و تہذیب ج ۶ ص ۱۴۰) اور امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ ابن جریج قبح التدلیس تھے۔ ان کی تدلیس سے پرہیز کرنا ضروری ہے (تہذیب ج ۶ ص ۱۴۰) اور یہ روایت مدلس ہے۔

یہ ہے امام سمرقندی کی قوی سند۔ اور اسی لئے ہم نے اس پر قدرے تفصیل سے کلام کیا ہے۔ تیسری سند میں ایوب، سعد، جمیع یہ تمام راوی مجہول ہیں۔ یہ کون تھے اور کیسے تھے؟ کچھ معلوم نہیں۔ جو اس کی صحت کا مدعی ہے اس پر ان کی تعین اور توثیق ضروری ہے۔ یہ سب کی سب سندیں نہایت کمزور اور مخدوش ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان پر دین کے کسی مسئلہ کی بنیاد رکھی جائے۔ اور اسی واسطے کتب حدیث میں اس روایت کا کوئی ذکر نہیں ہے اور امام سمرقندی کو بھی صاف نفظوں میں اقرار ہے کہ حدیث کی مشہور (بلکہ غیر مشہور) کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں:

من جاء اليوم بحديث لا يوجد عند الجميع لا يقبل (توجیہ النظر ص ۲۱۹، فتح المغیث ص ۱۱، مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۱)۔
 کہ جس شخص نے آج کوئی حدیث پیش کی جو کہ تمام محدثین کرام کے نزدیک نہ ہو اور جس کو انہوں نے ذکر نہ کیا ہو تو وہ روایت ہرگز قبول نہیں کی جاسکتی۔

قطع نظر سند کے اگر درایت بھی اس پر غور کیا جائے تو اس روایت کا بطلان واضح ہو جاتا ہے، بچند وجوہ:

اول: یہ روایت کسی رافضی کی ایجاد ہے اس لئے کہ یہ حیلہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور زین العابدینؓ کی طرف تو منسوب کیا گیا ہے لیکن حضرت علیؓ کا نام تک نہیں لیا گیا اور مروان کی مخالفت کا خاص طور پر

ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے عناد کے طور پر اس مبارک حیلہ سے انکار کیا تھا۔

دوم : اس جعلی روایت میں یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ وغیرہ کے عہدِ خلافت میں نماز و روزہ وغیرہ کی لوگوں میں یوں بے پروائی ہوتی رہی کہ ان کو ایسے لوگوں کے بخشوانے کیلئے حیلہ دورانِ قرآن تجویز کرنا پڑا۔ اور اس سے سمجھنے والے خود سمجھ سکتے ہیں کہ پھر ان کی خلافت، خلافتِ راشدہ کہلاتے گی یا غیر راشدہ؟

سوم : حیلہ اور قلاب کا کتبِ رجال اور تاریخ میں کہیں ذکر نہیں مل سکا۔ لیکن حیرت ہے کہ ایک انصاریؒ کے لئے بھی یہ حیلہ ہوا۔ کیسے باور کر لیا جائے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابی نے نماز اور روزہ میں کوتاہی کی، اور اس کی تلافی حیلہ دورانِ قرآن سے کی گئی۔ جب کہ حضرات صحابہ کرامؓ مسلم اور کافر کے درمیان فرق ہی نماز پڑھنے نہ پڑھنے کو سمجھتے تھے پھر لہجہ من الانصار کا کیا مقام ہوگا؟ چہارم : حضرت عمرؓ کے آخری ایامِ خلافت میں سرکاری طور پر قرآن کریم کتابی شکل میں یکجا جمع کر دیا گیا تھا، پھر کیا وجہ ہے کہ مہالی سے عَمَّ نَسَاءُ لُون کی بجز تک ہی یہ ہیرا پھیری ہوئی اور سارا قرآن کریم نہ پھرایا گیا؟

پنجم : اگر اس حیلہ کی اصل حضرت عمرؓ سے ہوئی اور عہدِ عثمانیؓ اور رشیدی میں یہ مشہور ہو گیا، تو حضرات محدثین کرام اور فقہاء عظام تک یہ کیوں نہ پہنچا؟ یہ کوئی عجیب شہرت ہے کہ حضرات ائمہ دین کے کان تک اس سے نا آشنا ہوں اور یہ حیلہ مشہور کا مشہور بھی رہے؟

ششم : اوجد دوران القرآن عمرؓ میں لفظ دوران اس کے جعلی ہونے کا قرینہ ہے اور اسی طرح لفظ اوجد بھی کیا یہ کوئی سائنس کی ایجاد تھی کہ اس کے لئے لفظ اوجد بولا گیا اور امر یا حکم عمرؓ وغیرہ کے الفاظ ترک کیے گئے یا یہ کوئی ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم یا سام میزائل کی ایجاد تھی؟ یہ الفاظ اور ترکیب ہی اس واقعہ کے کوہستانی ایجاد ہونے کی واضح دلیل ہے الغرض روایتی اور روایتی قرآن اس روایت کے جعلی اور بے اصل ہونے پر دال ہیں۔ مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں کہ امیر المؤمنین فاروقِ عظیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے سوا اور حضرات روایات بے سربا اس سلسلہ میں مذکور ہیں سب باطل و افتراء ہیں نہ یہ عبارت فتاویٰ سمرقندیہ میں ہے۔ اس پر افتراء ہے اور بے چارہ افتراء کرنے والا

عربی عبارت میں باقاعدہ نہ بنا سکا اپنی ٹوٹی پھوٹی جاہلانہ ترغیبات کو صحیح و امر کی طرف منسوب کیا۔ الخ۔ (السلام النبوی فی الفتاویٰ الامامیہ ص ۴۲)

درۃ البرد میں امام محمدؒ کی کتاب الحیل کے حوالہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ :

قال الامام محمد اسهل طريقته ان يبيع الوارث على الفقير مصحفا صحيحا ابله للقراءة فعين فاحش ثم يهب الفقير له ثم يثم حتى يستتم اهل الله يجعله فديته في مقابلة الصوم والزكوة والمنذورات الخ

حضرت امام محمدؒ نے فرمایا کہ سہل ترین طریقہ یہ ہے کہ میت کا وارث ایک صحیح اور قابل قرأت قرآن کریم کا نسخہ فقیر پر بھاری رقم کے عوض (حیلہ کرتے ہوئے) فروخت کر دے۔ پھر فقیر وارث کو ہبہ کرے پھر وہ فقیر کو دے حتیٰ کہ نماز، زکوٰۃ اور منذورات وغیرہ کا حساب مکمل ہو جائے۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کا فدیہ بنا دے۔

مگر اس عبارت سے بھی مدعی ثابت نہیں ہوگا۔ اولاً اس لئے کہ کتاب الحیل امام محمدؒ کی تالیف ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ملا ابو محمد عبدالقادر القرشی الحنفی (المتوفی ۷۵۰ھ) لکھتے ہیں کہ :

قال ابو سليمان الجرجاني مكذبوا على محمد ليس له كتاب الحيل انما كتاب الحيل للوراق - (جواهر المضيه ج ۲ ص ۲۰۸)

امام ابو سليمان جرجانیؒ کہتے ہیں کہ لوگوں نے امام محمدؒ پر جھوٹ کہا ہے۔ کتاب الحیل ان کی نہیں ہے۔ کتاب الحیل تو وراق کی لکھی ہوئی ہے۔

جب کتاب الحیل ہی امام محمدؒ کی نہیں تو اس حیلہ کی ان کی طرف نسبت کیسے صحیح ہے؟ خصوصاً جبکہ ان کی مشہور کتابیں جو ظاہر الروایۃ کا مدار ہیں اس سے بالکل عاری ہیں۔

وثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ مخلوق تو غنیمت فاحش کو قبول نہ کرے اور جب خدا تعالیٰ سے معاملہ ہو، تو فقیر کو غنیمت فاحش پر قرآن دیا جائے۔ یہ مگر اور خدا کیوں؟

کارہ باخلق آری جملہ راست با خدا تدبیر و حیلہ کے روا است

مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں :

”عرض : استقاط کی حالت میں چند سیر گندم اور قرآن کریم دیا جاتا ہے، اس میں گل کفار ادا ہو جائے گا یا نہیں؟ ارشاد : جتنی قیمت قرآن عظیم کی بازار میں ہے، اتنے کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔“ (الحکام شریعت حصہ سوم ص ۱۲۵)۔

مفتی احمد یار خاں صاحب لکھتے ہیں کہ ”پنجاب میں جو عام طور پر یہ مروج ہے کہ مسجد قرآن پاک

کا ایک نسخہ منگایا، اُس پر ایک روپیہ لکھا اور چند لوگوں نے اُس کو ہاتھ لگایا، پھر مسجد میں واپس کر دیا۔ اس سے نمازوں کا فدیہ ادا نہ ہوگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کی کوئی قیمت ہی نہیں، لہذا جب قرآن شریف کا نسخہ خیرات کر دیا، سب نمازوں کا فدیہ ادا ہو گیا۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ اس میں اعتبار تو قرآن کے کاغذ لکھائی چھپائی کا ہے۔ اگر دو روپیہ کا یہ نسخہ ہے تو دو روپیہ کی خیرات کا ثواب ملے گا۔ ورنہ پھر وہ مال دار جن پر ہزار روپیہ سالانہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ کیوں اتنا خرچ کریں۔ صرف ایک قرآن پاک کا نسخہ خیرات کر دیا کریں۔ غرض کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔“ بلفظہ (جاء الحق ص ۳۶)۔

اور فتاویٰ نور الہدیٰ میں ہے کہ ”مصحفے درست و تمام بیارند کہ در ملک آن استقاط کنندہ باشد باکے بہ بخشد و قبول کند الخ (ص ۱۱۱)۔“

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم استقاط کنندہ کی ملک میں ہو اور جتنی قیمت اس کی بازار میں ہو اتنی ہی قیمت کے عوض میں وہ کسی فقیر کی ملک کر دیا جائے۔ اور یہ جو حیلہ دوران قرآن کے قائل ہیں وہ اس کی قید بھی لگاتے ہیں کہ :

ان دوران القرآن لازم عند الافلاس و دوران قرآن اُس وقت لازم ہے جب کہ کوئی مفلس ہو، عدم قدوة اداء الفدیة۔ (المجموع للقرعات)۔ اور فدیہ کی ادائیگی پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

مگر صوبہ سرحد اور اسی طرح دیگر بعض علاقوں میں یہ رسم اتنی عام ہے کہ امیر و غریب اور شاہ و گدا سب کے لئے دوران قرآن کیا جاتا ہے اور اس حیلہ و حیلہ کو اتنی وسعت دی گئی ہے کہ اصل حقیقت کی جھلک ہی نظر نہیں آتی۔ تمام مسلمانوں کا عموماً اور علماء کرام کا خصوصاً یہ فرض ہے کہ وہ جملہ بدعات سے اور خصوصاً دوران قرآن کی رسم سے خود بھی اجتناب کریں اور اپنے مسلمان بھائیوں کو بھی اس رسم کی قیادت سے روشناس کریں۔ ع بر رسولان بلاغ باشد و بس !

غرضیکہ حیلہ دوران قرآن کا صحیح اور معقول ثبوت نہ تو کسی عقلی دلیل سے ہے اور نہ نقلی سے۔ نہ خیر القرون میں اس کا ثبوت اور رواج تھا اور نہ ذمہ دار حضرات فقہاء کرام اور حضرات محدثین عظام اس سے آگاہ ہیں۔ اور جنہوں نے یہ روایت نقل کی ہے، فن اسما الرجال کے ماتحت ان کی نقل کسی صورت میں معتبر نہیں ہے۔

اس لئے علماء کوشش و کھپلی و اگر وہ ٹکڑی و دیشان و متھا کوٹ و نندھاڑ و الائی و کوہستان و درہ پگڑمنگ
 و سچال اور ریش وغیرہ سے علی الخصوص یہ در و مندانہ اپیل ہے کہ وہ اس رسم بد کو بند کرنے میں پیش قدمی
 کریں۔ ان میں اہل علم اور اہل فہم اور انصاف پسند حضرات کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی
 ہے کہ وہ اس پر پوری توجہ کریں، اور دیگر مختلف علاقوں کے علماء اہل حق سے بھی گزارش ہے، کہ
 وہ بھی اس رسم قبیح سے گریز کریں اور اس کو بند کرنے میں انتہائی کوشش فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق
 دے۔ آمین ثم آمین!

عبدالنبی اور عبدالرسول وغیرہ نام رکھنا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر نام ہے (وہ جس میں لفظ عبد کی
 اللہ کی طرف اضافت ہو مثلاً) عبد اللہ اور عبد الرحمن وغیرہ اور پھر وہ نام جن میں محمد کا نام ہو مثلاً محمد ابراہیم
 اور محمد اسمعیل وغیرہ۔ لفظ عبد ایک مشترک لفظ ہے، عبد کے معنی عابد کے بھی آتے ہیں اور خادم و غلام کے
 معنی بھی آتے ہیں۔ جب اس کی اضافت غیر اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد خادم اور غلام ہوتی ہے
 جیسے صَالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ۔ لیکن نام اور تسمیہ کے موقع اور محل پر عموماً یہ لفظ عبادت کے
 معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور ایسے موقع پر اس کے متبادر معنی یہی ہیں، اسلئے ایسا نام ایہام شرک سے خالی نہیں ہے
 جس سے اترازا کتنا نہایت ضروری ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

وَمِنْهَا أَنَّهُمْ كَانُوا يَسْتَمُونَ لِبَنَاءِ هِمِ عَبْدِ الْعَزْزِيِّ
 وَعَبْدِ شَمْسٍ وَنَحْوِ ذَلِكَ إِلَى أَنْ قَالَ فَهَذِهِ
 شَبَاحٌ وَقَوْلُكَ لِلشَّرِكِ نَهَى الشَّارِعَ عَنْهَا لِكُونِهَا
 وَالْبَالُ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔ (حجۃ اللہ صلا)

اقسام شرک میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنی اولاد کا نام عبد العززی
 اور عبد شمس وغیرہ رکھتے تھے (پھر فرمایا) کہ یہ نام شرک کے
 قالب اور اس کے سانچے ہیں، اس لئے شارع نے ان
 ناموں سے منع کیا ہے۔

فائدہ: نسائی شریف میں اس کی تصریح ہے کہ عَزْزِيَّ ایک عورت (پریمی) تھی جس کی لوگ
 بتش کیا کرتے تھے۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو

حضرت خالد بن الولید نے قتل کیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۵۴)۔

امام ابن حجر مکیؒ لکھتے ہیں کہ:

وَيَحْرَمُ مَلَكَ الْأَمْلَاقِ لِأَنَّ ذَلِكَ لَيْسَ لِغَيْرِ اللَّهِ وَكَذَلِكَ عَبْدُ النَّبِيِّ وَعَبْدُ الْكَعْبَةِ وَالِدَارِ أَوْ عَلِيٍّ أَوْ الْحَسَنِ لَا يَهَامُ الشَّرْكَ -

کسی کا شہنشاہ نام لکھنا حرام ہے کیونکہ یہ نام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور اسی طرح عبد النبی اور عبد الکعبہ اور عبد الدار اور عبد العلیٰ اور عبد الحسن نام بھی صحیح نہیں ہیں۔

(شرح منہاج ج ۱ ص ۱۰۰) کیونکہ ان میں ایہام شرک ہے۔

لفظ علیٰ چونکہ اللہ تعالیٰ کا نام بھی ہے اور قرآن کریم میں الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ وغیرہ آیا ہے تو اگر کسی کی مراد حضرت علیؑ نہ ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہو تو عبد العلی نام بلا کہ اہت ناجائز ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ:

وَأَمَّا مَا اشْتَهَرَ مِنَ التَّسْمِيَةِ بِعَبْدِ النَّبِيِّ فَظَاهِرٌ لَكُفْرٍ إِلَّا أَنْ ارَادَ بِالْعَبْدِ الْمَمْلُوكِ (شرح فقہ اکبر ص ۲۳۸ طبع کانپور) عبد النبی نام جو مشہور ہے بظاہر یہ کفر ہے مگر یہ کہ عبد سے مملوک مراد ہو تو پھر کفر نہ ہوگا۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کفر نہیں تو جائز ہو گیا بلکہ یہ بہر حال ناجائز ہوگا۔ چنانچہ خود ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ:

وَلَا يَجُوزُ نَحْوُ عَبْدِ الْحَارِثِ وَلَا عَبْدِ النَّبِيِّ وَلَا عَبْرَةٌ بِمَا شَاعَ فِيهَا بَيْنَ النَّاسِ - (مرقات ج ۹ ص ۱۰۱)

کہ عبد الحارث، اور عبد النبی نام لکھنا جائز نہیں ہے اور لوگوں میں جو یہ نام رائج ہیں، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

اور شاہ عبد العزیز صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"شُرْكُ چنانچہ در عبادت و قدرت می شود، ہمیں قسم شرک در سیدیم ہمیشہ و این قسم نام بہادن شرک در سید است ازین ہم احترام لازم است۔" (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۰۱)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ:

"پرستش آنست کہ سجدہ کند یا طواف نماید یا نام اورا بطریق تمسب و روسازد یا ذبح جانور بناام"

او کنہ یا خود را بندہ فلا نے بگوید و ہر کہ از مسلمانان جاہل با اہل قبور ایں چیز بالجمل آرد فی الفور کافر میگردد
 واد مسلمانان سے برآید :- (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۳۱)

نوٹ : جو جانور غیر اللہ کے نامزد کیا گیا ہو جس میں تقرب کی نیت شامل ہو، وہ بہر حال حرام
 ہے گو وقت ذبح اس پر بسم اللہ پڑھی جائے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر عزیزی میں اھلن
 بہ لغیر اللہ کی تفسیر میں اس پر مبسوط بحث کی ہے اور دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا کہ "خواہ وقت ذبح
 نام خدا بگیرد یا نہ"۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۵۱)۔ راقم الحروف نے اس پر الگ کتاب لکھی ہے۔ اگر طبع ہو گئی،
 تو غیر اللہ کے نام پر جانور نامزد کرنے کے جملہ گوشوں پر سیر حاصل بحث اس میں موجود ہے۔ و التوفیق بید
 اللہ تعالیٰ۔ مستقل کتاب تو ابھی تک طبع نہیں ہو سکی البتہ تنقید متین میں اس مسئلہ کی بقدر ضرورت تل بحث اچھی ہے۔
 مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی لکھتے ہیں کہ :

سوال : عبد اللہی یا مانند اں نام نہادوں درست است یا نہ ؟

جواب : اگر اعتقاد ایں معنی است کہ ایں کس عبد اللہی نام دارد و بندہ نبی است عین شرک است
 و اگر عبد معنی غلام مملوک است اں ہم خلاف واقع است و اگر مجازاً عبد معنی مطیع و منقاد گرفتہ شود
 مضائقہ ندارد لیکن خلاف اولیٰ است۔ روی مسلم عن ابی ہریرۃ ^{رض} ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم قال لا یقولن احدکم عبدی ولا امتی ککم عباد اللہ وکل نساءکم اماء اللہ و لکن
 لیقل غلامی و جاریتی و فتائی و فتاتی انتھی بلفظہ (مجموعہ فتاویٰ ج ۳ ص ۹۵)۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

استفتار : کسی کا نام عبد الرسول یا عبد الحسین وغیرہ رکھنا درست ہے یا نہیں؟ بتیوا و توجروا۔
 هو المصوب، ایسا نام جس میں اصناف عبد کی طرف غیر خدا کی ہو، شرعاً درست نہیں ہے اور اگرچہ
 صرف اس قسم کے نام رکھنے سے حکم شرک کا نہ ہو، بسبب احتمال اس کے کہ عبد سے مراد خادم و مطیع ہے مگر بے شرک
 سے ایسا نام رکھنا خالی نہیں ہے۔ قرآن و حدیث اس قسم کے نام رکھنے کی ممانعت پر دال ہیں، اور علماء اہل سنت
 مہرینے بھی جابجا اس کی تصریح کی ہے الخ بلفظہ (مجموعہ فتاویٰ جلد دوم ص ۳۲)۔

مفتی احمد یار صاحب کو بھی اس کا اقرار ہے کہ یہ ممانعت کراہتِ تنزیہی کے طور پر ہے کہ عبدی کہنا بہتر نہیں بلکہ غلامی کہنا اولیٰ ہے (بلفظہ جارا الحق ص ۳۶۳) اور پہلے لکھا ہے کہ جب عبد کو اللہ کی طرف نسبت کیا جاوے گا تو اس کے معنی عابد کے ہوں گے اور جب غیر اللہ کی طرف نسبت ہوگی تو معنی ہوں گے خادم غلام۔ لہذا عبد اللہی کے معنی ہوتے نبی کا غلام۔ (ص ۳۶۲)۔

ان دونوں عبارتوں کو ملا کر نتیجہ یہ نکلا کہ غیر اللہ کی طرف عبدی نسبت کراہتِ تنزیہی سے خالی نہیں ہے، اور یہی کچھ ہم کہتے ہیں کہ ایہا ہم شرک سے خالی نہیں، گو شرک کا فتویٰ نہ لگایا جائے گا بقول مولانا عبدالحی وغیرہ مگر فتویٰ نہ لگانے سے اس کا جواز ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا۔ بہر حال ایسے موہم شرک نام سے پھینا روح اسلام کے عین مطابق ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کا کمال | مفتی صاحب لکھتے ہیں: "عبد اللہی، عبد الرسول، عبد المصطفیٰ، اور عبد العلی وغیرہ نام رکھنا جائز ہے۔ اسی طرح اپنے کو حضور علیہ السلام کا بندہ کہنا جائز ہے۔ فتاویٰ و حدیث و اقوال فقہار سے ثابت ہے۔ (جارا الحق ص ۳۶۱)

ایک طرف تو مفتی صاحب اس قسم کے نام کو مکروہ تنزیہی کی مدین لکھتے ہیں اور دوسری طرف قرآن و حدیث اور اقوال حضرات فقہار سے اس کو ثابت کرتے ہیں۔ جب قرآن و حدیث سے ثابت ہے تو پھر مکروہ تنزیہی کیسا؟ پھر قرآن کریم کی آیت قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا (الایۃ) سے یہ احتمال پیدا کرنا کہ حضور علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ آپ فرما دو، اے میرے بندو۔ یہ سراسر باطل اور قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کسی بشر کو یہ لائق ہی نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نبوت، کتاب اور حکمت دی ہُوَ تَعَالَى يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي (الایۃ) کہ وہ لوگوں سے یہ کہے، کہ تم میرے بندے بن جاؤ (پارہ ۳ - آل عمران رکوع ۸)۔ الغرض یہ معنی کرنا کہ یا عبادی میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لوگوں کو اپنا بندہ فرما رہے ہیں، قرآن کریم کے سراسر خلاف ہے۔ باقی حضرت عمرؓ کا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہ فرمانا کہ کنت عبداً وخادمہ بصورتِ صحت حدیث اس سے خادم اور غلام مراد ہے کیونکہ قد کنت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فکنت عبداً و خادمہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ آپ کی زندگی میں تھا۔ ورنہ معیت اور کنت عبداً کی حاجت ہرگز نہ تھی، یوں فرماتے ہیں اب بھی آپ کا عبد اور بندہ ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی میں چونکہ حضرت عمرؓ نے ہر طرح آپ کی غلامی اور خدمت اختیار کی تھی، اس لئے انہوں نے یہ فرمایا۔ اس سے بندہ کا ترجمہ کرنا باطل ہے۔ رہا مولانا روم وغیرہ کا ارشاد تو وہ خود قابل تاویل ہے اس پر فتویٰ کی بنیاد ہرگز نہیں رکھی جاسکتی۔ گزر چکا ہے کہ مفتی احمد یار خان صاحب بھی ایسے نام کو کراہتِ تنزیہی کی مد میں رکھتے ہیں۔ مفتی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ: "ہاں اگر اس زمانہ میں دیوبندیوں کو باہیوں کو چڑانے کے لئے یہ نام رکھے تو بہت باعثِ ثواب ہے" بلفظہ (جبار الحق ص ۳۶) مفتی صاحب کو عجیب و غریب محکمہ افتاء ہاتھ آیا ہے کہ جو چیز فی نفسہ مکروہ تنزیہی بھی ہو، مگر چونکہ دیوبندیوں، وہابیوں کو چڑانا کارِ ثواب ہے لہذا یہ نام باوجود مکروہ تنزیہی ہونے کے کارِ ثواب ہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ! مفتی صاحب کا اپنا کوئی مذہب نہیں۔ ان کا مذہب تو دیوبندیوں وہابیوں کی مخالفت کرنا ہے، اگرچہ دیوبندی اپنے دعویٰ پر ٹھوس دلائل بھی رکھتے ہوں، اور مفتی صاحب کے پاس بغیر کاغذ کی کشتی کے اور کچھ بھی نہ ہو، مگر مخالفت ضرور کرنی ہے۔

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

اس سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کو خوفِ خدا، فکرِ آخرت اور حق کی تلاش کا سرے سے خیال ہی نہیں، بلکہ صرف دیوبندیوں کی مخالفت سے ثواب کے متلاشی ہیں۔ رشوق سے کیجئے مگر ایک وقت آنے والا ہے جس میں دودھ اور پانی اور کھری اور کھوٹی سب حقیقت بن کر سامنے آجائے گی۔

باش کہ تا طبلِ قیامت زند

اں تو نیک آید و یا این ما

ابھی بہت کچھ بدعات قابلِ تردید باقی ہیں مگر کتاب کی طوالت کے خوف سے سرسری نہیں

پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ایک عاقل اور منصف مزاج کے لئے ان میں کافی عبرت موجود ہے۔ اگر ضرورت

محسوس ہوتی تو ان پر ایک الگ کتاب لکھی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز

ایک حدیث شریف عرض کر کے ہم اس باب کو ختم کرتے ہیں۔

امام عبدالرزاق، مہتمم سے اور وہ زبید سے اور وہ حضرت حسن بن علی سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ:

قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم عمل قليل في سنة خير من عمل كثير في بدعة ومن استن بي فهو متي ومن رغب عن سنتي فليس متي۔ (مصنف عبدالرزاق ج ۱۱ ص ۲۹۱ طبع بیروت)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سنت کے مطابق تھوڑا سا عمل بھی اُس عملِ کثیر سے بہت بہتر ہے جو بدعت کے طور پر کیا جائے۔ اور نیز فرمایا کہ جس نے میری سنت پر عمل کیا وہ میرا ہے اور جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ میرا نہیں ہے۔



خاتمہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت ہی اختصار کے ساتھ اہل بدعت حضرات کے الزامی اعتراضات کے جوابات بھی بدیہ قارئین کرام کو دیتے جائیں تاکہ بحث مکمل ہو جائے، اور مسئلہ زیر نظر کا یہ پہلو بھی نشہ نہ رہے۔

پہلا اعتراض :

قرآن کریم کا کتابی صورت میں جمع کرنا، اس پر اعراب لگانا اور موجودہ ترتیب کے ساتھ اس کو چھاپنا بدعت ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا ثبوت نہیں ہے۔

الجواب :

امام جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ :

قرآن کریم سب کا سب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں لکھا گیا تھا لیکن ایک جگہ میں نہ تھا۔ اور سورتوں میں ترتیب بھی نہ تھی۔

وقد كان القرآن كتب كله في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم لكن غير مجموع في موضع واحد ولا مرتب السور (التقان ج ۱ ص ۵۸)

صحیح روایت یہ ہے کہ سورتوں میں ترتیب تھی جیسا کہ بیان ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

امام حارث محاسبی لکھتے ہیں کہ :

قرآن کریم کی کتابت محدث اور بدعت نہیں ہے اسلئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو لکھنے کا حکم دیا تھا۔

كتابة القرآن ليست بمحدثه فانه صلى الله عليه وسلم كان يامر به بكتابتها (ایضاً ص ۵۸)

حضرت زبیر بن ثابت فرماتے ہیں کہ ہم مختلف رقعات سے قرآن کریم کو آپ کے سامنے جمع کرتے تھے

امام عالم اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

فیه الدلیل الواضح ان القرآن انما جمع فی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (المستدرک ج ۲) اس میں واضح تر دلیل موجود ہے کہ قرآن کریم انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جمع ہو چکا تھا۔

اور حضرت ابن لبید انصاریؓ کی یہ روایت کہ وقد اثبت فی الكتاب (المستدرک ج ۱ ص ۹) قال الحاکم والذہبی صحیح) بھی اس کی بین دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو کتابی صورت میں جمع کرنے پر رضامندی کا اظہار فرمایا ہے۔ اور بخاری وغیرہ کی یہ حدیث تو آخر مشہور ہی ہے کہ حضرت عمرؓ کے مشورہ سے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں قرآن کریم جمع کرایا تھا (دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۹ وغیرہ) اور قرآن کریم کی یہ موجودہ ترتیب حضرت عثمانؓ نے دی ہے اور اسی بنا پر ان کو جامع القرآن کے لقب سے خطاب کیا جاتا ہے (دیکھئے اتقان ج ۱ ص ۱ وغیرہ) مگر یہ یاد رہے کہ یہ ترتیب حضرت عثمانؓ کی خانہ زاد اور ایجاو بندہ نہ تھی بلکہ توقیفی تھی اور اس پر ان کے پاس ثبوت موجود تھا۔ چنانچہ امام ابن الحصار کہتے ہیں کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب اور اسی طرح آیات کی ترتیب وحی کے مطابق قائم کی گئی ہے۔ علامہ کرمانی فرماتے ہیں کہ سورتوں کی یہی ترتیب اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوح محفوظ میں ہے، اور اسی موجودہ ترتیب سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر سال قرآن کریم حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام پر شمس کیا کرتے تھے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں کہ :

کان القرآن علی عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرتباً سوکاً وایاتہ علی هذا الترتیب (اتقان ج ۱) قرآن کریم کی سورتوں اور آیات کی یہی ترتیب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد میں تھی جو آج ہے۔

ورامام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ :

ترتیب الآیات فی سورہا واقع بتوقیفہ صلی اللہ علیہ وسلم وامن غیر سند فی هذا بین المسلمین۔ (تفسیر اتقان ج ۱ ص ۱) آیات کی سورتوں میں جو ترتیب ہے وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے اور آپؐ کی ترقیف یعنی اطلاع دینے سے اس میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

الغرض قرآن کریم کا کتابی شکل میں وجود خود حضرت رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد میں تھا اور

حضرات خلفاء راشدین نے سرکاری طور پر اس کو جمع کر کے رعایا میں اس کی نشر و اشاعت کی تھی اور اسکی جمع و ترتیب پر تمام حضرات صحابہ کرامؓ کا اتفاق تھا۔ چنانچہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ :

فهذا عمل لم ينقل فيه خلاف عن جمع قرآن كما به عمل ايساهے جس میں کسی ایک صحابی کا احد من الصحابة۔ (الاعتصام ج ۲ ص ۲۸۸) اختلاف بھی منقول نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء راشدین اور صحابہ کرامؓ کے عمل کو مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ بدعت کہتے ہیں تو یہ مبارک کام انہیں کو نصیب ہو۔

رہا اعراب کا معاملہ، تو اس میں کافی اختلاف ہے۔ محمد بن اسحاق بن ندیمؒ (المتوفی ۳۸۰ھ) اور قاضی شمس الدین احمد بن خلکانؒ (المتوفی ۶۸۱ھ) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراب حجاج بن یوسف (المتوفی ۹۵ھ) نے لگوائے تھے۔ علامہ ابن خلکانؒ کے بیان میں اس کا بھی اختلاف ہے کہ حجاج بن یوسف کے حکم سے اعراب کس نے لگایا؟ ایک قول یہ ہے کہ نصر بن عامر نے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یحییٰ بن عیمر نے۔ لیکن کتاب الاوائل میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے قرآن کریم کا اعراب ابوالاسود دہلی نے لگایا جو حضرت علیؓ کے شاگردِ رشید تھے (مانخوذ از حاشیہ الفلاح مضمون مولانا شبلیؒ المتوفی ۱۳۳۲ھ ص ۱۹ ذوالفقہ ۱۳۳۵ھ)

اور محدث ابن جوزی کتاب تلیق ص ۱۱ میں اور حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۹ میں اور حافظ ابن حجرؒ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۱ میں لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا اعراب سب سے پہلے یحییٰ بن عیمر (المتوفی ۶۸ھ) نے لگایا تھا۔ بہر کیف حضرات صحابہ کرامؓ کا دور تھا جس میں قرآن کریم پر اعراب لگایا گیا تھا۔ اگر حجاج بن یوسف کے زمانہ میں بھی یہ سلیم کر لیا جائے تو بھی اس کی وفات کے بعد حضرات صحابہ کرامؓ کا دور باقی رہا ہے کیونکہ حضرت محمود بن لبید کی وفات ۹۹ھ میں اور حضرت محمود بن ربیع کی ۹۹ھ میں اور حضرت ابوامامہ سہل بن حنیف کی ۱۰۰ھ اور حضرت ہرماہ بن زیاد باہلیؒ کی ۱۰۰ھ میں اور حضرت ابوالطفیلؒ کی ۱۰۰ھ میں وفات ہوئی ہے (دیکھئے علی الترتیب، تقریب ص ۳۲۸، تہذیب ج ۱ ص ۱۱، البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۹، تہذیب ج ۱ ص ۱۱، تہذیب ج ۵ ص ۸۱)۔ اور پہلے اس کی پوری بحث گزر چکی ہے کہ خیر القرون کا تعامل شرعی حجت ہے۔

لہذا اب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں، نقطے اور اعراب، ہر دو ہمراہ حروف موضوع شدہ انداز پر لکھے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اس کو بدعت کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے اور اس سے سرفرو تجاؤز کرنا درست نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض : جمعہ کے خطبہ سے قبل تقریر کرنا بدعت ہے مگر تم بھی کہتے ہو۔

الجواب : جمعہ کے خطبہ سے پہلے تقریر کا متعدد حضرات صحابہ کرام سے ثبوت ہے چنانچہ حضرت

ابو ہریرہؓ جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے تقریر فرمایا کرتے تھے، اور اس میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتے تھے۔ جب امام خطبہ دینے کے لئے آتا تو حضرت ابو ہریرہؓ اپنی تقریر موقوف کر دیتے تھے۔ (مستدرک

ج ۱ ص ۱۸۰ و ج ۲ ص ۱۵۵ قال الحاکم والذہبی صحیح)۔

ابو الزاہرہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن بسر جمعہ کے دن خطبہ سے قبل وعظ کیا کرتے تھے جب خطیب

خطبہ دینے کے لئے آتا تو وہ وعظ بند کر دیتے تھے (حاکم ج ۱ ص ۲۸۸ و قال صحیح)۔

حضرت تمیم دارمیؓ نے حضرت عمر فاروقؓ سے اجازت طلب کی کہ میں جمعہ کے دن تقریر کیا کروں گا۔

اور اس میں متعدد نصیحت آمیز واقعات بیان کروں گا۔ پہلے حضرت عمرؓ نے انکار فرمایا لیکن حضرت تمیم

دارمیؓ کے اصرار پر انہوں نے اجازت دے دی کہ تم جمعہ کے دن اس سے قبل کہ میں خطبہ کے لئے آؤں،

تقریر کر سکتے ہو۔ (اصابہ فی تذکرۃ الصحابہ ج ۱ ص ۱۸۴)۔

تیسرا اعتراض : آپ کے زمانہ مبارک میں مسجدوں میں روشنی کا انتظام نہ تھا۔ لہذا مسجدوں میں

روشنی کا انتظام کرنا بھی بدعت ہے حالانکہ تمہاری مساجد میں بھی روشنی کا انتظام ہوتا ہے۔

الجواب : امام ابو داؤد نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے، باب السراج فی المساجد۔ اور اس

کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم بیت المقدس

نماز کے لئے نہیں جاسکتے تو :

فابعثوا بزیت یسرج فی قنادیلہ۔ تم زیتون کا تیل بھیج دو تاکہ بیت المقدس کی قندیلوں

(ابو داؤد ج ۱ ص ۱۰۰) میں روشن کیا جاسکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے بیت المقدس میں چراغ جلانے کے لئے تیل بھیجے کا حکم دیا ہے۔ ہاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عاری بودن حرمت از نقطہ انجام باوجود تشایر صدر یکدیگر تا حدیث مصحف بیدست (اکسیر ص ۱۵۰)

البتہ مسجد نبوی وغیرہ میں آپ کے زمانہ مبارک میں روشنی کا انتظام نہ تھا۔ حضرت تمیم دارمی نے سب سے پہلے مسجد میں چراغ جلایا اور روشنی کا انتظام کیا۔ (ابن ماجہ ص ۵۷۰ و تہذیب ج ۱ ص ۵۱۱)۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی اجازت سے حضرت تمیم دارمی نے مسجد میں چراغ جلانے۔

(الفاروق ج ۲ ص ۱۲۲)۔

فتوح البلدان ص ۱۱۰ اور الاحکام السلطانیہ للماوروی ص ۱۵۴ اور مرآة الحرمین ج ۱ ص ۲۳۵ لایبرایم رفت باشائیں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حرم محترم کے گرد دیوار کھنچوائی اور اس سے یہ کام لیا کہ اس پر رات کو چراغ جلانے جاتے تھے۔

فائدہ: مسجد میں جتنی روشنی کی ضرورت ہے اُس سے زیادہ چراغ روشن کرنے حرام ہے چنانچہ

ابو حنیفہ ثانی علامہ ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں کہ:

مسجد میں ضرورت سے زیادہ چراغ جلانے جائز نہیں ہیں کیونکہ یہ اسراف ہے، رمضان میں ہو یا غیر رمضان میں۔ پھر فرمایا کہ قنویہ میں ہے کہ شب برات میں کچول اور بازاروں میں بہت سے چراغ جلانا بدعت ہے اور اسی طرح مسجدوں میں بھی ضرورت سے زیادہ چراغ جلانا بدعت ہے۔

ولا يجوز ان يزداد على سراج المسجد لان ذلك اسراف سواء كان ذلك في رمضان او غيره الى ان قال وفي القنية و اسراج السراج الكثيرة في السكك و الاسواق ليلة البراءة بدعة و كذا في المساجد۔ البحر الرائق ج ۵ ص ۲۱۵۔

حضرات فقہاء احناف کا تو یہ قول ہے۔ مگر چودھویں صدی کے مفتی جو بزعم خود حنفیت کے ٹھیکیدار بنے پھرتے ہیں یہ ارشاد فرماتے ہیں: پنجاب اور یوپی و کاٹھیاوار میں عام رواج ہے کہ رمضان میں ختم قرآن تراویح کی شب میں مساجد میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ بعض دیوبندی اس کو بھی شرک و حرام کہتے ہیں یہ محض اُن کی بے دینی ہے مساجد کی زینت ایمان کی علامت ہے۔ (ملفوظ ج ۱ ص ۲۹۵)۔

مفتی صاحب ہی فرماتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ چراغ جلانے کو دیوبندی ہی منع کرتے ہیں یا علامہ ابن نجیم حنفی وغیرہ بھی ان کے ہم نوا ہیں، اور کیا یہ بے دینی صرف دیوبندیوں کے حصہ میں آئے گی یا علامہ

ابن نجیم وغیرہ احناف کو بھی اس بے دینی سے کوئی حصہ ملے گا؟ یتوا و تو جروا۔ یہ یاد رہے کہ کسی یونہی نے ضرورت سے زائد چراغ جلانے کو شرک تو نہیں کہا البتہ فقہاء کرام کی پیروی میں بدعت ضرور کھتے ہیں۔ اور بدعت کا ارتکاب بھی ممنوع و حرام ہوتا ہے۔

لطیفہ: مفتی احمد یار خان صاحب نے اپنی معتبر و مستند تفسیر روح البیان شریف سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کے مینارہ پر ایسی روشنی کی تھی کہ بارہ میل مرتبہ میں عورتیں اس کی روشنی میں چرخہ کاتی تھیں الخ (بلفظہ جاری الحق ص ۲۹)۔

چوتھا اعتراض:

مسجدوں میں فرش اور چٹائی کا انتظام بھی بدعت ہے کیونکہ آپ کے زمانہ مبارک میں ایسا نہیں ہوا اور تم لوگ بھی اس کا اہتمام کرتے ہو۔

اجواب:

یہ ٹھیک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجدوں میں چٹائی وغیرہ کا انتظام نہ تھا (دیکھئے میزان الاعتدال ج ۲ ص ۷ وغیرہ) لیکن یہ انتظام حضرت عمرؓ کے عہد میں مکمل ہوا ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ:

”فرش کا انتظام بھی اول حضرت عمرؓ ہی نے کیا لیکن یہ کوئی پر تکلف قالین اور شرطی کا فرش نہ تھا بلکہ اسلام رسادگی یہاں بھی قائم تھی یعنی چٹائی کا فرش تھا، جس سے مقصود یہ تھا کہ نمازیوں کے کپڑے گرد و خاک میں آلودہ نہ ہوں۔“ (الفاروق ج ۲ ص ۱۲)

فائدہ: مسجد میں سب سے پہلے خوشبو جلانے کا باقاعدہ انتظام بھی حضرت عمرؓ نے کیا (خلاصۃ الوفا، ص ۱۴)۔ اور مسجد میں سب سے پہلے پرستہ حضرت عثمانؓ نے نصب کئے تھے (مرآة الحرمین ج ۱ ص ۲۳۵)۔

پانچواں اعتراض:

مسجدوں میں محراب بھی بدعت ہے کیونکہ آپ کے پاک زمانہ میں محراب نہ تھی اور تمہاری مسجدوں میں بھی محراب کا وجود ہوتا ہے۔

اجواب :

امام نووی شرح مہذب ج ۳ ص ۲۱ میں اور علامہ سمہودی و فار الوفاق اصلک میں لکھتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وقت میں مسجد میں محراب کا وجود نہ تھا لیکن علامہ بدرالدین عینی الحنفی عمدة القاری ج ۲ ص ۲۹ میں لکھتے ہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اگر کعبہ کی جہت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے محراب بتائی تھی۔ اور علامہ مقریزی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گو محراب کا کچھ نقشہ پہلے تھا مگر محراب مجوف (جوف دارطاق کی شکل میں جیسا کہ آج کل عموماً مسجدوں میں رواج ہے) خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بنوائی تھی۔ یہی علامہ مقریزی لکھتے ہیں کہ :-

مصر اور اسکندریہ کے دیہات میں حضرات صحابہ کرام نے جو محراب بنائے، ان کا رخ اس طرف ہے جہاں سے موسم سرما میں سورج طلوع ہوتا ہے۔

فاما محاریب الصحابة التي بفسطاط مصر والاسكندرية فان سمتها يقابل مشرق الشتاء۔ (مقریزی ج ۲ ص ۲۵)۔

وہ محراب جو حضرات صحابہ کرام اور تابعین نے بنائے ہیں (ان کو اسی حالت میں رہتے دو)۔

اور امام قاضی خان الحنفی لکھتے ہیں کہ :
والسحاريب التي نصبتها الصحابة والتابعون الخ (ج ۱ ص ۳)۔

الحاصل علامہ عینی کی تحقیق کے موافق محرابیں آپ کے عہد مبارک میں موجود تھیں اور دوسرے محققین کی تحقیق کی رُو سے حضرات صحابہ کرام اور تابعین کے پاک ہاتھوں نے محراب بنائے تھے۔

چھٹا اعتراض :

آپ کے زمانہ میں مسجدوں میں مینار نہیں ہوتے تھے، اس لئے یہ بدعت ہیں حالانکہ تمہاری مساجد میں بھی مینار ہوتے ہیں۔

اجواب :

مینار اصل میں اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ ان پر اذان ہو اور ڈور تک لوگ اذان کی آواز سنیں۔

بڑے بڑے شہروں میں ایک سے زیادہ میناروں پر بیک وقت اذانیں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ امام ابو داؤد نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ باب الاذان فوق المنارة (ج ۱ ص ۱۷۰)۔ اور حضرت ابو بردہ سلمیٰ (المتوفی ۶۵ھ) وغیرہ فرماتے ہیں کہ:

من السنة الاذان في المنارة والاقامة
في المسجد۔ (الزیلعی ج ۱ ص ۲۹۳ و مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۲۳) مسجد میں ہو۔

اصول حدیث کا مسئلہ ہے کہ مطلق سنت سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت مراد ہوتی ہے۔ تاریخ اسلام ج ۲ ص ۳۹ میں بحوالہ اصحابہ لکھا ہے کہ مصر کی مسجدوں میں مینار کا رواج نہ تھا حضرت مسلمہ بن مخلد انصاری (المتوفی ۸۵ھ) نے تمام مسجدوں میں مینار بنوائے۔ قاضی شوکانی (المتوفی ۱۲۵۵ھ) فرماتے ہیں کہ مساجد میں مینار قائم کرنے کی اصل غرض تو یہ ہے کہ دور کے آدمی اذان سن سکیں، اور یہ ایک جائز مصلحت ہے الخ۔ (ارشاد السائل الی دلیل المسائل۔ بحوالہ نقطۃ العجلان ملک نواب صدیق حسن خان)۔

ساتواں اعتراض :

تمہارے مدارس میں جمعہ کے دن چھٹی ہوتی ہے، یہ بھی بدعت ہے۔

الجواب :

نماز جمعہ کے لئے خاص اہتمام کرنا قرآن سے ثابت ہے اور پھر جمعہ کے دن نئے یا دھلے ہوئے کپڑے پہننا اور غسل و مسواک کرنا، پھر سب سے پہلے مسجد میں جا کر بیٹھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اس لئے اگر ہالا یتیم الواجب الایہ فہو واجب کے قاعدہ کے تحت جمعہ کی چھٹی کی جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ علاوہ ازیں عقد القرید ج ۱ ص ۴۹ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے فوج کو یہ حکم تھا کہ وہ ہمیشہ جمعہ کے دن مقام کرے اور پورے ایک شب و روز قیام رکھے، تاکہ لوگ دم لیں اور ہتھیاروں اور کپڑوں کو درست کر لیں۔

فائدہ : اسی طرح رمضان المبارک میں مخصوص عبادت دیگر بیشتر مشاغل سے فارغ ہو کر ہی

صحیح طور پر ادا کی جاسکتی ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر اسلامی مدارس میں ماہ رمضان کی تعطیلات ہو جاتی ہیں تاکہ طلباء کرام اپنے گھروں میں جا کر خاطر خواہ آرام کر سکیں اور روزے و تراویح اور اعتکاف وغیرہ کے لئے ان کو فراغت مل سکے۔ برآمدی اس عبادت کو بھی بغیر تعطیل اور مکمل چھٹی کے ادا نہیں کر سکتا۔

کمالاً یخفی۔

آٹھواں اعتراض :

مدارس کا قیام بدعت ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدرسے نہ تھے حالانکہ سب سے زیادہ مدرسے اور طلبہ تمہارے ہی جماعت کے ہوتے ہیں لہذا تم بھی بدعتی ہوئے۔

اجواب :

فریق مخالف کا یہ استدلال بھی نہایت ہی پچر اور کمزور ہے۔ کیونکہ علم دین کی نشر و اشاعت جس طرح بھی ہو سکے اور جیسے بھی اور جہاں بھی ہو، یہ خود شریعت حقہ کا منشا ہے۔ اس کے لئے جو صورت بھی اختیار کی جائے، درست اور صحیح ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اصحابِ صفہ کیلئے (جو دور دراز مقامات سے طلب علم کیلئے حاضر ہوتے تھے) اسی لئے مسجد کے علاوہ اس کے قریب ہی صفہ بنوایا تھا تاکہ طلبہ کے لئے سہولت رہے، اور ان کو کوئی وقت پیش نہ آئے۔ امام ابو اسحاق غرناطی لکھتے ہیں کہ :

بہر حال مدارس تو ان کے ساتھ امر تعبیدی متعلق نہیں ہے۔

تاکہ یہ کہا جائے کہ یہ بدعت ہیں۔ ہاں اگر یہ فرض کر لیا جائے

کہ سنت صرف یہ ہے کہ علم فقط مسجدوں میں پڑھا جائے تو

انگ بات ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ علم تو زمانہ اول میں

بھی ہر جگہ پھیلا یا جاتا تھا۔ مسجد میں بھی اور گھر میں

بھی، سفر میں بھی اور حضر وغیرہ میں بھی حتیٰ کہ بازاروں میں بھی

علم کی اشاعت ہوتی رہی۔ تو اگر کوئی شخص مدرسہ بناوے اور

مقصد یہ ہو کہ طلبہ کو آرام رہنے تو اس نے منزل اور دیوار

واما المدارس فلم يتعلق بها امر تعبیدی

يقال في مثله بدعة الاعلى فرض ان يكون

من السنة ان لا يقرأ العلم الا بالمساجد

وهذا لا يوجد بل العلم كان في الزمان الاول

يبث بكل محكان من مسجد او منزل او سفر

او حضر او غير ذلك حتى في الاسواق فاذا اعد

احد من الناس مدرسة يعني باعدادها الطلبة

فلا يزيد ذلك على اعداد له منزلا من منازل

او حائظا من حوائظہ او غیر ذلک فاین مدخل
 البیدۃ ہا ہنا؟ (الاتصام ج ۱ ص ۲۱۲)

وغیرہ کے علاوہ اور کیا زیادہ کیا ہے؟ تو اس میں بدعت
 کا دخل ہی کیا ہے؟ (محصلاً)

توال اعترض :

مدارس میں دورہ حدیث وغیرہ کا نصاب مقرر کرنا اور امتحان لینا بھی بدعت ہے۔

الجواب :

اہل عرب اور حضرات صحابہ کرام کی مادری زبان ہی عربی تھی۔ وہ صرف و نحو اور دیگر مبادی علوم
 کے حاصل کرنے کے بغیر بھی قرآن کریم اور حدیث شریف کو سمجھ سکتے تھے۔ بخلاف عجمی لوگوں کے کہ ان کے لئے
 قرآن و حدیث وغیرہ تک اُس وقت تک ہرگز رسائی نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ مبادی حاصل نہ کر لیں۔
 اسی ضرورت کے پیش نظر خلیفہ راشد حضرت علیؑ نے ابوالاسود دہلی کو یہ امر ارشاد فرمایا کہ وہ اس طریق
 کا ایک علم ضبط کرے جس سے فہم قرآن میں مدوٹے اور غلطی واقع نہ ہو (دیکھئے متن متین ص ۳۱ و اقتراح
 للسیوطی ص ۸۲ والبدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۱۲ وغیرہ)۔ اس لئے اگر طلبہ کے لئے قرآن و حدیث کے صحیح
 طور پر حاصل کرنے کے لئے کوئی نصاب حضرات سلف صالحین نے تجویز کیا ہے تو صحیح ہے اور مالایتم
 الواجب الایہ فهو واجب کے قاعدہ کے تحت مبادی کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہ امتحان
 کا سوال تو یہ بھی ہرگز بدعت نہیں ہے۔ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۱۱ میں ایک مستقل باب
 یوں قائم کیا ہے :

باب طرح الامام المسئلۃ علی اصحابہ باب امام کا اپنے سنا تھیںوں پر کوئی ایسا سوال وارد
 لیختبر ما عندہم من العلم۔ کہ ناجس سے ان کے علم کا امتحان ہو سکے۔

پھر اس کے نیچے یہ روایت پیش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے حضرات صحابہ کرامؓ
 سے یہ سوال کیا کہ ایسا درخت بتاؤ جس کے پتے نہیں چھڑتے وہ مسلم کی مثال ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ نے
 اپنے اپنے علم کے مطابق جنگل کے درخت گنوا دیئے۔ مگر صحیح جواب سوائے حضرت ابن عمرؓ کے اور کسی
 کو نہ سوجھا۔ لیکن حضرت ابن عمرؓ کی کم سن ہونے کی وجہ سے خاموش رہے۔ پھر آپ نے خود بتایا کہ

وہ کھجور کا درخت ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد نظیریں کتب احادیث میں امتحان کی موجود ہیں۔

سوال اعتراض :

احادیث کو کتابی شکل میں جمع کرنا بدعت ہے۔

الجواب :

خود جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حدیثیں لکھی جاتی تھیں حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں کسی کو معلوم نہیں۔ مگر ہاں عبداللہ بن عمرو کو، کیونکہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا (بخاری ج ۱ ص ۲۲ وغیرہ)۔ حضرت ابو ہریرہ کی کُل احادیث کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوبیس ہے اور تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ صحیفہ ابو ہریرہ کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ طبع ہوا ہے جس کو حضرت ابو ہریرہ نے کتابی شکل میں جمع کیا تھا۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرو کے صحیفہ کا نام صادقہ کتب تاریخ میں آتا ہے۔ الغرض یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حدیثیں نہیں لکھی جاتی تھیں اور کتابی شکل میں جمع نہ ہوتی تھیں، ایک سراسر بہتان ہے۔ اس پر منکرین حدیث کے رو میں ناچیز کی کتاب "شوق حدیث" کا مطالعہ کریں۔ اس کے مطالعہ کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کے اہم گوشے حل ہو جائیں گے اور منکرین حدیث اور ان کے ہم نوا سخیں پا ہو جائیں گے و ذلك بمنه و توفيقه تعالى صدق من قائل واما بئعمته ربيك فحدیث، ورنه من انم که من دانم۔

گیارہواں اعتراض :

تنخواہ لے کر پٹھانا اور ختم بخاری کرنا بدعت ہے۔

الجواب :

پہلے پوری تفصیل درج کی جا چکی ہے کہ اگرچہ بعض حضرات متقدمین کا اس میں کچھ اختلاف تھا۔ مگر متاخرین نے (جن میں صاحب ہایہ ج ۳ ص ۱۵۱ بھی ہیں اور فرماتے ہیں وعلیہ الفتویٰ اور امام

قاضی خان بھی جواز کا فتویٰ نقل کرتے ہیں (ج ۲ ص ۷۹)۔ اور امام سرسختی بھی ہیں اور فرماتے ہیں نفی جواز (بحوالہ البنا ج ۳ ص ۶۵۵) جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اور ذکر الراق وغیرہ کا سوال پھلے گزر چکا ہے اور حضرات خلفاء راشدینؑ خود بھی نماز و خطبہ اور قضا وغیرہ پر بیت المال سے روزینہ لیا کرتے تھے۔ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ وغیرہ نے باقاعدہ سرکاری طور پر ائمہ اور مدرسین اور مؤذنین کیلئے تنخواہیں مقرر کی تھیں۔ تفصیل گزر چکی ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ باقی بیماری اور مصیبت وغیرہ کے وقت قرآن کریم اور بخاری شریف کا پڑھ کر اس پر اجرت لینا بھی جائز ہے۔ حضرت ابوسعید الخدریؓ کی روایت اور حضرات فقہاء کرامؒ کی عبارتیں پہلے عرض کی جا چکی ہیں علامہ بدرالدین عینی حنفیؒ لکھتے ہیں یعنی کہ:

والرقیۃ نوع مداوۃ والمأخوذ علیہا جعل و جھار پھونک علاج کی ایک قسم ہے۔ اُس پر اجرت المداوۃ یباح اخذ الحیو علیہا (البنا ج ۳ ص ۶۵۴) لینا جائز ہے۔

حضرات! فریق مخالف کے اعتراضات اور بھی کافی ہیں۔ مگر ہم نے چند ایک بطورِ نمونہ ازخروار آپ کے سامنے عرض کر دیئے ہیں۔ ایک عقل مند کے لئے ان میں کافی عبرت موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ اس عدد سے اپنی گیارھویں ثابت کرنا شروع کر دیں۔ رَأٰیْتُ اَحَدَ عَشْرٍ کُوْکِبًا۔ یہ اعتراضات جو پیش کئے گئے ہیں محض عوام ہی کے نہیں بلکہ فریق مخالف کے بڑے بڑے محقق یہ اعتراضات اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ "کیونکہ دیوبند کا مدرسہ، وہاں کا نصاب، دورہ حدیث شریف، تنخواہ لے کر مدرسوں کا پڑھانا، امتحان اور تعطیلات کا ہونا، آج قرآن پاک میں اعراب لگانا، قرآن و بخاری چھاپنا، مصیبت کے وقت ختم بخاری کرنا جیسا کہ دیوبند میں پندرہ روپے لے کر کرایا جاتا ہے (یہ مفتی صاحب کا مفتیانہ اجتہاد ہے۔ ورنہ راقم الحروف بکمال اللہ تعالیٰ دیوبند کا خوش چین ہے، وہاں پندرہ روپے کی کوئی تعیین نہیں ہے۔ حسن اتفاق کا معاملہ ہی جدا

ملہ نواب صاحب لکھتے ہیں کہ "ختم اس کتاب مبارک برائے شفائی بیمار و صون از نوازل و حوادث زمان مبارک ست زیرا کہ در حکم رقیہ است و جواز رقیہ با حدیث ثابت بشرطیکہ در ان چیزے از شرک نباشد و در صحیح بخاری شرک کی از اثر ان نیست (ہدایۃ السائل ص ۳۷۴)

ہے اور بغیر اجرت لئے ہی ہم نے بار بار وہاں ختم کیا ہے۔ بلکہ سارا فنِ حدیث بلکہ خود احادیث کو کتابی شکل میں جمع کرنا بلکہ خود قرآن کا کاغذ پر لکھ کرنا، اس میں رکوع بنانا، اس کے تیس سیپارے کرنا وغیرہ وغیرہ سب ہی دینی کام ہیں اور بدعت ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ان میں سے کوئی کام نہ ہوا۔ بولویہ حرام ہیں یا حلال؟ (بلفظہ جاری الحق ص ۱۱۲)۔ ان اعتراضات کے جوابات عرض کر دیئے گئے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت امام الانبیاء سید المرسل خاتم النبیین محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق، مرحمت فرمائے۔ یہی پہلو ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے اور معصیت کے راستہ سے ہرگز اس کو راضی نہیں کیا جاسکتا۔

(لما جاء فی الحدیث ان اللہ لا ینال فضلہ بمعصیۃ۔ مستدرک ج ۲ ص ۱۰۱)۔ اور جس پہلو کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ترک کر کے امت کو بتایا ہے، ہمارے لئے بھی اس کا ترک کرنا ہی سنت ہوگا اور صرف اسی پہلو کو لینا اللہ تعالیٰ کی محبت کی دلیل ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے :

ان اللہ یحب ان یؤخذ برخصتہ کما یکرہ ان یتقوا سے اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے کہ اسکی رخصتوں پر عمل کیا جائے جیسا کہ وہ اس کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱ ص ۱۵)

یہ روایت مسند احمد ص ۱۰۸ اور واردا لظمان ص ۲۲۸ اور سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۱۹۳ میں حضرت ابن عمرؓ سے اور ص ۲۲۸ میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ ہمیں حضرات صحابہ کرامؓ کی بے تکلف زندگی کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے حضرت ملا علی قاریؒ نے حدیث اقلہا تکلفا کی شرح میں ان کی سادہ زندگی کا نقشہ کھینچ کر بتایا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ ذکر اور درود شریف مسجدوں یا گھروں میں حلقہ بنا کر بلند آواز سے نہ پڑھتے تھے۔ وہ اپنے اجسام کے لحاظ سے فرشی تھے لیکن اپنے ارواح کے اعتبار سے عرش تھے۔ ظاہری طور پر تو وہ مخلوق کے ساتھ تھے مگر باطن کے رُوسے مخلوق سے جدا ہو کر حق تعالیٰ کے ساتھ تھے (مفتاح ص ۱۱۲)

اور شاطبی کہتے ہیں :

واما ارتفاع الاصوات في المساجد فناشي عن
بدعة الجدل في الدين (الاعتصام ج ۲ ص ۲۵۶)۔
یعنی مسجدوں میں آواز بلند کرنا، تو یہ دین کے اندر جھگڑا
کرنے کے لئے بدعت گھڑی گئی ہے۔

اے مالک! تُو بے نیاز ہے۔ تُو اس حقیر کی ظاہری اور باطنی لغزشوں کو معاف کر دے۔ تیرے بغیر
کون معاف کر سکتا ہے؟ اے خالق! تُو جسمانی اور روحانی بیماری سے نجات دے، تیرے بغیر کون ہے،
جس کے آگے ہم ہاتھ پھیلائیں؟ تیرے دروازہ کو چھوڑ کر اور کہاں جائیں تُو ہی کار سازی فرما! اے

دینا ہے اپنے ہاتھ سے اے بے نیاز دے

کیوں مانگتا پھرے ترا سائل جگہ جگہ

وَضَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيَّ سَيِّدَنَا صَاحِبَ لُؤَاءِ الْفَخْرِ مُحَمَّدًا وَعَلَى آلِهِ وَ

أَصْحَابِهِ وَأَزْوَاجِهِ وَجَمِيعٍ مَن تَبِعَهُ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ، أَمِينَ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ!

احقر العباد

ابوالنزاہد محمد سرفراز خان صدر خطیب جامع گلگٹ

و مدرس مدرسہ نضرۃ العلوم جامع مسجد نور۔ متصل گنٹہ گھر، گوجرانوالہ

(الحنفی مذہباً والحسینی مشرباً)

۲۶ ذوالحجہ ۱۳۷۶ھ، ۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء

یوم النخیس بوقت عصر۔ گلگٹ۔